WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
حکایت
لاہور
جون 2015ء
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا رَجَبَ وَشَعْبَانَ
وَبَلِّغْنَا اِلٰى شَهْرِ رَمَضَانَ
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

نورِ مبین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نا معقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم یاد رکھو (۹۰) اور جب خدا سے عہد (واثق) کر و تو اُس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو اُن کو مت توڑو کہ تم خدا کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو جانتا ہے (۹۱) اور اُس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے تو سُوت کا تا پھر اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنانے لگو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے بات یہ ہے کہ خدا تمہیں اس سے آزماتا ہے اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اُس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا (۹۲)

(سورہ نحل)

ماہنامہ
حکایت
لاہور

جلد: 44 | جون 2015ء | شمارہ: 10

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

قیمت -/90 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنگ میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

خصوصی فیچر

کیوں ہاتھ کانپتا ہے......		افضال مظہر انجم	11

طنز و مزاح

جراسک پارک		ابتدال بیلا	21
جہاز		خادم حسین مجاہد	27
فوجی زندگی اور حسِ مزاح		سکندر خان بلوچ	200

تاریخی ناول

مغلانی بیگم	قسط 10	محمد رفیق ڈوگر	33

جگ بیتی

ٹاٹ کا پیوند	آخری قسط	محمد افضل رحمانی	65

آپ بیتی

رنگے ہاتھ		عبدالحفیظ بشر	89

ناقابل فراموش

اتنی سی بات		محمد نذیر ملک	99

دست شفاء

مرگی کا کامیاب علاج		ڈاکٹر رانا محمد اقبال	104

لمحۂ فکریہ

یہ محبت کی شادیاں		عبدالوارث ساجد	107

سلسلہ وار ناول

درِ زنداں	قسط 11	رزاق شاہد کوہلر	113
آکاس بیل	قسط 8	محمد رضوان قیوم	129

مکافات عمل

مایا جال — ڈاکٹر مبشر حسن ملک — 145

خدا کا کوڑا — ڈاکٹر عبدالغنی فاروق — 209

اندھیرے سے اُجالے تک

کشکول — رمیز احمد — 152

عمر رفتہ

جرم چھپتا نہیں — حبیب اشرف صبوحی — 154

ہندی کہانی

یگانہ بیگانہ — رسیک مہتا — 161

خاکہ

ہمارا مجاہد — یارِ غار کے قلم سے — 173

جرم و سزا

خمیازہ — ایس ایم صفی — 177

عشق نامراد — دستگیر شہزاد — 195

مسئلہ کشمیر

مقبوضہ کشمیر میں آزادی ...... — گلزار اختر کاشمیری — 215

تلخیص

اسماعیل سوان اپنے جال میں قسط 15 — میاں محمد ابراہیم طاہر — 225

متفرق

غزل — پریا تابیتا — 176

تبصرے — صلاح الدین چغتائی — 30

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

''ہمیں قائداعظمؒ کا پاکستان چاہئے'' کے زیرِ عنوان ''کہنے کی بات'' کو ہمارے معزز و محترم قارئین نے اس قدر پسند کیا کہ ہمارے پاس ٹیلیفون کالوں، خطوط اور ای میلز کا تانتا بندھ گیا۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے آئندہ حالات حاضرہ اور سیاسی تجزیوں پر مغز ماری کرنے کی بجائے اپنے قومی رہنماؤں کی زندگیوں کے ایسے واقعات کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں جو نہ صرف مستند ہوں بلکہ ہماری نئی نسل کے لئے مشعلِ راہ بھی ہوں۔ لہٰذا اس نشست میں ہم مفکر پاکستان شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی کے چند واقعات، ان کی اپنی زبان فیض رساں سے پیش کر رہے ہیں جو ہمارے لئے غور و فکر کا کافی سامان مہیا کر رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے ''بال جبریل'' میں کئی مقامات پر جہاں اہلِ مغرب کی قمار بازی اور زر پرستی کا تذکرہ کیا ہے وہاں ملا اور پیر کے خلاف بھی جائز درشتی سے کام لیا ہے۔ اکثر احباب کو شک تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا غیظ کسی اصلیت پر مبنی نہیں۔ وہ محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اس طبقہ کو کوسنا شروع کر دیتے۔ یہ شکوک جب ان پر آشکار کئے گئے تو انہوں نے موجودہ زمانے کے پیروں کی دُوں ہمتی، فرومائیگی اور کم سوادی کے ذیل کے دو واقعات سنائے۔ کہنے لگے۔

جن دنوں میری رہائش انارکلی میں تھی تو ایک سرحدی پیر چند مریدوں کی معیت میں آئے اور کہا کہ وہاں سرحد میں ہمارے مریدوں کا سال کے سال اجتماع ہوا کرتا ہے۔ ایک تو جگہ تنگ ہے اور دوسرے اشیائے خوردنی کم ملتی ہیں۔ آپ گورنر بہادر کی طرف ایک درخواست لکھ دیں کہ ہمیں اس مقام پر چند مربع اراضی مرحمت فرمائیں کہ کاشت سے آمدنی کی صورت بھی بن جائے۔ پیر صاحب پرانے دوست تھے، مجھے یہ سن کر صدمہ ہوا، کہا۔ ''پیر صاحب! آپ سیّد ہیں، سیّدِ کونین کی اولاد سے ہیں جس نے غیر کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہ کیا۔ آپ زمین انگریز سے مانگتے ہیں جس کا اس پہ کوئی حق نہیں۔ آپ اس سے کیوں نہیں مانگتے جو ارض و سما کا مالک ہے''۔

اس وقت تو پیر صاحب برہم ہو کر چل دیئے لیکن یہ الفاظ میری زبان سے کچھ ایسے درد سے نکلے تھے کہ بغیر اثر کئے نہ رہے۔ دوسرے روز پیر صاحب اکیلے آئے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگے۔ کل مریدوں کی موجودگی میں مجھے آپ کے الفاظ گراں گزرے لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے سچ فرمایا تھا۔ میں اب ایسی دَریُوزہ گری نہ کروں گا۔ ان کے چلے جانے کے کوئی ہفتہ عشرہ بعد مجھے ان کا تار وصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ زمین مل گئی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہوئی کہ پیر صاحب جب دہلی گئے تو ان کے بے شمار فوجی مریدوں نے ان کا تعارف کمانڈر انچیف سے کرایا۔ سپاہیوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پیر صاحب کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہو۔ مریدوں نے زمین کی احتیاج ظاہر کی تو کمانڈر انچیف نے اسی وقت سر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب کو خط لکھا اور زمین دلوادی۔

دوسرا واقعہ: جب میں یہاں جاوید منزل میں آ گیا تو ایک روز ایک پیر صاحب مجھے ملنے آئے۔ دوپہر کا وقت تھا، گرمی پورے زوروں پہ تھی۔ دھوپ پر نظر نہ جمتی تھی کہ ایک شخص پسینے میں شرابور، ہانپتا ہوا آیا اور پیر صاحب کے قدموں گرا۔ یہ ان کا مرید تھا۔ کہنے لگا۔ حضور کی آمد کی اطلاع ملی تھی، صبح صبح ہی مغلپورہ سے چل پڑا۔ کئی مقامات پہ گیا لیکن آپ وہاں سے تشریف لے گئے تھے۔ آخر معلوم ہوا کہ آپ یہاں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے۔ حضور میری حالت بڑی خراب ہے۔ فاقہ مست ہو گیا ہوں۔ دو سو روپیہ کا قرضدار ہو چکا ہوں۔ ملازمت ملتی نہیں۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میری مشکلات کا خاتمہ ہو۔ یہ کہا اور جیب سے دو روپے نکال کر پیر صاحب کی نذر گزاری۔ پیر صاحب نے روپے جیب میں ڈالے اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آیئے دعا کیجئے"۔

میں نے کہا۔ "آپ دعا پہلے مانگ لیجئے میں بعد میں مانگوں گا"۔ پیر صاحب نے آنکھیں میچ لیں اور زیر لب کچھ کہنے لگے۔ دعا ختم کی۔ ہاتھ منہ اور داڑھی پر پھیرے۔ مرید پر پھونک ماری۔ وہ پھولا نہ سمایا۔ خوش تھا کہ اب میری تنگدستی اور زبوں کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ میں نے کہا۔ پیر صاحب! اب میری باری ہے۔ چنانچہ میں نے ہاتھ اٹھا کر باواز بلند کہنا شروع کیا۔ اے خدا آج کل کے پیر و مرشد بھٹک گئے ہیں انہیں راہ ہدایت دے۔ پیر صاحب نے صدائے احتجاج بلند کی کہ ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہوش کی دوا کیجئے۔ میں نے کہا۔ دیکھئے پیر صاحب میں آپ کی دعا میں بالکل مخل نہ ہوا مجھے بھی اطمینان سے دعا مانگ لینے دیجئے۔ وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔ اے خدا آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ وہ اپنے پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ پیر صاحب نے پھر ٹوکا لیکن میں نہ رکا۔ یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا قرض دار ہو گیا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ اب دو سو دو روپے کا قرضدار ہو گیا ہے۔ پیر صاحب اب زیادہ برہم ہو

گئے۔ کہنے لگے۔ دیکھئے یہ نامناسب ہے، آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ اچھا میں دعا ختم کر دیتا ہوں لیکن ایک شرط پر، آپ یہ دو روپے مرید کو واپس کیجئے۔ اُسے قرضہ سے سبکدوش کرنے کا بندوبست کیجئے اور اسے نوکری دلا دیجئے۔ پیر صاحب ناراض تو بے حد ہوئے لیکن وہ روپے اسی وقت واپس کر دیئے اور باقی شرائط پورا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ تو پیروں کی کیفیت ہے۔

''جی ہاں''۔ ہم میں سے کسی نے کہا۔ ''زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن''۔

اگر ڈاکٹر صاحب نے ''بال جبریل'' میں یہ شعر کہا

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تو اس میں کوئی تعجب نہیں، وہ نماز کو صحیح معنوں میں مومن کی معراج سمجھتے تھے۔ اس چیز کا وہ اکثر خود مشاہدہ کر چکے تھے۔ ایک روز نماز کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا: بعض مقامات ایسے ہیں جہاں خدا کے آگے سر بہ سجود ہونے میں اک کیف اور سرور حاصل ہوتا ہے لیکن بعض مقامات میں اس کا الٹ۔ میں صبح کی نماز حتی الامکان قضا نہیں ہونے دیتا اور مجھے اس کی ادائیگی میں خاص لطف اور سکون میسر ہوتا ہے لیکن پچھلے دنوں جب افغانستان گیا تو وہاں جب نماز فجر ادا کی تو مجھے قطعاً سرور حاصل نہ ہوا اور اک خلا سا محسوس کیا۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ جب اپنے محترم رفیق سید سلیمان ندوی سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی انہی احساسات کی تائید کی اور کہا کہ نماز میں باوجود کامل خضوع کے پہلا سا سرور نہیں ملا۔

علم و حکمت کے یہ موتی اب ہمیں کہاں سے ملیں گے!

میاں محمد ابراہیم طاہر

کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا!

''بھٹو نے قوم کا ڈسپلن ختم کیا۔ نواز شریف نے بچے بچے کو کرپٹ بنا کے رکھ دیا''۔ یہ 20 سال پہلے کا کہا گیا فقرہ یا تجزیہ ہے۔ اب ملک، معاشرہ، ادارے، محکمے سبھی جس حال سے دوچار ہیں ان کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔

☆ افضال مظہر انجم
afzalmazhar@gmail.com

ملک کو بنے 69 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جو ملکوں کو انتہائی بلندی پر لے کر چلا جاتا ہے۔ قومیں اس دوران زراعت اور صنعت میں ترقی کے علاوہ بنیادی ضروریات تعلیم، علاج معالجہ، کچن کے مسائل، رسل و رسائل حل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ اگر صرف ہم سے ایک سال بعد آزاد ہونے والے چین کی مثال ہی لی جائے تو وہ ترقی اور خوش حالی کے سارے ٹارگٹس حاصل کرنے کے بعد پوری دنیا کو

للکارنے کی پوزیشن میں بھی آ چکا ہے۔

کوریا جس نے 60ء کی دہائی میں پاکستان کے پانچ سالہ منصوبوں کی تفصیلات حاصل کر کے انہی پر عمل کر کے اپنے ملک کو معاشی طاقت بنا دیا۔ انہوں نے پاکستان کے مایہ ناز ماہر معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق کی خدمات حاصل کر کے اپنے ملک کی معیشت کو درست سمت کی طرف استوار کر کے ہی یہ ٹارگٹ حاصل کر لئے۔

ہماری معیشت چالیس سال سال پہلے جہاں کھڑی تھی اس مقام سے ایسی اتری ایسی اتری کہ ہم مسلسل آج تک اس کی بحالی دوسرے لفظوں میں صحت یابی کے لئے دوسرے ممالک سے قرضوں کا کشکول پھیلائے پھر رہے ہیں۔ انہی صفحات پر بارہا اسی قسم کی روداد لکھنے کا مطلب یہ تھا کہ اب بھی وقت ہے سنبھلا جا سکے لیکن معیشت کی بدحالی، اداروں کی تباہی، عوام کی بربادی پر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ بغداد میں لوگ چوکوں میں بیٹھ کر مناظرے کیا کرتے تھے اور عمل س کوسوں دور تھے، اس وقت ہلاکو خان قہر خداوندی بن کر ٹوٹا اور اس نے بغداد کو تہس نہس کر دیا۔

غور سے دیکھیں تو پاکستان میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ منظر بالکل وہی ہے۔ ہر چینل پر ایک اینکر اور چند شخصیات بحث مباحثے میں معروف عورتوں کی طرح لڑتے نظر آتے ہیں اور ملک پر نازل ہونے والے عذاب سے نظریں چرا رہے ہیں۔ ملک کی تباہی اور قوم کی بربادی کی داستان کے لئے تو ہزاروں صفحات کم ہیں۔

ماضی پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے موجودہ دور اسی دور کا تسلسل ہے جو 70-1969ء سے جنرل ایوب خان کی حکومت کے خاتمہ اور ون یونٹ کے خاتمہ سے شروع ہوتا ہے اسی 45 سالہ دور میں ملک میں کرپشن، لوٹ مار، اقربا پروری، ناجائز اثاثے بنانے، رشوت خوری، ناجائز کاروبار منشیات فروشی، سمگلنگ، اخلاقی جرائم کی رفتار اتنی بڑھی کہ آج ہماری رگوں میں یہ سب برائیاں خون کے ساتھ گردش کر رہی ہیں۔ ہر کوئی دوسرے پر الزام دیتا ہے لیکن ملک کو اس حالت پر پہنچانے میں قوم کو اس حال میں مبتلا کرنے میں ہر طاقتور اور بااثر مافیا برابر کا مجرم ہے۔ سیاسی لیڈر، مذہبی لیڈر، فوجی ڈکٹیٹر، جج حضرات، سول بیوروکریسی، تاجر، صنعت کار، سردار، جاگیردار سب اپنے فرائض سے غافل رہ کر جھولیاں بھرنے میں مصروف رہے۔

ملک میں عام شہریوں کے قتل عام کا گزشتہ 30-25 سال سے یہ حال رہا ہے کہ چند نوعمر نوجوان آتے ہیں اور معصوم بچوں، خواتین، بوڑھوں تک کو بھون کر رکھ دیتے ہیں۔ کراچی شہر کے بچے بچے کو ٹارگٹ کلر اور بھتہ خور بنا دیا گیا ہے۔ جب فوج جیسے ادارے بھی اس سے محفوظ نہ رہے تو آرمی پبلک سکول میں معصوم بچوں کی شہادت کے بعد موجودہ فوجی قیادت نے ہر قسم کی دہشت گردی ختم کرنے کا تہیہ کیا۔ جب دہشت گردوں پر ہاتھ ڈالنے کے لئے فیصلہ کن آپریشن شروع کیا گیا تو نئے نئے انکشافات سامنے آتے چلے گئے۔ کراچی سے لے کر پشاور اور قبائلی علاقے اور بلوچستان تک ان دہشت گردوں کے خوفناک نیٹ ورک کا سلسلہ سامنے آیا۔ سیاسی جماعتوں، مذہبی جماعتوں اور قوم پرست جماعتوں کے دہشت گردوں کی کارروائیوں کا سلسلہ عوام کے سامنے جوں جوں بے نقاب ہو رہا ہے توں توں عوام کا ان لوگوں کے خلاف آپریشن کا سلسلہ لمبا کرنے کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ گویا جس 18 کروڑ عوام کے تحفظ کی خاطر یہ آپریشن کیا جا رہا ہے اسے عوام کی مکمل تائید و حمایت حاصل ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام سیاسی، مذہبی اور قوم پرست جماعتوں کے دہشت گردوں کے

آپس میں رابطے ہیں گویا عوام کو نقصان پہنچانے میں سارے مجرم ایک ہیں۔

کراچی میں رینجرز کے کمانڈر کی ایک بریفنگ کے مطابق 72 فیصد ٹارگٹ کلنگ میں لسانی گروہ ملوث ہیں۔ 15 فیصد فرقہ وارانہ بنیادوں پر جبکہ سٹریٹ کرائم میں صرف 13 فیصد قتل ہوئے۔

صوبائی حکومتوں، پولیس، ایف آئی اے، اینٹی کرپشن سمیت تمام اداروں کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے۔ یہ بیڑہ غرق دنوں یا سالوں میں نہیں ہوا۔ 1969ء میں جنرل یحییٰ خان کے چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر بننے کے بعد شراب و کباب کی محفلیں سجانے کی وجہ سے ملک کا کروڑوں کی آبادی والا بڑا حصہ ہی ہم سے علیحدہ ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد آنے والے جمہوری چیمپئن ذوالفقار علی بھٹو نے شراب و کباب کی محافل بھی جاری رکھیں۔ نااہلوں، نالائقوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرنا شروع کیا۔ میرٹ کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ اس وقت تک ملک میں ون یونٹ توڑ کر صوبے قائم کر دیئے گئے تھے اور ایک دوسرے کے صوبے کے عوام کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے کی ابتدا کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد عرصہ گیارہ سال تک رہنے والے فوجی ڈکٹیٹر نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہر غلط شخص اور کرپٹ جرنیل کا سہارا لیا۔ اس دور میں ”روس“ کے مقابلہ میں لڑنے والے مذہبی عناصر کو کلاشنکوف دے کر اپنے ملک میں گھسیڑ دیا گیا جن کی کرنی ہم آج تک بم دھماکوں کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق رخصت ہوا تو جمہوریت کے نام پر دو نئے چیمپئن نواز شریف اور بے نظیر بھٹو اپنی اپنی باریاں لگانے میدان میں آ گئے۔ فوجی ڈکٹیٹر کے دور کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ یہ سیاسی لوگ ملک میں میرٹ کو فروغ دیتے، قوم کا قبلہ درست کرتے اور غیر ملکی شکنجے میں جکڑی معیشت کو اس شکنجے سے نکالتے لیکن افسوس کہ گیارہ سال کے اس طویل جمہوری دور میں ان دونوں لیڈروں نے کرپشن اور لوٹ مار کے وہ ریکارڈ قائم کئے کہ ان کے سیاہ کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھی سیاہ ہو گئے۔

جنرل پرویز مشرف چوتھے فوجی ڈکٹیٹر کی حیثیت سے قوم کا قبلہ درست کرنے اور ملک کو لٹیروں سے نجات دلانے کا نعرہ لگا کر اقتدار پر قبضہ کر چکے تھے جنہوں نے تھوڑا بہت احتساب کا عمل ضرور کیا لیکن اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لئے وہ بھی لٹیروں، کرپٹوں اور بااثروں کے خاتمہ کے لئے کچھ کرنے کی بجائے انہیں مضبوط کرنے کا باعث بنتے رہے۔ رہی سہی کسر آصف زرداری کی پانچ سالہ حکومت نے نکال دی جس میں خود بھی کرپشن اور لوٹ مار میں پورا حصہ لیا گیا اور کرپشن کرنے والوں کو بھی نہ روکا گیا۔ پولیس سمیت ہر محکمہ اور ادارے کو اپنے مذموم مقاصد پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے ساتھ عوام کا بھی بیڑہ غرق ہوتا چلا گیا۔ معیشت بھی تباہ ہو کر رہ گئی اور دہشت گردوں کے خلاف مؤثر اقدامات نہ کرنے سے ان کو مزید مضبوط ہونے کے مواقع مہیا کئے گئے۔ دشمن سیاسی، مذہبی اور قوم پرست تنظیموں میں گھس کر دار کرتا رہا لیکن کسی کو گھر کے اندر چھپے دشمنوں پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ نواز شریف بھی حکومت سنبھالنے سے آرمی کے آپریشن شروع کرنے تک دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے کسی قسم کے ٹھوس اقدامات کرنے میں ناکام رہے تبھی ملک انتہائی خوفناک دہشت گردی سے دوچار رہا۔

صوبائی حکومتیں مافیا میں تبدیل ہو گئیں

کراچی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل نوید مختار نے جن خرابیوں، کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے یہ کوئی نئی بات

نہیں بلکہ صورت حال اس سے بھی کہیں آگے جا چکی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فوج نے ہی بالآخر آپریشن شروع کیا ہے اور اس میں حائل رکاوٹوں کی وجہ سے کور کمانڈر کو یہ بیان دینا پڑا ہے ورنہ اس بگاڑ میں نواز شریف، بے نظیر، آصف زرداری، گیلانی حکومتوں کے علاوہ جنرل ضیاء اور جنرل پرویز مشرف کی حکومتیں سبھی برابر کی شریک ہیں۔ ملک کی ایجنسیاں بھی حاکم وقت کی حکومت قائم رکھنے کے لئے کرپشن اور دہشت گردی میں ملوث سیاسی، مذہبی اور قوم پرست عناصر سے صرف نظر کرتی رہی ہیں۔ آپ صرف ایک ہی مثال سے اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اقبال احمد خان جو مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے بعد میں جونیجو لیگ بننے پر اس میں چلے گئے، نے اپنے ایک انٹرویو میں بڑا خوبصورت فقرہ کہا تھا۔

''بھٹو نے قوم کا ڈسپلن ختم کیا۔ نواز شریف نے بچے بچے کو کرپٹ بنا کے رکھ دیا''۔ یہ 20 سال پہلے کا کہا گیا فقرہ یا تجزیہ ہے۔ اب ملک، معاشرہ، ادارے، محکمے سبھی جس حال سے دوچار ہیں ان کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔

میرے اپنے تجزیے کے مطابق جب سے ون یونٹ توڑا گیا ہے قوم کا اتحاد واقعی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں جو مسلمان بھی ہیں اور پاکستانی بھی۔ بلوچستان میں پنجاب و دیگر صوبوں کے لوگوں کو بسوں سے اتار کر گولیاں مار دینا یا کراچی میں مہاجروں کے علاوہ کسی کو نہ گھسنے دینا اور 68 سال بعد بھی اپنے آپ کو مہاجر کہلوانا سوائے کیا ہے؟ اگر صوبوں کی حکومتوں کا تجزیہ کیا جائے تو سبھی صوبوں میں قوم پرست اور مذہبی مافیا سامنے آ چکا ہے جو نہ تو عوام کے مسائل حل کر رہا ہے اور نہ ہی اپنے صوبہ یا ملک کی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کر رہا ہے لیکن مرکز کے سامنے ایسے طاقتور مافیا کی صورت میں کھڑا ہے جس سے مرکز ٹکر نہیں لے سکتا۔ انہی صوبائی حکومتوں کے زیر سایہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے دہشت گرد پناہ لئے ہوئے پرورش پا رہے ہیں۔ سابقہ حکومتیں خواہ وہ فوجی ہوں یا جمہوری یا ان کے ادوار کی ایجنسیوں کے کرتا دھرتا ان دہشت گردوں کی طرف دیکھنے کی جرأت یا کوشش ہی نہیں کرتے رہے۔ ان کی رسّی اس حد تک دراز ہوتی چلی گئی کہ یہ فوج، رینجرز، پولیس تک کو نشانہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ نہتے عوام کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔

سندھ میں پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم مافیا

محکموں، پولیس اور اداروں میں انہی کے لوگ بھرتی ہیں، مجرموں کو کون پکڑے؟ صوبہ سندھ میں کراچی وہ شہر ہے جو ملک کی چالیس فیصد انڈسٹری اور تجارت کا مرکز ہے۔ عرصہ پہلے غیر ملکی طاقتوں نے 1995ء میں ہانگ کانگ چین کے پاس جانے کے بعد کراچی کو فری پورٹ بنانا چاہا لیکن پاکستان کے انکار پر اس شہر میں غیر ملکی طاقتوں نے کبھی بھی امن نہ ہونے دیا اور مسلسل دہشت گردی کے ذریعے معصوم شہریوں کو خون میں نہلانے کا منصوبہ بنایا اور 25، 30 سال سے کراچی میں معصوم شہریوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بات بات پر کراچی بند کر کے ملک کو اربوں روپے کا نقصان پہنچانا، گھیراؤ جلاؤ اور قومیت پرستی کے نام پر پٹھان، مہاجر، سندھی، پنجابی کا خون بہانا اور شیعہ سنی حضرات کو گولی کی بھینٹ چڑھانا سبھی کچھ غیر ملکی طاقتوں کے اسی منصوبے کا حصہ ہے۔

اندرون سندھ میں پیپلز پارٹی اور شہری سندھ یعنی کراچی حیدر آباد میں ایم کیو ایم سیاسی طور پر مضبوط رہی ہے۔ عرصہ 24، 25 سال سے ایم کیو ایم تو ہر حکومت کی

ساتھی رہی لیکن پیپلز پارٹی فوجی حکومت کی مخالف ہونے پر اس میں شامل نہیں رہی۔ انہی دو پارٹیوں نے یہاں ہر اہم محکمہ خواہ وہ پولیس ہو، واٹر بورڈ ہو، صوبائی وزارتوں کے محکمے ہوں سبھی میں میرٹ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اپنے اپنے لوگ بھرتی کروائے ہوئے ہیں۔ یہ انکشاف فوج کے آپریشن شروع کرنے کے بعد سامنے آیا کہ سیاسی پارٹیوں کے ورکر عوام کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی ملوث ہیں اور پارٹی ان کی پشت پناہی کر رہی ہے بلکہ کافی لوگ سرکاری اداروں میں ملازم کی حیثیت سے تنخواہ بھی لے رہے ہیں۔

پہلے بھی کراچی میں کئی مرتبہ آپریشن اس لئے ناکام ہوا کہ نہ تو اصلی مجرموں تک پہنچا جا سکا اور نہ ہی ان کے مراکز کو تباہ کیا گیا۔ اب فوج نے ایک تو ہر صوبے میں دہشت گردوں کے مرکز قبائلی علاقہ کے علاوہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کرنے والی سیاسی پارٹی ایم کیو ایم کے مرکز نائن زیرو پر چھاپہ مارا ہے۔ علاوہ ازیں دہشت گردی میں ملوث دیگر مذہبی تنظیموں سنی تحریک، لشکر جھنگوی، طالبان کے گروپوں، بلوچ لبریشن آرگنائزیشن سمیت بلا امتیاز کارروائی کی ہے اور مجرم کو ہی مجرم گردانا گیا ہے اور مجرم یا دہشت گرد یا اس کی پشت پناہی کرنے والے تک شکنجہ تنگ کیا گیا ہے۔ ان صوبوں میں عوام کی حالت زار یہ ہے کہ صرف سندھ کے ایک ضلع تھر میں ایک سال کے دوران ہی سینکڑوں معصوم بچے خوراک کی کمی اور دوائی نہ ملنے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے گئے۔ بیڈ گورننس کی اس سے بدترین صورت حال اور کیا ہو سکتی ہے۔ صوبہ میں امن وامان اور دہشت گردی عروج پر ہیں۔ عوام کی فلاح کے لئے صاف پانی، سڑکوں، ہسپتالوں، تعلیمی اداروں کا جال بچھتا نظر نہیں آ رہا تو دونوں پارٹیاں اپنے کون سے سنہری کام کرنے پر ڈینگیں مار رہی ہیں اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں۔

بے خوفی جرائم بڑھانے کا سبب

پوری دنیا میں کسی بھی جگہ جرائم بڑھنے کی وجوہات جرائم کو آہنی ہاتھوں سے نہ روکنا اور انہیں پنپنے کا موقع دینا ہے۔ امریکہ یورپ کے علاوہ اکثر ممالک دہشت گردی اور دیگر جرائم سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی وجہ سے کامیاب رہے ہیں۔ سعودی عرب میں اسلامی قوانین کے مطابق سخت ترین سزائیں جرائم کی سب سے کم تعداد ہونے کی وجہ ہے لیکن ہمارے ملک میں ہر سیاسی اور فوجی حکومت اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے ان مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈالتی رہی۔ عدالتوں کا پیچیدہ نظام ہونے، اثر و رسوخ اور دولت والے مجرموں سے نرمی برتنے اور برسر اقتدار طبقہ یا حکومت وقت کے دباؤ میں آ کر مجرموں سے امتیازی سلوک برتنے کی وجہ سے جرائم میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ مجرم کا حوصلہ بڑھتا رہا ہے بلکہ میرا تجزیہ یہ ہے کہ صوبائی ہائی کورٹس بھی صوبے کی زبان بولنے پر مجبور ہو چکی ہیں کیونکہ جس جج کو صوبہ کی حکومت اس منصب پر فائز کرے گی وہ اس حکومت یا پارٹی کے گن گائے گا۔ انصاف نام کی چیز معاشرے میں ناپید ہو چکی ہے خواہ وہ سماجی انصاف ہو یا معاشی انصاف۔

پچھلے ادوار میں 900 سے زائد ایسے مجرم جو بم دھماکوں، معصوم شہریوں کے قتل و غارت میں ملوث تھے اور دشمن کے ایجنٹ تھے، ٹھوس شہادتیں نہ ہونے کی وجہ سے عدالتوں سے سزا پانے سے صاف طور پر بچ نکلے۔ اب دشمن کے ایجنٹوں کے بارے میں کون شریف شہری جا کر گواہی دے کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالے گا۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کا مجرموں، ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں کی پشت پناہی کر کے انہیں پولیس یا عدالتی شکنجے سے مکھن میں بال کی طرح بحفاظت نکال لینے کی وجہ

سے جرائم اور دہشت گردی کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔

پنجاب میں مسلم لیگ کرپشن ختم نہ کر سکی

صوبہ سندھ میں دو پارٹیوں کے گٹھ جوڑ ہونے کی طرح پنجاب میں مسلم لیگ (ن) عرصہ سات سال کے طویل عرصہ سے اقتدار پر قابض ہے اور اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی صوبے کے سرکاری محکموں، اداروں سے رشوت، لوٹ مار اور کرپشن ختم کرنے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ویسے تو یہ مسلم لیگ چہرے بدل کر قائداعظم لیگ کے روپ میں جنرل مشرف کے دور میں بھی اقتدار میں رہی ہے اور اس سے پہلے بھی وقفے وقفے سے دس بارہ سال اقتدار کے مزے لوٹتی رہی ہے یعنی صوبہ میں مسلم لیگی اقتدار کا عرصہ 1985ء سے لے کر تاحال 30 سال کی طویل مدت پر محیط ہے۔ جو پارٹی یا لیڈر 30 سال کے طویل عرصہ میں بھی نہ تو عوام کے مسائل حل کر سکے اور نہ ہی کرپشن اور لوٹ مار کے خاتمہ کے لئے کچھ کر سکے وہ کس منہ سے حکمرانی کرنے کی دعویدار ہے۔ ایم این اے اور ایم پی اے حضرات نے علاقے میں اپنی دہشت گردی قائم رکھنے کے لئے ہزاروں مسلح افراد رکھے ہوئے ہیں جن میں سے اکثریت مجرموں کی ہی ہے۔ یہی حال صوبہ سندھ کے بڑے زمینداروں اور اراکین اسمبلی کا ہے جو نہ صرف مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں بلکہ ڈاکوؤں کو بھی محفوظ پناہ گاہیں مہیا کرتے ہیں اور پنجاب ہو یا سندھ یا بلوچستان کبھی کسی حکومت نے پولیس کو ان سماج دشمن عناصر، ڈاکوؤں اور مجرموں کی سرکوبی کے لئے فری ہینڈ نہیں دیا۔ جب تک ان تمام مجرموں اور ان کے سرپرستوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا ملک میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہ ہوگی اور یہ ہاتھ اب فوج کے سوا کوئی نہیں ڈال سکتا کیونکہ ملک کے دو صوبوں میں علیحدگی پسند عناصر قوم پرستی اور فرقہ واریت کی آڑ میں دہشت گردی کو فروغ دے کر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل چاہتے ہیں جس کے لئے دشمن ملک کے اہم اداروں ''را'' کی بھی انہیں مکمل سپورٹ حاصل ہے جس کا برملا اظہار عسکری قوتوں کے علاوہ وزیر داخلہ اور آرمی چیف بھی کر چکے ہیں۔

خیبر پختونخوا میں مذہبی لوگ مافیا

دوسرے صوبوں کی طرح خیبر پختونخوا میں مذہبی عناصر ایک مافیا کی صورت میں سامنے آئے ہیں خصوصاً روس سے جنگ میں حصہ لینے والے افغان، قبائلی اور صوبہ خیبر پختونخوا کے باسی بعد میں مذہبی گروپوں کی صورت میں القاعدہ اور طالبان سے بھی وابستہ رہے اور اسی آڑ میں روپے پیسے کی خاطر غیر ملکی طاقتوں کے آلہ کار بن کر دہشت گردی کی وارداتوں اور بم دھماکوں میں ملوث رہے۔ صوبہ میں ایک مخصوص مکتبہ فکر کے علماء کی اکثریت نے اپنی مذہبی طاقت کو سیاسی طاقت میں بدلنے کی کوشش کی کیونکہ طالبان کا تعلق بھی اسی مکتبہ فکر سے تھا اور انہی علماء کے مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر یہ لوگ افغانستان گئے تھے اس لئے ان سب علاقوں میں ایک ہی نظریہ کے لوگوں کی ایک زبردست چین سی بن گئی۔ اب ایک طرف طالبان شریعت کا لبادہ اوڑھ کر کارروائیاں کرتے رہے۔ دوسری طرف چند سر پھرے مذہبی گروپ جو اصل میں دشمنوں سے ایجنٹ تھے دہشت گردی کے واقعات میں سرگرم عمل رہے۔ جنرل مشرف دور میں صوبہ میں حکومت کرنے والی سیاسی مذہبی پارٹیوں نے طالبان کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رکھی گویا منافقانہ رویہ اپنائے رکھا جس کی وجہ سے ایسے لوگوں کو اپنی مذموم کارروائیوں کے لئے شہ ملتی رہی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ دونوں مذہبی پارٹیاں مشرف دور میں اپنے پانچ سالہ اقتدار کے دوران نہ تو عوامی مسائل حل کر سکیں

اور نہ ہی کرپشن، لوٹ مار اور رشوت کم کر سکیں اور نہ ہی جرائم اور بم دھماکوں پر قابو پا سکیں کیونکہ یا تو ان لوگوں میں اتنی اہلیت ہی نہیں تھی یا بعض مصلحتوں کی وجہ سے جن میں ان کے سیاسی و مذہبی مفادات شامل تھے۔ وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ عوام نے ان لوگوں کے اس منافقانہ کردار کی وجہ سے انہیں مسترد کر دیا ہے اور مذہبی جماعتوں کے بھی سیاسی پارٹیوں کے منافقانہ رویہ کی طرح یہ لوگ بھی عوام کی نظروں سے اتر چکے ہیں اور اپنا وقار کھو چکے ہیں۔ جس قوم کے علمائے کرام ہی قوم کے نوجوانوں کو بُرے اور اچھے کاموں کے متعلق اپنے مذہبی اور سیاسی مفادات کی خاطر آگاہ نہ کر سکیں اُس قوم کے نوجوانوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

قومیت کے نام پر عوام کو لڑایا جانے لگا

بلوچستان اس ملک کا ایسا صوبہ ہے جس کی آبادی ملک کے بڑے شہروں کراچی یا لاہور سے بھی کم ہے۔ صوبہ میں صرف ایک شہر کوئٹہ اور باقی بکھری ہوئی آبادی دور دور تک موجود ہے۔ کور قبے میں ملک کا سب سے بڑا صوبہ لیکن آبادی میں سب سے کم۔ یہاں پر دو ہی طبقے موجود ہیں یا تو سرداروں کا طبقہ جو لاکھوں ایکڑ زمینوں کا مالک ہے اور دوسرا غریب طبقہ، درمیانہ طبقہ یہاں پر موجود نہیں ہے کیونکہ نہ تو یہاں کے سردار علاقے میں کارخانے لگنے دیتے ہیں نہ سڑکیں اور پل بننے دیتے ہیں۔ تعلیمی ادارے بننے کی راہ میں بھی سردار رکاوٹ ہیں کیونکہ یہاں کے لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو گئے تو سرداروں کو یہ خوف ہے کہ وہ ہمارے مقابلے میں آن کھڑے نہ ہوں۔ اسمبلیوں میں ان کی آمد میں اضافہ نہ ہو جائے۔ اس لئے ان سرداروں نے جو یہاں کے عوامی نمائندے بھی ہیں یعنی گزشتہ 68 سال سے اسمبلیوں میں بیٹھ رہے ہیں۔ عوام کی سوچ کا رخ اس طرف موڑ دیا ہے کہ پنجاب ہمیں کھا گیا ہے، ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے وغیرہ۔ حالانکہ پچھلا تو چھوڑیں 1971ء سے تا حال 44 سال سے ان صوبوں میں وہاں کے سردار ہی گورنر، وزیر اعلیٰ منتخب ہوتے آئے ہیں ان 44 سالوں میں کھربوں روپے کے بجٹ صوبہ بلوچستان کو ملتے رہے ہیں۔ یہ فنڈز اتنے زیادہ تھے کہ اگر صحیح طریقے سے خرچ کئے جاتے تو نہ تو اس صوبے کا کوئی شخص بھوکا رہ سکتا تھا اور نہ ہی بے روزگار۔ ہر شخص کو ان وسائل کے استعمال سے تعلیم کے زیور سے بہرہ ور کیا جا سکتا تھا۔ صاف پانی اور روٹی کے علاوہ علاج معالجہ کی سہولتیں مہیا کی جا سکتی تھیں لیکن آج اس صوبہ کے لاکھوں لوگ خوراک نہ ملنے کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی خواتین میلوں دور سے پانی بھر کر لانے کی تکالیف برداشت کر رہی ہیں۔ ہسپتال کی سہولت نہ ہونے اور دوائیوں کی کمی کی وجہ سے یہاں کے غریب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔

یہ سب یہاں کے جاگیردار اور سردار مافیا کا قصور ہے جو عوام کے لئے مختص فنڈز خود ہڑپ کر جاتا ہے لیکن عوام کے لئے کچھ بھی نہیں بچتا۔ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ لوگ قوم پرستی کا شوشہ چھوڑ کر معصوم عوام کو گمراہ کرتے آ رہے ہیں۔ گزشتہ حکومت کی مصلحتوں، مفاد پرستانہ پالیسیوں نے ان سرداروں کو یہاں طاقتور مافیا بنا کے رکھ دیا ہے جو نہ تو ملک کی ترقی کا کوئی بھی منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے دیتے ہیں اور عوام کی فلاح کے کاموں میں بھی رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔

اداروں کی تنزلی

ملک میں 34 سال جمہوری حکومتوں اور 34 سال ہی فوجی ڈکٹیٹروں نے حکومت کی۔ آج جب تمام سیاسی جماعتوں کی تائید وحمایت سے آپریشن شروع کیا

گیا اور دہشت گردوں اور ٹارگٹ کلرز کے نیٹ ورک کے پس پشت سیاسی اور مذہبی جماعتیں کھڑی نظر آئیں اور صوبائی حکومتیں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں تو پلان پر عمل درآمد کرنے والے ادارے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ملک میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے پتھر اٹھایا جاتا ہے نتیجے میں گند ہی گند نظر آتا ہے۔ حکومتیں تبدیل کرنے، اقتدار پر بٹھانے اور ہٹانے والی مقتدر قوتیں یعنی ایجنسیاں بھی معاشرے، محکموں اور اداروں کی دوسرے لفظوں میں ملک کی اس تباہی کی برابر ذمہ دار ہیں۔ برسر اقتدار حکومتوں سے ڈکٹیشن لے کر یا اپنے خاص منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے ایجنسیوں کے فیصلے یا کارروائی یا مداخلت سے بھی ملکی اداروں کو شدید نقصان پہنچتا رہا۔ کرپشن اور لوٹ مار کو فروغ ہوتا رہا۔ فلاں مذہبی گروپ کو منظر عام پر رکھنا ہے فلاں سیاسی گروپ کو فلاں کے مقابلہ میں استعمال کرنا ہے۔ اسی پالیسی نے دہشت گردی کو فروغ دیا۔ جرائم پیشہ لوگ خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی یا عام سماج دشمن عناصر سب کا مقصد عوام اور ملک کو ہر طریقے سے نقصان پہنچانا ہے۔

سزا کا نظام نہ ہونے سے مجرم طاقتور ہوگئے

مقولہ مشہور ہے کہ دگڑے تگڑوں کا پیر ڈنڈا یعنی کسی بھی قسم کے جرائم میں ملوث مجرموں کو جب تک سزا نہیں دی جائے گی نہ یہ سیدھے ہوں گے نہ جرائم میں کمی واقع ہو سکے گی۔ گزشتہ ادوار میں غیر ملکی طاقتوں جن میں یورپی یونین کا زبردست دباؤ شامل تھا پاکستان میں سزائے موت کے قانون کو مؤخر کرادیا اور دھمکی دی تھی کہ اگر پاکستان مجرموں کو سزائے موت دے گا تو یورپی یونین پاکستان کی ایکسپورٹ پر پابندی لگا دے گی۔ صرف ایکسپورٹ سے ہی چند ارب ڈالر کمانے والے پاکستان نے یورپی یونین کی اس دھمکی پر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور دہشت گردی، بم دھماکوں اور دیگر جرائم میں ملوث مجرموں کی پھانسیوں پر عملدرآمد روک دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مجرموں کو سزا نہ ملنے کی وجہ سے دہشت گردی کے واقعات، بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری کے علاوہ قتل و غارت کے جرائم میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور کوئی بھی شہری یا ادارہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔

8600 افراد کو عدالتوں نے پھانسی کی سزا دی تھی۔ دوسرے ممالک جن میں امریکہ اور یورپ کے ممالک شامل ہیں۔ خود سنگین جرائم پر مجرموں کو پھانسیاں دے رہے ہیں لیکن انسانی حقوق کے نام پر پاکستان جیسے ملک کو مجرموں کو پھانسی دینے سے روک رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ جرائم پیشہ دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ہر ملک نے اپنے ماحول کے مطابق دیکھنا ہے کہ اسے معاشرے کو جرائم سے پاک کرنے کے لئے کیا کیا اقدامات اٹھانے ہیں۔ ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

کھربوں روپے کی کرپشن کے انکشافات

نیشنل ایکشن پروگرام شروع کرنے کے ساتھ بجلی، گیس کے اربوں روپے کے نادہندگان، اربوں روپے کی ٹیکس چوری، کسٹم ڈیوٹی، خورد برد کرنے، ملکی دولت، غیر قانونی طریقے سے غیر ممالک میں بھیجنے یعنی لانڈرنگ کے واقعات، سرکاری محکموں، اداروں میں اربوں روپے کی کرپشن، خزانے کو نقصان پہنچانے کے نت نئے واقعات سامنے آرہے ہیں۔ ساتھ ہی سرکاری ملازموں کے محدود آمدنی کے باوجود لامحدود وسائل بنانے کے کیس اخبارات میں آپ پڑھ رہے ہوں گے۔ کوئی بھی محکمہ، ادارہ، کاروباری طبقہ، صنعت کار، عدلیہ سے منسلک لوگ تک اس کرپشن سے محفوظ نہیں ہیں۔

سیاسی عناصر کا گٹھ جوڑ

نیشنل ایکشن پروگرام کے تحت جب فوج نے دہشت گردوں، بھتہ خوروں اور ہر قسم کے مجرموں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ کرپشن اور لوٹ مار میں ملوث ہر قسم کے غلط عناصر کی طرف شکنجہ بڑھانا شروع کیا تو تمام سیاسی پارٹیاں جو بظاہر تو ایک دوسرے کی خون کی پیاسی بھی رہی ہیں نے ایکا کرلیا۔ سبھی سیاسی عناصر نے سونگھ لیا ہے کہ اس مرتبہ فوج نے جس آپریشن یا سرجری کا آغاز کیا ہے وہ صرف دہشت گردوں کے خاتمہ تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کا دائرہ معاشرے کے ہر طبقہ تک بڑھایا جائے گا اور ہر غلط، عوام کے لئے قاتل اور ملک کے لئے نقصان دہ عناصر کو شکنجے میں جکڑا جائے گا کیونکہ 68 سال خصوصاً 44 سال سے شتر بے مہار معاشرہ کو درست سمت پر گامزن کرنے کا وقت اب آ چکا ہے اور اب نہیں تو کبھی نہیں Now or Never والی پوزیشن ہے ورنہ ملک پاکستان کو شدید نقصان سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے جس کا ملک مزید متحمل نہیں ہو سکتا۔ 20-20 سال سے اقتدار میں رہنے والے سینکڑوں سیاست دانوں کے کیسوں کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔

عدالتوں کی حالت چیف جسٹس کی زبانی

ملک میں بااثر دولت والے برسر اقتدار طبقے کو انصاف مہیا کیا جا رہا ہے۔ ناانصافی، ظلم، زیادتی کا شکار صرف اور صرف غریب طبقہ ہے۔ قانون کے مطابق فیصلے کرنے والوں کے اس دہرے معیار کی وجہ سے معاشرہ کی ایسی تباہی ہو رہی ہے جو ہمیں اس ترقی یافتہ دور میں بھی جنگل کے ماحول کی طرف لے کر جا رہی ہے۔

چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ جسٹس فیصل عرب کا 4 مئی کی اخبارات میں بیان ہے کہ عدالتوں سے بااثر افراد کو انصاف ملتا ہے۔ قانون بنانے سے جرائم کم نہیں ہوں گے۔ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ جسٹس منظور اے ملک کا بیان جو 18 مئی کے اخبارات میں چھپا کہ ''عام آدمی نظام عدل سے مطمئن نہیں، وکلاء ہڑتال کلچر ختم کریں''۔ 26 اپریل کو ہی لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب نے صاف لفظوں میں تسلیم کیا کہ اس ملک میں یا عدالتوں میں سائل کی بات کوئی نہیں سن رہا۔ قوانین پر بھی عمل نہیں ہو رہا۔ آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ اگر ماضی کی طرح احتساب کا عمل بلاامتیاز نہ شروع کیا گیا اور بااثر افراد کو مقدس گائے قرار دے کر ان سے بازپرس نہ کی گئی تو احتساب کا یہ عمل نامکمل ہی رہے گا۔ دنیا کا کوئی سا قانون، مذہب یا اخلاقی اقدار ان دو طبقوں کو جزا و سزا کے عمل سے بری قرار دیتا ہے؟ اس سے اندازہ لگائیں کہ ملک کے مقتدر ترین عہدوں پر بیٹھی شخصیات کے اپنے ہی اداروں کے متعلق کیا ریمارکس ہیں اور پانی کس حد تک سر سے گزر چکا ہے۔

کچھ تجاویز

44 سال سے قائداعظمؒ کے درس اتحاد، تنظیم، یقین کو خیرباد کہنے والی قوم کو راہ راست پر ڈالنے، قانون کی حکمرانی کے قیام، قومی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم لئے جو بھی سرگرم عمل ہے پوری قوم کی تائید و حمایت اسے حاصل ہے اس کے ساتھ ساتھ قوم کو ایک بنانے، ملک کو سیاسی، مذہبی، کاروباری، قوم پرست مافیا سے نجات دلانے کے لئے چند قابل عمل تجاویز دی جا رہی ہیں۔

قوم پرستی کے زہر نے عوام کو عوام سے لڑانے میں

کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فرقہ واریت کے نام پر اس ملک کے شہری ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ اس ملک کے 18 کروڑ عوام کو اس عفریت سے محفوظ رکھنا ہے تو عرصہ 20 سال کے لئے قوم پرستی اور فرقہ واریت کے نام پر سیاست کرنے والوں، مذہبی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے اور اس کا پرچار کرنے والوں کے گرد شکنجہ کسا جائے نہ ہی اس سے متعلق لٹریچر کی اشاعت ہونی چاہئے۔

لسانی بنیادوں پر صوبے ختم کئے جائیں

علاقے کی ترقی، عوام کی خوشحالی کے لئے دس صوبے بنادیئے جائیں۔ مسلسل 44 سال سے لسانی بنیاد پر بنے والے صوبے ایک دوسرے کے عوام کے دلوں میں نفرت بڑھانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکے۔ اس 44 سال کے طویل عرصہ میں کھربوں روپے کے فنڈز بھی ان صوبوں کے سیاست دان، سرکاری افسر، سردار کھا گئے لیکن نہ تو کسی صوبے کے عوام کی حالت بدل سکی اور نہ ملک کی تعمیر و ترقی کا کام انجام دیا جاسکا، اس لئے قومیت کے نام پر چار صوبوں کی بجائے بے شک دس صوبے بنادیئے جائیں لیکن ان میں عوام کے مسائل کے حل اور ملک کی ترقی کا کام سامنے آنا چاہئے۔ ملک کے پسماندہ صوبوں سندھ و بلوچستان میں نئے شہر بسائے جائیں۔ پورے ملک کے شہریوں کو آزادی ہو کہ وہ تلاش روزگار یا کاروبار کے لئے اپنے ملک کے جس حصہ میں مرضی بلا روک ٹوک سفر کرسکیں یا سکونت اختیار کرسکیں۔ جب تک ایسی فضا ملک میں قائم نہیں ہوگی تو اور بغض اپنے دلوں میں رکھے عوام نہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے نہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے گا۔ صوبوں کو مختلف ممالک سے توانائی و دیگر کاروباری معاہدے کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئیں اور اس سے ملک کے ہر علاقے کے لوگوں کو فوائد حاصل ہونے چاہئیں۔

کرپٹ شخص کو سیاست سے آؤٹ کیا جائے

سیاست میں سرگرداں لوگ جب بھی برسر اقتدار آتے ہیں لوٹ مار اور کرپشن کی مثالیں قائم کرتے ہیں۔ جب فوجی حکومتیں ان کرپٹ لوگوں کو سزا دینے کا ٹارگٹ لے کر اقتدار سنبھالتی ہیں تو انہی سیاست دانوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر نئے کرپٹ لوگوں کا گروہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کے لمبے عرصے تک چلنے کی وجہ سے کرپشن اور لوٹ مار کی تمام حدیں پار کی جاچکی ہیں۔ سیاست میں کرپٹ لوٹ مار کرنے والوں، قرضے ہڑپ کرنے والوں، بجلی، گیس کے نادہندگان، اخلاقی جرائم میں ملوث افراد کو 20 سال کے لئے سیاست سے آؤٹ کیا جائے اور ان کے خاندان کے ایسے افراد کو بھی جو اسی شخص کی آمدن پر پلتے ہیں تاکہ مستقبل میں عبرت حاصل ہوسکے۔ اس کے علاوہ ایسے جرائم میں ملوث دیگر مجرمان کو بھی خواہ ان کا تعلق کسی طبقہ سے بھی ہو سخت سزائیں دی جائیں تاکہ آئندہ کے لئے کسی کو بھی قومی خزانے کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہ ہوسکے۔ کرپشن اور لوٹ مار کے کیسوں کا فیصلہ عدالتوں کو تین ماہ میں کرنے کا پابند کیا جائے۔

ملک اور قوم کے مفاد میں جو بھی اقدام ہو، بلا تاخیر اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ نہ جانے کیوں مصلحتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ آہنی ہاتھ سے کیا ہوا عمل ہی شفا بخش ہو گا۔

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

◆

اس کائنات میں اسی خدا کی حکمرانی ہے جس نے لاکھوں سال پہلے خونخوار، ظالم ڈائنوسارز کی ہڈیاں عجائب گھروں میں سنبھال کے سجوائی ہوئی ہیں۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ یہاں بقاء صرف فلاح بانٹنے والوں کو ملتی ہے۔ باقی سب نے فنا ہونا ہے۔

☆ ابدال بیلا

آئیں آپ کو جیراسک پارک کی سیر کرواتا ہوں۔ سائنس وان غلط کہتے ہیں کہ ڈائنوسارز نہیں رہے۔ وہ ہیں اور یہیں ہیں۔ محقق زوالوجسٹ جھوٹ کہتے ہیں کہ لاکھوں سال پہلے اس دنیا میں ایسی مخلوق بستی تھی جن کی خوراک انہی کے جنگل باسیوں سے ہزار ہا گنا زیادہ تھی۔

ایسی خوش خوراک مخلوق آج بھی موجود ہے۔ جن کے ایک دن کا رزق باقی مخلوق کے سال بھر کے رزق سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک سال سے کیا دس سال سے، سو سال کے رزق سے زیادہ ہوتا ہے۔

رزق کو جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سے مراد صرف وہ خوراک نہیں ہوتی جس سے تن کا پیٹ بھرا جائے۔ ایسا حقیر رزق صرف بے زبان جانوروں سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کے رزق کی تعریف میں ہر وہ آسانی اور آسائش آ جاتی ہے جس کی انسان خواہش پالتا ہے جس کی جستجو کرتا ہے اور جسے حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ، محنت اور سازشیں کرتا ہے۔ ہم پڑھے لکھے لوگوں نے خواہ مخواہ اَن پڑھ جانوروں کو بدنام کرنے کی خاطر ان سے الٹی سیدھی کہانیاں وابستہ کر رکھی ہیں۔ انہی کہانیوں میں سے ایک کہانی لاکھوں سال پہلے اس کرۂ ارض پہ رہنے والوں ''ڈائنوسارز'' کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈائنوسارز کئی طرح کے ہوتے

تھے۔

ہوتے بھی دیوہیکل تھے۔ پہاڑ جیسے اونچے لمبے جسم۔ شہتیروں جیسے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں۔ تلواروں جیسے نوکیلے دانت اور اندھے غاروں جیسے کبھی نہ بھرنے والے پیٹ۔ ان ڈائنوسارز کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ کچھ سبزی خور ہوتے تھے۔ وہ ناشتہ کرنے پہ آتے تو جنگل کے پانچ سو درختوں کی ہری کونپلیں اور کم عمر شاخیں پتوں سمیت چبا جاتے۔ باقی دن جگالی کرتے کرتے کوئی ڈیڑھ ہزار مزید پودے چٹ کر جاتے۔ شام تک آدھا جنگل ٹنڈ منڈ ہو جاتا۔ اگلی صبح وہ ساتھ والے جنگل میں جا پڑاؤ ڈالتے۔

گوشت خور ڈائنوسارز کو جگالی کی عادت نہیں تھی۔ جگالی کرنے والے جانوروں کے کاٹنے کے دانت نہیں ہوتے۔ منہ کے اندر چوڑی داڑھیں ہوتی ہیں جو چکی کے پاٹوں کی طرح چلتی ہیں۔ یہ شریف النفس، فقیر قسم کے جانور ہوتے ہیں۔ گائے، بھینس، بکری۔ ایک نوالہ لے کر گھنٹوں منہ ہلا ہلا کے اس کا مزہ لیتے رہتے ہیں۔ گوشت خور ایسا تھوڑی کرتے ہیں۔ گوشت خور ڈائنوسارز کے دانت بہت نوکیلے ہوتے تھے۔ وہ کاٹتے اور ہڑپ کر جایا کرتے تھے۔ وہ قیلولہ کرنے کے بعد سر اٹھا کے دائیں بائیں جنگل میں چند قدم چلتے اور کسی جوہڑ کنارے گھونٹ گھونٹ پانی پیتے، ہرنوں کے آدھے جتھے کو کھا جاتے۔ شام کو پیٹ میں بھوک اٹھتی تو بڑے بڑے ڈگ بھرتے معصوم گائیوں کے گلوں کو جا دبوچتے۔ ایک گائے سے مشکل سے ان کے تین نوالے بنتے تھے۔

اڑنے والے ڈائنوسارز کی کتھائیں بھی مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پر بہت چوڑے، پنجے مضبوط اور چونچیں لمبی ہوتی تھیں۔ وہ ایک اڑان اڑتے اور جہاں انہیں من بھاتی خوراک نظر آتی، وہاں جھپٹ کے بکریوں کے ریوڑ سے چند بکریاں پنجوں میں پکڑ کے اڑ جاتے۔ کہتے ہیں ان کے گھونسلے اونچی جگہوں پہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے گھونسلوں کے آس پاس چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور بچے کھچے چھیچھڑوں کے انبار ہوا کرتے تھے۔

ڈائنوسارز کی اور بھی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔

بہر حال ان سب ڈائنوسارز میں مشترک بات ایک تھی۔

جنگل کے باقی باسیوں کی نسبت وہ ہزار گنا زیادہ بھوک پالے ہوئے تھے۔

کہتے ہیں اسی بڑھی ہوئی بدمست اور بے لگام بھوک کے ہاتھوں وہ ہولے ہولے اس کرہ ارض کی بستی سے اپنی ہستی مٹا بیٹھے۔ نیست و نابود ہو گئے۔

غلط کہتے ہیں۔

ساری سائنس اس بدمست، بے لگام اور نہ ختم ہونے والی بھوک کے نتیجے سے جو نتیجہ نکال رہی ہے وہ صحیح نظر نہیں آتا۔ سائنس فکشن لکھنے والوں نے کمال ہنرمندی سے لاکھوں سال پہلے مٹے ان ڈائنوسارز کے جین ڈھونڈ لئے۔ کسی مچھر کے پیٹ میں خون کی بوند میں بند کسی ڈائنوسار کے خون کے خلیوں کے جین تلاش کر کے انہیں پھر سے ترتیب دے دیا۔ پھر کسی پھدکتے مینڈک کی شریانوں میں لاکھوں سال پہلے کے متروک ڈائنوسار کے جین ڈال کے نئے سرے سے ڈائنوسارز کی تخلیق کر لی۔ پھر ان ڈائنوسارز کو ایک خوش رنگ وسیع پارک میں مقید کر کے اس پارک کا نام جیراسک پارک رکھ دیا اور دنیا کے سیاحوں کو وہاں سیر سپاٹے کے لئے بلوانے لگے۔ سائنس فکشن کی کہانی میں بھی جیراسک پارک کے ڈائنوسارز، ڈائنوسارز ہی رہے۔ وہ اپنی جبلت پر ڈٹے رہے۔ انسانوں کو پکڑ پکڑ کے اپنا پیٹ بھرتے رہے۔

میں سوچتا ہوں ان سائنس فکشن لکھنے والوں کو ڈائنوسارز دیکھنے اور دکھانے کے لئے سیاحوں کی منافع

بخش سیاحت کی خاطر جس جیراسک پارک کا خیال آیا تھا وہ تو پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔
دیکھو۔
''ڈائنوسارز'' کی پہلے تعریف طے کرنا پڑے گی۔
اگر تو اسے مخصوص دیوہیکل خدوخال کے ساتھ محض اس کی اناٹومی دیکھ کے یہ نام دینا ہے، مخلوق کی ہڈیوں کے پنجر نیویارک کے ہسٹری اینڈ سائنس میوزیم میں پڑے ہیں تو ان ڈائنوسارز کا زمانہ گزر گیا لیکن اگر ڈائنوسارز کو ان کے طرز عمل، بے رحم استحصالی رویے، اندھی ظالمانہ طاقت کے استعمال گھمنڈی انا اور ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر راستے کی ہر دیوار کو توڑنے والا استعارہ بنا کے استعمال کرنا ہے۔ ہر سچ آواز کو گم کرنے والا کہنا ہے۔ راہ میں کھڑے ہر خبردار کرتے دیوانے کو ہڑپ کرتا جانور بتانا ہے تو یہ ڈائنوساز موجود ہیں، بہت ہیں۔
ایسے ڈائنوسارز سے آج کی دنیا بھری پڑی ہے۔
یہ اتفاق کی بات بھی نہیں ہے کہ جس عہد میں ڈائنوسارز ہوتے ہیں اس دور میں سکہ انہی کا چلتا ہے۔ آج بھی ہر رائج الوقت سکہ انہی کی جیب میں ہے۔ چونکہ ڈائنوسارز طاقت ور ہوتے ہیں اس لئے کمزوروں سے بھری دنیا میں ان کی حکومت رہتی ہے۔ پورے ایشیا اور سارے افریقہ کی بوٹیاں وہ نوچ چکے ہیں۔ ہڈیاں انہی کے راستوں کی گزرگاہوں میں بکھری پڑی ہیں۔ یہ مہذب ڈائنوسارز اپنے نوکیلے دانت اور بے باک جبڑے، خوش رنگ ریشمی نقاب میں چھپائے رکھتے ہیں۔ نقاب پہ اکثر افق کی سرخی اور نیلے آسمان کے تارے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے بڑے ملائم نام رکھے ہوئے ہیں۔
کہیں وہ کاروباری ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔
کہیں حقوق دلانے والے فسادی ادارے۔
کہیں انصاف فروش بین الاقوامی ایجنسیاں۔
اور کہیں مہا ڈائنوسارز کے پالے ہوئے وفادار، راجے، مہاراجے۔
تاریخ کی کتابوں میں ڈائنوسارز کے کئی نام درج ہیں۔ کہیں فرعون، کہیں نمرود اور کہیں شداد۔ آج کے ہر فرعون نے بھی ایک دن اسی تاریخ کا سیاہ باب بننا ہے۔ کہنے کو لاکھ سنپولیے اپنی آستینوں میں چھپائے اپنے شکار پہ جھپٹتا پھرے، مگر ایک دن خود اس نے شکار ہونا ہے۔ اپنے ہی پالے ہوئے سنپولیوں کے زہر سے ڈسا جانا ہے۔ سانپ سے زیادہ زہریلا کون ہوتا ہے؟ مگر کوئی سانپ کتنا ہی بڑا شیش ناگ جاتا ہے۔ سانپ سے زیادہ زہریلا کون ہوتا ہے؟ مگر کوئی سانپ کتنا ہی بڑا شیش ناگ بن جائے ایک دن اس کے دانت جھڑ جاتے ہیں۔ اس کے اپنے حلق میں پڑی زہر کی تھیلی اس کو زہر کا ٹیکا لگا دیتی ہے۔ یوں ڈائنوسارز آتے رہے ہیں۔ جاتے رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی ڈائنوسار یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ اس نے کبھی جانا ہے۔ حالانکہ جو واقعتاً ڈائنوسارز تھے، ان کی ہڈیاں بھی خدا نے محفوظ کر کے عجائب گھروں میں رکھوائی ہوئی ہیں۔
کہ دیکھ لو۔
یہ بھی چلے گئے۔
ان کی دیوہیکل موٹی کھوپڑیوں کے نیچے طاقتور خونخوار جبڑے دیکھ کے پتہ چلتا ہے کہ انہی کے منہ میں رہتے ان کے وفادار بے رحم نوکیلے دانتوں نے انہیں کبھی سچ چکھنے نہ دیا۔
دانتوں سے زیادہ برا مشیر کوئی نہیں ہوتا۔
دانت نوکیلے اور مضبوط ہوں تو یہ ذہن کو غلط گمان دیتے ہیں۔ کہتے ہیں جو چاہو اٹھاؤ اور کاٹ کھاؤ۔ وہ تو جب کوئی ان کی کم عقلی سے کبھی لوہے کے چنے چبا بیٹھے تو سب سے پہلے یہی احمق دانت جبڑوں سے جھڑتے

ہیں۔اپنی جگہ سے کھسکتے ہیں۔

ڈائنوسارز کی ایک ہی بدنصیبی ہے۔

ان کو طاقت کے ساتھ گھمنڈ بھی ملا ہوتا ہے۔

یہ ہو نہیں سکتا کہ اندھی بے رحم طاقت کے ہوتے ہوئے کوئی غرور اور گھمنڈ سے بچ جائے۔ جہاں غرور ہو گا، وہاں گیان اور وجدان کی بتی بند رہتی ہے۔

یہ دو الگ اور مخالف راستوں کی منزلیں ہیں۔

گھمنڈ اپنی ''انا'' کی تلوار ہر کمزور کی گردن پر چبھو کے پلتا ہے۔

اور عرفان اپنی ''انا'' کی ہر چبھتی نوک کٹا کے حاصل ہوتا ہے۔

اب ڈائنوسارز نے تو کاٹنا ہوتا ہے، پھاڑنا ہوتا ہے، چبانا ہوتا ہے، ہڑپ کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے اس مشیر کا کہا مانتے ہیں جو پھاڑنے اور چبانے کا مشورہ دے۔ اگر ڈائنوسار کوئی ریاست ہے تو کمزور ریاستوں کا شکار کرتا ہے۔ شکار ہونے والی دھرتی کوئی بھی ہو۔ ہمارے پڑوس میں ہو یا دور۔ ڈائنوسار نے اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ کوئی راج یا راجیہ اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہو وہ تلملاتا ہے۔ سازشیں کرتا ہے۔ خود اس میں اودھم مچانے کی وہاں صلاحیت نہ وہ تو وہ اس راج نیتی سے بدنیتی کے ساتھ عیاری سے کسی اپنے جیسے ڈائنوسار کو آشیرباد دے دیتا ہے۔ پھر دور بیٹھا اپنی مرضی کے نوالے توڑتا رہتا ہے۔ فساد کراتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں فساد ہے۔ اسی لئے ہمارا بے نظم ہجوم بھرا جنگل سارے کا سارا جیراسک پارک بنا ہوا ہے۔

ہمارے جیراسک پارک میں ڈائنوسارز کی بہت ورائٹی ہے۔

لاکھوں سال پہلے تو ڈائنوسارز صرف تین قسم کے ہوتے تھے۔ سبزی خور، گوشت خور یا اڑنے والے۔ ہمارے جیراسک پارک کے ہر ڈائنوسار میں یہ تینوں صلاحیتیں موجود ہیں۔ پھر بھی ان کے شکار کا طریقہ الگ ہے۔ یہاں کا ہر ڈائنوسار صبح آنکھ کھولتا ہے تو ہزار ہا کھلنے والی کونپلوں کا آنے والا کل چبا جاتا ہے۔

کہیں وہ میرٹ کو نہ ماننے والا بیوروکریٹ ہے۔

کہیں سازشی عیار سیاستدان۔

کہیں بکا ہوا قلمکار۔

اور کہیں میچ فکس کر کے کھیلنے والا کھلاڑی۔

اسے ہر طرح کا کھیل ہر میدان میں کھیلنا آتا ہے۔

وہ فٹ بال میچ میں کرکٹ کھیلتا ہے اور جیت بھی جاتا ہے۔

صبح دفتر وقت کے بعد جب لنچ ٹائم آتا ہے تو اس وقت تک وہ ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ لوگوں کے حصے کا گوشت بھنبھوڑ چکا ہوتا ہے۔ شام کے ڈنر سے پہلے تک ہمارا ڈائنوسار، اپنے مقام سے اڑ کر کسی نئی شکارگاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ کو میری یہ بات بھی کہانت لگ رہی ہو گی۔ نہیں، یہ سچ کہہ رہا ہوں۔

آپ کو سند چاہئے۔

تو سنئے۔

ایک، ڈیڑھ سو روپیہ دیہاڑی دار مزدور نے اپنی ساری زندگی کی محنت کے آخری دن تک ہر طرح کی جمع تفریق کے ساتھ اپنے بڑھاپے کے دنوں کے لئے جتنی پونجی سوچی ہوتی ہے، وہ ہمارے یہاں کے ڈائنوسار کے عموماً ایک دن کے ایک قلیل عرصے کا منافع ہوتا ہے۔ پتہ نہیں آپ کو اس بات کا تجربہ ہے یا نہیں کہ اگر معاملہ ارب ہا روپوں کی کمائی کا ہو تو ایک دو کروڑ کی کوئی گنتی نہیں رکھتا۔ یوں اگر کروڑوں میں بیوپار ہو تو دو تین لاکھ کے لئے کوئی تردد نہیں کرتا۔ لاکھوں کے سودے میں چند ہزار کی خاطر کون بحث کرتا ہے۔ ہزاروں کی بات میں لوگ چھوٹے نوٹ نہیں گنتے مگر ہمارے اٹھارہ کروڑ لوگوں کے اس جیراسک پارک میں پونے اٹھارہ کروڑ لوگ انہی

چھوٹے نوٹوں بلکہ سکوں کو گن گن کے جیتے اور مرتے ہیں۔

ان لوگوں کے لئے زندگی کا ہر نیا دن نئے سوال لے کر آتا ہے۔

صبح ہوتی ہے وہ بچوں کی تعداد ذہن میں رکھ کے گھر میں موجود نوالے گنتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے انہیں سوچنا پڑتا ہے کہ آج پیٹ بھر کر کھا لیا تو کل کیا کھائیں گے۔ یہ مسکین سفید پوش لوگ نہ اپنا خالی پیٹ دوسروں کو دکھاتے ہیں نہ دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی گزارنے کی سعی میں ہزار محنت کے بعد بھی جو وہ خریدتے ہیں اس خریدی ہوئی ہر شے کے اندر سے کم از کم پندرہ فیصد ان کے خون پسینے کی کمائی ان کے اپنے پیٹ میں نہیں جاتی، کسی نہ کسی ڈائنوسار کے ایک لقمے کے لئے جمع ہوتی رہتی ہے۔ ایسے کم نصیب لوگ جو اٹھارہ کروڑ لوگوں میں سے پونے اٹھارہ کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ کون روز ان کی جیب کاٹتا ہے۔ وہ لاعلم ہیں کہ بوند بوند ان کے جسم کا خون نکل نکل کے کس کے حلق میں جا رہا ہے۔ کوئی دس ہزار مزدور، کلرک یا خوانچہ فروش، ڈبل روٹی، انڈے، سگریٹ، گھی، تیل یا آٹا خریدنے کے بعد جتنا ٹیکس ادا کرتے ہیں ان سب کو ملا کے کسی ایک ڈائنوسار کے کسی چمکیلے ہوٹل کا ایک ڈنر بنتا ہے۔ جو سرکار کے خزانے سے اپنے جمع کئے پیسوں سے ادا ہوتا ہے۔ کوئی دو ہزار گاؤں کے کاشتکار لوگوں کی خریدی ہوئی کھاد، فصلوں کے بیج، کھیتوں کو لگائے پانی پہ خرچ ہوئی بجلی یا تیل، کیڑے مار دوائیوں کے حصول میں دی ہوئی جی ایس ٹی سے کسی ایک ڈائنوسار کے فارن ٹور میں کسی شاہانہ ہوٹل میں قیام کے دوران ایک رات کا بل بنتا ہے۔ یہ کم نصیب کچی بستیوں کے باسی اپنے پچاس ہزار گھروندوں کو بناتے بناتے جیراسک پارک کی انتظامیہ کو جتنی سلامی دیتے ہیں اس سے حکومتِ وقت کے کسی ایک ڈائنوسار کی حفاظت کے لئے بدیس سے منگوائی ایک بلٹ پروف گاڑی کی لاگت پوری ہوتی ہے تاکہ ناانصافی کے ہر موسم میں یہ ڈائنوسار اپنی رعایا سے محفوظ رہیں۔

حیرت ہے۔

سائنس دان اب بھی بضد ہیں کہ ڈائنوسارز کا زمانہ لد گیا۔

ڈائنوسارز ہیں۔

اس جیراسک پارک میں تو وہ اتنی قوت اور اتنے دبدبے سے ہیں کہ اس بار انہوں نے سائنس کی ساری تھیوریاں غلط ثابت کر دینی ہیں۔ اپنی حد سے بڑھی خوش خوراکی سے انہوں نے خود ختم نہیں ہونا۔ اپنے پالنے والوں کو ختم کر دینا ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے قانون کے خلاف بھی نہیں۔

اس لئے کہ ہم جیراسک پارک کے وہ کوتاہ اندیش باسی ہیں جو اپنی رکھوالی کے لئے جب بھی گڈریے چنتے ہیں تو اپنے جیسی کوئی بھیڑ بکری نہیں چنتے۔ کوئی نہ کوئی ڈائنوسار چن لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تھوڑے عرصے بعد ان چنے ہوئے ڈائنوسارز کو چننے کے لئے کوئی ان سے بھی بڑی بھوک والا مہا ڈائنوسار مسلط ہو جاتا ہے۔ کہنے کو اس جیراسک پارک میں پھلنے پھولنے کے لئے صرف ڈائنوسارز کے قبیلے کو سلامتی کی ضمانت ملی ہوئی ہے۔ مگر آج بھی اس کائنات میں اسی خدا کی حکمرانی ہے جس نے لاکھوں سال پہلے خونخوار، ظالم ڈائنوسارز کی ہڈیاں عجائب گھروں میں سنبھال کے سجائی ہوئی ہیں۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ یہاں بقاء صرف فلاح بانٹنے والوں کو ملتی ہے۔ باقی سب نے فنا ہونا ہے۔ رہے نام اللہ کا!

***

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جہاز تو نہایت بے وقوف ہوتے ہوں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں تو آپ کو ان سے عقل مند آدمی مل ہی نہیں سکتا۔

طنز و مزاح

جہاز

☆ خادم حسین مجاہد

عنوان سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ کوئی سائنسی مضمون ہے جو امریکہ، جرمنی، فرانس یا جاپان کے بنے ہوئے جہازوں پر لکھا گیا ہے بلکہ میرا یہ مضمون تو دیسی قسم کے جہازوں پر ہے اور افغانستان، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش ایسے جہازوں کی تیاری اور برآمد میں خودکفیل ہیں۔ یہ جہاز ان تمام ملکوں کے تمام شہروں دیہاتوں اور گلی محلوں میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ عام طور پر کچرا کنڈیوں، ویران اور زیر تعمیر عمارات اور پارکوں میں پائے جاتے ہیں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میری مراد ان جہازوں سے ہے جو نشہ کا پٹرول ملنے سے پرواز کرتے ہیں ورنہ اپنے بنکرز پر گراؤنڈ ہی رہتے ہیں۔ ان کو سیسنا، ایف سولہ، راکٹ اور میراج بھی کہتے ہیں یہ ہر قسم کا نشہ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چرس، ہیروئن اور یہ نہ ملیں تو ٹیکہ سے کام چلاتے ہیں۔

عام طور پر انسان اپنے وزن کے برابر بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن جب ان جہازوں کو نشے کی طلب ہو اور جسم ٹوٹ رہا ہو تو یہ اپنے سے دگنا وزن بھی اٹھا لیتے ہیں بشرطیکہ ان کو اتنی رقم مل جائے جس سے وہ نشے کی ڈوز لے سکیں۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ طلب شدید ہو تو ہمت اور طاقت دگنی ہو جاتی ہے یہ جہاز اپنی طلب پوری کرنے کے لئے شروع شروع میں اپنے گھروں کا صفایا کرتے ہیں پھر ہمسایوں اور رشتہ داروں، محلے داروں اور علاقے والوں کے گھروں اور دکانوں کا اور پھر جب سب ان سے ہوشیار ہو جاتے ہیں تو سرکار ان کا نشانہ بنتی ہے۔ کتنی ہی نہریں ہیں جو انہوں نے گنجی کر دی ہیں اور کتنی ہی پرانی سرکاری عمارتوں کا میٹریل یہ بیچ کر کھا چکے ہیں۔ گٹروں کے ڈھکنے، ٹونٹیاں، سائیکلیں، ڈش انٹینا کے ریسیور کچھ بھی ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ پولیس بھی ان کو نہیں پکڑتی کہ ان سے ملے گا کیا الٹا ان کو مرنے سے بچانے کے لئے نشہ پلے سے دینا پڑے گا۔

اچھے بھلے انسان جہاز کیسے بن جات ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ کچھ دنیاوی مسائل سے فرار حاصل کرنے کے لئے تو کچھ منہ زور جوانی کا نشہ ڈبل کرنے کے لئے جہاز بنتے ہیں، کچھ کو بری صحبت اس انجام تک

پہنچاتی ہے تو کچھ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے بطور سازش بھی جہاز بنا دیا جاتا ہے۔ کچھ عورتوں کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ ہر صورت میں جہاز بنتے ہی انسان کی عزت، مال، جائیداد اور معاشرتی تعلقات سب ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔ وہ معاشرے پر ہی نہیں گھر والوں پر بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ انسان ہوتے ہوئے وہ لینڈ لارڈ ہر تے ہیں مگر جب سب کچھ نشے میں لٹا کر جہاز بن کر مرتے ہیں تو گھر والے ان کی میت کو بھی قبول نہیں کرتے۔

دنیا میں ہر چیز کے نقصانات کے ساتھ فوائد بھی ہوتے ہیں، ہمارے علاقے سے اچھی قسم کا کینو اور مالٹا بڑے شہروں اور غیر ممالک کو بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے اور مقامی کاشتکاروں کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ مقامی مارکیٹ میں کینو مہنگے داموں بیچنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ یہاں تو لوگ مفت کھانے کے عادی ہیں اس کے نتیجے میں مارکیٹ میں سستا کینو دستیاب نہ ہوتا اگر یہ جہاز نہ ہوتے۔ یہ مردانِ مجاہد سخت سردی میں دھند اور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آدھی رات کو باغوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور صبح ان کو نشہ اور عوام کا سستا کینو دستیاب ہو جاتا ہے اور جہاں کارپوریشن کا سسٹم نہیں وہاں کوئی بھی کسی قیمت پر گٹروں اور نالیوں کی صفائی پر تیار نہیں ہوتا۔ یہاں بھی یہی جہاز کام آتے ہیں اور نہایت کم مزدوری پر زیادہ سے زیادہ صفائی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو سیوریج کے مسائل مزید بڑھ جاتے اس لئے ہم ان کے شکرگزار بھی ہیں۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جہاز تو نہایت بے وقوف ہوتے ہوں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں تو آپ کو ان سے عقل مند آدمی مل ہی نہیں سکتا۔ دوسرے ان کے پاس اکثر اوقات وقت وافر ہی ہوتا ہے اس لئے ان کے لیکچر کبھی مختصر نہیں ہوتے پھر انجکشن لگانے میں یہ ایسی مہارت حاصل کر لیتے ہیں جو ڈاکٹروں کو بھی اکثر نہیں ہوتی۔ جب بار بار انجکشن لگانے کی وجہ سے ان کی بازوؤں کی رگیں ختم ہو جاتی ہیں تو یہ جسم کے نازک حصوں سے ایسی ایسی جگہوں پر رگیں تلاش کر لیتے ہیں جن کا تصور بھی محال ہے اور ان کو وہاں ٹیکہ لگاتے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نشہ پورا کرنے کے لئے یہ خون اور گردے تک بیچ دیتے ہیں۔ عموماً ان کی موت ٹیکے کے ری ایکشن یا سردی اور بھوک کے ایکشن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے سردیوں میں ان کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور گرمیوں میں نئی بھرتی سے پھر بڑھ جاتی ہے۔ نئی بھرتی عموماً مفت کے سوٹے لگوا کر کی جاتی ہے۔ اس لئے کسی امیر کو تاڑا جاتا ہے اور جب تک وہ بھی ان جیسا نہیں ہو جاتا اس کے پلے سے پی جاتی ہے۔

ہم نے لاہور کے ایک معروف پارک میں ایک جہاز کا دلیرانہ حملہ دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ غالباً یہ جہاز نشے سے ٹوٹا ہوا تھا اس لئے اس نے پارک میں کھڑی سائیکل اُڑا لے جانے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے دو پولیس کانسٹیبلوں نے اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ جہاز پولیس والوں کی منت سماجت کرے گا لیکن اس نے جو کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو دھکا دے کر اپنی جیب سے بلیڈ نکالا اور لمحوں میں اپنا بدن جگہ جگہ سے چیر ڈالا۔ اتنا لہو بہتا دیکھ کر پولیس والے بھی گھبرا گئے اور لگے جہاز سے معافیاں مانگنے۔ انہوں نے اسے اپنے پلے سے شربت بھی پلایا۔ آخر بڑی مشکل سے جہاز صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اس نے پولیس والوں کو معاف کر دیا۔ ورنہ تو وہ اگلے مرحلے پر اپنی شہ رگ کاٹنے پر تلا تھا۔ دیکھا آپ نے، یہ جہاز اکثر کریش لینڈنگ بھی کر جاتے ہیں۔

***

رات، مسافر اور نیند

ڈاکٹر مظفر حسین ملک

اے چاند! چھپ نہ جانا، جب تک میں گیت گاؤں
یہ ساز زندگی کا، جی بھر کے میں بجاؤں

اڑتا ہوا یہ پنچھی بھولے سے ادھر آیا
انجان کے اس گھر کو اپنا ہی گھر بنایا

یہ سکھ کی نیند سوئے میں خواب بن کے آؤں
کیسی ادا تھی جس پہ آنکھیں ہوئیں دیوانی

یہ دل و دماغ و دنیا سب بن گئے کہانی
اک راز کا یہ قصہ میں عمر بھر سناؤں

اے سونے والے! جب تک جی چاہے سونا
کل دن کی روشنی میں اس رات کا غم دھونا

تیار ہو سفر کو میں تجھ کو راہ دکھاؤں
اک رات کا یہ قصہ میں عمر بھر سناؤں

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھجوائیں

☆ تبصرہ نگار: صلاح الدین چغتائی

طب نبوی کی روشنی میں
پھولوں، پھلوں اور سبزیوں سے علاج

تالیف : حکیم اصغر علی اعجاز چشتی
صفحات : 416
قیمت : -/400 روپے
ناشر : زاویہ پبلشرز۔ دربار مارکیٹ لاہور
042-37300642

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمام نوع انسانی کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ آپ کی ذات بابرکات تمام عالم کے لئے باعث رہنمائی ہے۔ حیات انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے آپ نے رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ اس معلم کائنات نے ہمیں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور چلنے پھرنے کا سلیقہ سکھایا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ اس پُر آشوب دور میں جہاں ہم نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر دیا ہے، وہاں طب وصحت جیسے اہم شعبے میں بھی مغرب کے مرہون منت ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے

کہ عوام الناس کو طب نبویؐ سے رُوشناس کرایا جائے۔

قدرت نے ہمارے لئے بے شمار اشیاء پیدا کی ہیں۔ ان میں پھل، پھول، سبزیاں اور مختلف جڑی بوٹیاں شامل ہیں اور یہ ہمارے اردگرد عام دستیاب ہیں لیکن ہمیں پوری طرح ان کی غذائی اور دوائی اہمیت سے آگاہی نہیں ہوتی۔ اسی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے محترم حکیم صاحب نے اس کتاب کو تالیف کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں پھولوں، پھلوں اور سبزیوں کی نہ صرف افادیت بیان کی ہے بلکہ ان سے مختلف بیماریوں کے علاج کے طریقے بھی درج کیے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی صحت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کتاب کا گھر میں ہونا نہایت فائدہ مند ہوگا۔ اس کے علاوہ اطباء حضرات بھی اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔

عرفانِ الٰہی

تالیف : حاجی حکیم اصغر علی اعجاز چشتی

صفحات : 256

قیمت : -/250 روپے

ناشر : زاویہ پبلشرز۔ دربار مارکیٹ لاہور

042-37300642

اللہ تعالیٰ نے بے شمار مخلوق پیدا فرمائی مگر انسان کو جو اعزاز دیا وہ کسی اور مخلوق کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ، اپنا نائب مقرر فرما کر تمام مخلوق میں ایک منفرد مقام عطا فرما دیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب عرفان الٰہی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی پہچان کے لئے لکھی ہے لہٰذا اس کتاب کو اس آسان انداز میں پیش کیا جانا چاہیے تھا کہ عام آدمی اس سے استفادہ کر سکتا۔ عبارت کو اس رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ خواص ہی اس کو سمجھ سکیں۔ عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً مؤلف نے صفحہ 148 پر سوائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے رسولوں کو ''رسول'' کی صفت سے محروم کر دیا ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔ صفحہ 161 پر مؤلف کا یہ کہنا کہ روح جسم آدم میں داخل ہوئی اور باہر آ گئی پھر داخل ہوئی اور باہر آ گئی۔ وہ داخل ہوئی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لیکن اپنی مرضی سے باہر آتی رہی۔ یہ بات نہ تو قرآن سے اور نہ ہی حدیث سے ثابت ہے۔

بہرحال اگر مؤلف اگر سمجھانے کے لئے آسان عام فہم عبارت کا چناؤ کرتے تو کئی لوگوں کا بھلا ہوتا۔ خواہ مخواہ عالمانہ اور گنجلک اصطلاحوں سے کام لیتے ہوئے تحریر کو ایسا بنا دیا گیا ہے کہ صرف کوئی عالم فاضل ہی اس کو سمجھ سکے۔ اس طرح محترم مؤلف نے عام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو نظرانداز کر دیا ہے۔

شفا بذریعہ شمسی توانائی
روشنی سے علاج

تالیف : حاجی حکیم اصغر علیؒ چشتی

صفحات : 192

قیمت : -/180 روپے

ناشر : زاویہ پبلشرز۔ دربار مارکیٹ لاہور

042-37300642

سورج کی روشنی اور حرارت خطۂ ارض پر زندگی کی علامت ہے۔ خوش بو اور خوش رنگ پھل پھولوں، نباتات و جمادات، چرند پرند اور انسان، سب کی حیات کا دار و مدار اسی روشنی اور حرارت پر ہے۔ یہ سفید نظر آنے والی، یہ روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے اور ہر رنگ کی اپنی ایک

الگ اہمیت اور اثرات ہیں۔ ہمارے وطن کو قدرت کاملہ نے شمسی توانائی کا یہ خزانہ بڑی فراخ دلی سے وافر مقدار میں عطا کر رکھا ہے۔ ضرورت اس سے فائدہ اٹھانے کی ہے۔ اب توانائی کے حصول کے لئے سورج کو استعمال کیا جارہا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے سورج کی روشنی میں چھپے سات رنگ کی کرنوں سے مختلف بیماریوں کے علاج کا طریقہ بیان کیا ہے۔ اس طرح مہنگائی کے مارے عوام کو سستا اور قدرتی علاج میسر آ جائے گا۔ قوسِ قزح کے رنگوں سے علاج کے لئے رنگین شعاعوں سے پانی کیسے تیار کیا جائے، ان کے ذریعے مختلف قسم کے تیل اور انجکشن کیسے تیار کئے جاسکتے ہیں اور یہ کن امراض میں استعمال ہوسکتے ہیں۔ یہ تفصیل سے اس کتاب میں بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ضروری خوراک اور پرہیز بھی لکھے گئے ہیں۔

یہ نہایت مفید کتاب ہے اور سرسری مطالعہ کی بجائے بغور مطالعہ کی متقاضی ہے تب جاکے اس سے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مؤلف نے عوام الناس کی سہولت کے لئے بڑے عام فہم انداز میں ہر بات بڑی صراحت سے بیان کی ہے۔ یہ کتاب ہر گھر کی ضرورت ہے اور ہر کوئی اس سے استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔

چاروں روحانی سلسلوں کا تعارف

مرتب : ابوحماد محمد عبیداللہ ساجد

صفحات : 160

ملنے کا پتہ: خانقاہ اشرفیہ اختریہ مقیمیہ فاروقہ ضلع سرگودھا

0301, 0335-6750208

تاریخ نگار اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ اس خطۂ ارضی جس کو برصغیر پاک و ہند کہا جاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی کرم رہا ہے کہ اس سرزمین پر کفر کی بیخ کنی کے لئے علماء حق، اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کی آمد اور تشکیل تسلسل کے ساتھ ہوتی رہی اور ہورہی ہے جن کی محنت سے کفر کے قلعوں میں دراڑیں پڑ گئیں اور اسلام کی روشنی پھیلتی گئی۔ جب اسلام پھیلنا شروع ہوا تو لوگوں کی اصلاح کی ضرورت ہوئی کہ تصوف سے ذریعے ان کی باطنی اور روحانی تربیت کی جائے۔ تصوف کے چاروں سلسلوں میں یہ اصلاحی پہلو موجود ہے کہ انسان کی کس طرح تربیت کی جائے کہ وہ اپنی منزل بھی پالے اور اس کا تزکیہ نفس بھی ہوجائے۔

مصنف حضرت ابوحماد قاری محمد عبیداللہ ساجد دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ برکات عطا فرمائیں کہ جس طرح انہوں نے خلوصِ نیت اور محنت سے تصوف کے چاروں سلسلوں کا تعارف کرایا ہے۔ اس سے ان کی اہل اللہ سے دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ کتاب سالکین کے لئے تحفہ سے کم نہیں کہ اس کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی تشنگی کو دور کرسکتی ہے۔

□□□

تاریخی ناول

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مُغلانی بیگم

قسط: 10 رفیق ڈوگر

افغان لشکر نے متھرا کے پاس سے گزر کر سات میل نیچے دریائے جمنا عبور کیا اور گوکل کے نواح میں خیمہ زن ہو گیا۔ متھرا، بندرابن اور گوکل تینوں ہندوؤں کے مقدس مقامات تھے۔ متھرا میں بڑے بڑے مندر اور بت خانے تھے۔ بندرابن میں وشنومت کے ہزاروں بھگت گائے کے گلے چراتے اور بانسری بجایا کرتے تھے۔ گوکل کے سادھ کے گرد جسموں پر راکھ مل کر ناگا سادھو پوجاپاٹ میں مصروف رہتے تھے۔ آگرہ کی طرف بڑھنے والے افغان لشکر کو سورج مل کی فوج نے متھرا کے قریب روکنے کی کوشش کی تو اس لڑائی میں بہت سے جاٹ فوجی مارے گئے اور کمانڈر فرار ہو گیا۔ متھرا کے باسیوں پر تاوان جنگ ڈال کر جہان خان اور نجیب الدولہ آگے چلے گئے تھے۔ بادشاہ نے متھرا کے مذہبی شہر ہونے کی بناء پر اپنے لشکر کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور دریا کے دوسری طرف اتر گئے تا کہ کوئی افغان سپاہی متھرا شہر میں داخل نہ ہو سکے۔

اگلی صبح سراغ رسانوں نے اطلاع دی کہ گوکل کے خفیہ ٹھکانوں سے نکل کر پانچ ہزار راکھ آلود ننگے سادھو افغان لشکرگاہ کی طرف بڑھے آتے ہیں۔ شاہ ولی خان نے ایک سوار دستہ کو ان کی طرف بھیجا۔ ناگا سادھو بھوکے شیروں کی مانند افغانوں پر جھپٹے افغان دستہ بھاری نقصان کے بعد پسپا ہو گیا۔ شاہ ولی خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے افغان فوج کو سادھوؤں کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا۔ سادھو اس بار بھی بڑی جانفشانی سے لڑے مگر افغانوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور دو ہزار برہنہ لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان ناگا سادھوؤں نے افغان فوج کو جتنا جانی نقصان پہنچایا اب تک کسی لڑائی میں اتنے افغان شہید نہیں ہوئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی اس نقصان پر بہت غضبناک ہوا۔ جب ان کی فوج کے ہندو افسروں نے بتایا کہ سادھو بھگت اپنے سادھ پر حملہ کے خدشہ کی وجہ سے مرنے مارنے پر اتر آئے تھے اور گوکل سادھوؤں اور پروہتوں کا مسکن ہے تو شاہ نے گوکل کو امان دینے کا اعلان کر دیا اور فوجیوں کو ناگا سادھوؤں کے تعاقب سے منع کر دیا۔ بادشاہ نے اپنے ذاتی محافظ دستہ کے کمانڈار (نساقچی) کو حکم دیا کہ وہ گوکل کی طرف جانے والے راستوں پر اپنے سپاہی متعین کر دے تا کہ کوئی افغان اور قزلباش شہر کی طرف نہ جائے۔ ابدالی کی طرف سے شہر کے لئے امان کے اعلان پر ناگا سادھو پھر سے جسموں پر راکھ مل کر سادھ کی پوجاپاٹ میں مصروف ہو گئے۔

چیت کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، موسم بہار ختم ہو گیا تھا اور گرمی میں شدت آ گئی تھی۔ ملک سجاول کے ساتھی کیمپ میں اپنے خیموں کے سامنے محفل جمائے راوی کے کناروں پر موسم بہار کو یاد کر رہے تھے جوان کے پیچھے آیا اور گزر گیا ہو گا۔ انہیں گھروں سے آئے کئی ماہ ہو رہے تھے، ایک جوان اٹھا اور اپنے خیمے سے ایک بانسری نکال لایا۔ ”یہ بندرابن میں گائے چرانے والے ایک بھگت کی بانسری ہے، میرا دل چاہتا ہے میں اس میں پھونک ماروں“۔

”گائے چرانے والے بھگتوں سے افغانوں نے بلاوجہ لڑائی کی“۔ ملک قاسم نے اس سے بانسری لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں وہاں ہوتا تو انہیں روک دیتا ہزاروں بھگت جنگل میں بانسری بجاتے ہوں گے تو ستارے بھی جھوم اٹھتے ہوں گے“۔

”تم اپنے بابا کو تو متھرا آنے سے روک نہ سکے افغانوں کو بھگتوں سے لڑنے سے کیسے روک لیتے“۔ اس کے ایک ساتھی نے مسکرا کر کہا۔

”سردار کو مشورہ دیا جا سکتا ہے روکا نہیں جا سکتا“۔ قاسم نے جواب دیا۔ ”پھر معاملہ جہاد کا تھا جہاد سے کسی مسلمان کو روکنا جائز نہیں“۔

''تو افغانوں کے تم سردار تھے جو انہیں روک لیتے، ان کا معاملہ بھی تو جہاد کا ہی تھا''۔ اسی نوجوان نے کہا۔

''تم کبھی راوی کے کنارے کسی گائے چرانے اور بانسری بجانے والے سے لڑے ہو؟ میرا تو دل نہیں چاہتا''۔ قاسم نے اس کے طنز کو ٹالنا چاہا۔

''اگر وہ مجھ سے لڑنا چاہے تو میں کیا کروں گا؟ ناگا سادھو اور افغان لڑنا چاہتے تھے اپنے اپنے مذہب کا معاملہ ہے صرف بانسری بجانے کا جھگڑا تو نہیں تھا جو تم روک لیتے''۔

قاسم لاجواب ہو گیا۔ ''چلو چھوڑو اس جھگڑے کو لو ذرا بانسری میں پھونک مارو، دیکھو بندرابن کی بانسری کیا کہتی ہے''۔

''سردار کا خیمہ کچھ زیادہ دور نہیں اور وہ آپ کی گنا بیگم بھی ابھی جاگ رہی ہوں گی''۔ نوجوان مسلسل اسے تنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سردار کو میں روک لوں گا، موسم بہار دم توڑ رہا ہے، گنا بیگم کی شاعری اب جاگ کر راتیں نہیں گزارتی ہوگی''۔ قاسم سمجھ گیا کہ وہ اسے تنگ کرنا چاہتا ہے۔

''اگر تم بانسری سے بات کرو تو گنا بیگم زیادہ خوش ہوگی''۔ تیسرے نوجوان نے قاسم کو بانسری واپس کر دی۔

''پھر تو مجھے اس کے خیمے میں جا کر بانسری بجانا چاہیے''۔ قاسم نے بانسری کے سوراخوں پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔

''گویا آپ گنا بیگم اور مغلانی بیگم دونوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہیں بیٹھو اور بانسری سے باتیں کرو تا کہ ہم اندازہ کر سکیں کہ عشق کے محاذ پر لڑائی کی شدت کیسی ہے''۔ ایک نوجوان نے کہا۔

باقی سب نے قہقہہ لگایا اس کے سب ساتھی جان چکے تھے کہ گنا بیگم اس میں دلچسپی لینے لگی ہے۔

قاسم نے بانسری لبوں سے لگا کر پھونک ماری تو اس کی انگلیاں سوراخوں پر ناچنے لگیں چند ہی منٹ میں سب جھوم رہے تھے اردگرد کے خیموں سے بیگم کے دستہ کے سوار اور سپاہی سب وہاں جمع ہو گئے۔

ملک سجاول نے اپنے خیمے کا پردہ ہٹا دیا، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی ان میں جا ملے لیکن اس خیال سے کہ سردار کی موجودگی میں وہ بانسری رکھ دیں گے، وہ وہیں لیٹا راوی کے کناروں کی یادوں میں کھو گیا۔

اگلی صبح مغلانی بیگم کے ڈیرے میں ہر طرف بانسری اور بانسری نواز کے سوز کا چرچا تھا۔ خود مغلانی بیگم نے قاسم کو بلا کر داد دی اور اگلی رات اپنے ڈیرہ کے زنانہ میں بانسری بجانے کا حکم دیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حضور ہر صوبیدار اور ریاستی حکمرانوں کے ایلچی اور وکیل ان کی طرف سے اطاعت اور خراج کے حلف نامہ لے کر پیش ہو رہے تھے۔ حکام بنگالہ کے وکیل نے درخواست گزاری کہ اگر بادشاہ معظم اسے سندِ حکمرانی عطا کر دیں تو وہ پانچ کروڑ روپیہ ادا کرے گا اور مرہٹوں کے خلاف جہاد میں شریک ہوگا۔ سورج مل نے نہایت خوشامدانہ خط لکھا۔ ''اس خاکسار کے خلاف فوج کشی حضور کے شایانِ شان نہیں''۔ اس نے پچاس لاکھ روپے خراج ادا کرنے اور دیگر راجوں کے ہمراہ بادشاہ کے حضور حاضر ہونے کی استدعا کی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے سامنے ٹھہرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا لیکن افغانوں کا سب سے بڑا دشمن ہندوستان کا موسم پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتر آیا تھا۔ چیت کے مہینہ کے شروع ہونے کے ساتھ ہی خلاف معمول گرمی پڑنے لگی تھی اور سرد ملک کے باسی افغان فوجی اپنے بادشاہ سے جلد گھر واپسی کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔

گوکل سے اوپر بندرابن اور متھرا کی طرف سے بہت سی لاشیں دریائے جمنا میں بہا دی گئی تھیں۔ دریا میں پانی کی کمی، لاشوں کی زیادتی اور سورج کی گرمی سے یہ لاشیں پھول گئیں تو ان میں بدبو اور کیڑے پیدا ہو گئے اور جمنا کا پورا پانی گندا ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ہزاروں انسانوں اور ان کے گھوڑوں کی پانی کی ضروریات جمنا کے پانی سے پوری کی جاتی تھیں، پانی گندا ہوا تو پہلے لشکر کے گھوڑوں میں بیماری پھیلی پھر فوج میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ سینکڑوں کی تعداد میں گھوڑے اور فوجی ہر روز مرنے لگے۔ بادشاہ کے لئے اس دشمن کا حملہ غیر متوقع تھا، اپنے ملک میں انہیں کبھی اس سے مقابلہ درپیش نہیں ہوا تھا۔ لشکر کے حکیم اور طبیب املی کے پانی سے مریضوں کا علاج کرنے لگے مگر گوکل میں اتنے بڑے لشکر کے لئے اتنی زیادہ املی بھی میسر نہیں آ رہی تھی۔

بادشاہ کے لشکر میں زیادہ بے قاعدہ افغان فوج تھی، مختلف قبائلی سردار اپنے اپنے قبیلہ کے لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے شاہ کی فوج کے ساتھ شامل ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ اس اچانک حملہ سے تنگ آ کر وہ واپس وطن لوٹنے کا فیصلہ کرنے پر زور دے رہے تھے۔ چند روز تک بادشاہ حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا لیکن قبائلی سرداروں کی مجلس نے واپسی کے فیصلہ پر زور دیا تو انہیں مجبوراً ان سے اتفاق کرنا پڑا۔ جہان خان اور نجیب الدولہ کو آگرہ سے فوراً واپس لوٹ آنے کا حکم بھیج کر احمد شاہ ابدالی نے شہنشاہ ہندوستان عالم گیر ثانی کو پیغام بھیجا کہ وہ جاٹوں اور مرہٹوں کے خلاف مہم ادھوری چھوڑ کر واپس آ رہے ہیں۔

چیت کا دوسرا ہفتہ ختم ہو رہا تھا جب بادشاہ اور اس کا لشکر شاہجہان آباد کے نواح میں واپس پہنچ گئے۔

***

ملک قاسم نے بندرابن کے جوگی چرواہے کی بانسری میں پھونک ماری تو گنا بیگم نے خیمے کا پردہ ہٹا دیا۔ رات کا جوبن ڈھل چکا تھا مگر وہ اب بھی جاگ رہی تھی۔ کنیز نے جب شب بخیر کی دعا کے بعد خیمے کا پردہ گرایا تو اس نے اپنی کتاب حیات کی ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ کہیں سے ایک سطر پڑھی، کہیں ایک دو پیرے دیکھے، کہیں دو چار ورق الٹ کر آگے نکل گئی، کبھی پھر سے کسی پہلے صفحہ پر واپس آ گئی۔ ایک تسلسل سے اس کتاب کو پڑھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ورق گردانی کے دوران وہ کئی بار روئی، کئی بار آنسو پونچھے اور کئی بار مسکرائی تھی۔ قافلہ شاہجہان آباد سے باہر نکلا تو اس نے گردن گھما کر مسجدوں کے اونچے میناروں کے سایہ میں اس شہر کو آخری بار دیکھنے کی کوشش کی تھی جو اس کی آزادی اور حکمرانی کا مزار تھا۔

پھر اس نے اس مزار اور یادوں پر آنسوؤں کے چند پھول چڑھائے اور جلدی سے آنکھیں پونچھ لی تھیں۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ قافلہ نے پہلا پڑاؤ کہاں کیا ہے اور شاہجہان آباد کتنا پیچھے رہ گیا ہے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرتے ہی وہ اپنے والد کی حویلی میں پہنچ گئی تھی۔ بچپن کے معصوم کھیلوں میں خادمائیں اس کے چاروں طرف کھڑی تھیں، سب اسے کھیلتا دیکھ رہی تھیں۔ اسے کھیل میں خوش رکھنا ان سب کی خوشی تھی۔

پھر اس نے دیکھا کہ مغلیہ سلطنت کا مختار کل وزیر اعظم عماد الملک بھرت پور کا خودسر شہزادہ جواہر سنگھ اور اودھ کا طاقتور حکمران شجاع الدولہ سب اس کی ایک نگاہِ التفات کے پیاسے ہیں۔ اس کے حُسن جوانی، علم، شاعری اور سلیقہ کا ہر دار الحکومت میں چرچا ہے۔ ہوائیں اسے سلام کر کے گزرتی ہیں۔ چاند ستارے اس کی ایک جھلک دیکھنے کو رستہ بدل لیتے ہیں۔ اس نے ورق پلٹ دیا سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم کی خوشنودی کے طالب

امراء اور وزراء اور صوبائی حاکم اس کی خوشنودی کے لئے جھکے جاتے ہیں اور شاعر اس کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر انعام پاتے ہیں اور آج شب وہ عمر بھر کی غلامی کے سفر کی ایک منزل پوری کر چکی ہے۔ مقدر کے کھیل میں سیڑھی کے سب سے بلند زینے پر پہنچ کر وہ اچانک ذلت اور رسوائی کے سب سے عمیق گڑھے میں جا گری ہے۔ اس نے کیا جرم کیا تھا جس کی اسے اتنی بڑی سزا ملی ہے۔ وہ کتاب بند کر کے سوچنے لگتی اور جب کچھ سمجھ نہ آتا تو پھر ورق گردانی شروع کر دیتی اس گڑھے سے باہر آنے کے لئے بھی کوئی زینہ ہے؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے کان میں بانسری کی آواز پڑی۔ گوکل کے نواح اور شاہجہان آباد واپسی کے سفر میں اس نے کئی بار یہ آواز سنی تھی مگر بانسری کی آواز میں جو سرور آج تھا وہ پہلے کبھی نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا درد و سوز بانسری کے سُروں میں سما گیا ہے۔

قافلہ شاہجہان آباد سے لاہور کے لئے روانہ ہوا تو مغلانی بیگم بھی قافلہ کے ساتھ تھی۔ جب مغلانی بیگم زیر حراست قیدی کی حیثیت میں شاہجہان آباد میں داخل ہوئی تھی تو اس وقت قافلہ گنا بیگم کا تھا۔ حکم اس کا تھا، خادم اور کنیزیں اس کے تھے، سوار اور پہریدار اس کے تھے، آج قافلہ مغلانی بیگم کا تھا، حکم اس کا، سردار اس کے، کنیزیں اور خادم اس کے تھے اور گنا بیگم اس کی ایک کنیز تھی اور شاہجہان آباد سے لاہور جا رہی تھی۔ جہاں سے مغلانی بیگم قید ہو کر آئی تھی اس نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے آگے چل کر کیا ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچ سے نجات حاصل کرنے کے لئے خیمے کا پردہ پوری طرح ہٹا دیا اسے محسوس ہوا فلک سے زمین تک پھیلا اندھیرا اس کا مقدر ہے، اس اندھیرے میں بندرابن کے جوگی کی بانسری کی لے میں اس کائنات کا درد سما گیا ہے۔

مغلانی بیگم کی صاحبزادی وقار بیگم بھی اس کی ہم سفر تھی، اس کا تو آزادی کا سفر تھا۔ قید سے گھر کا سفر شریک سفر خدام کنیزیں ملازم سب لاہور جا رہے تھے، اپنے گھروں کی طرف۔ بیگم کچھ فاصلہ قافلہ کے ساتھ رہی اور پھر بادشاہ معظم کی لشکرگاہ کی طرف چلی گئی تھی۔ قافلہ لاہور پہنچانے کا فرض ملک قاسم کو سونپ دیا گیا تھا جو اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی خوشی منا رہے تھے، گھر جانے کی خوشی۔

قاسم اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھا بانسری بجاتا رہا اور وہ بستر میں آنکھیں بند کئے سنتی رہی، اپنی کتاب حیات کی ورق گردانی بھول گئی۔

احمد شاہ ابدالی کی لشکرگاہ میں مغلانی بیگم بھی ابھی تک اپنے خیمے میں جاگ رہی تھی۔ سرِ شام عمادالملک نے اس کے حضور حاضری دی تھی۔ اس کے بعد افغان وزیراعظم شاہ ولی خان بھی آئے تھے۔ اس صبح بادشاہ معظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر حاضری کے لئے گئے تھے، جہاں انہوں نے نذرانہ پیش کر کے چادر چڑھائی تھی۔

''حضور کے ارشاد کے مطابق ہم نے عمادالملک کو معاف کر دیا اور شہنشاہ ہند کی درخواست کے باوجود اسے سزا نہیں دی''۔ بادشاہ معظم نے درگاہ کے سجادہ نشین سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تو شاہ ولی خان اور ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''نواب قمرالدین مرحوم کی بیوہ شولا پوری بیگم خواجہ کی عقیدت مند ہیں نواب مرحوم بھی زندگی بھر خواجہ کے حضور حاضری دیتے رہے، ہم بیگم صاحبہ کی درخواست پر حضور سے سفارش کرنے پر مجبور تھے۔'' سجادہ نشین نے سفارشی عریضہ لکھنے کی وضاحت کی۔

''مابدولت حضور کا حکم ٹال نہ سکے ورنہ عمادالملک کے گناہ اتنے تھے کہ اسے کئی بار سزا دی جاتی تو بھی کم

تھی۔'' ابدالی نے کہا تھا۔

''خواجہ حضور مجرموں کو معاف کرنے اور اصلاح کا موقعہ دینے پر زور دیتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ عماد الملک اپنی اصلاح کر کے ہماری سفارش کی لاج رکھے گا۔'' سجادہ نشین نے جواب دیا تھا۔

مغلانی بیگم جانتی تھی نہ شاہ ولی خاں کو علم تھا کہ جس عریضہ کو پڑھ کر بادشاہ معظم نے عماد الملک کی جان بخشی کی تھی اور رہائی کا حکم دیا تھا، وہ کس کی طرف سے تھا۔ نواب شولا پوری بیگم نے سربمہر عریضہ سرفراز خان کے ہاتھ بھیجا تھا جو اس نے شاہ ولی خاں کے ذریعہ سے بادشاہ معظم کو پیش کر دیا تھا۔ اس عریضہ کے اثرات پر عماد الملک سمیت سب حیران تھے اور اب تک یہی سمجھتے تھے کہ وہ عریضہ نواب شولا پوری بیگم کی طرف سے تھا اور بادشاہ معظم نے ان کی شرافت اور بزرگی کا لحاظ کر کے عماد الملک کو معاف کر کے رہا کر دیا تھا لیکن یہ معلوم کر کے کہ وہ عریضہ درگاہ حضرت بختیار کاکی کے سجادہ نشین کی طرف سے تھا اور سجادہ نشین شولا پوری بیگم کا اس قدر احترام کرتے ہیں، سب کو حیرانی ہوگی، وہ سوچنے لگی کہ اگر نواب شولا پوری بیگم اپنے بیٹے انتظام الدولہ کو وزارت عظمیٰ پر بحال رکھنے کے بارے میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے سجادہ نشین سے سفارشی عریضہ لانے میں کامیاب ہو گئیں تو عماد الملک کو پھر سے وزیر اعظم بنوانے کا ان کا پروگرام مشکل ہو جائے گا۔ شاہ ولی خاں کے جانے کے بعد بیگم نے سرفراز خان کو بلایا۔

''گھوڑے اور سوار تیار رکھیں ہم ایک اہم مراسلہ وزیر اعظم خان خاناں کی والدہ محترمہ کو پہنچانا چاہتے ہیں، طلوع آفتاب سے پہلے مراسلہ انہیں مل جانا چاہئے''۔

''حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی''۔ سرفراز خان نے سر جھکا دیا۔

بیگم تکیہ سے ٹیک لگا کر شمعدان کے قریب ہو گئی کنیز نے سنہری قلمدان کھول کر پاس رکھ دیا۔ بیگم نے قلم اٹھا کر دیکھا اور لکھنا شروع کر دیا۔ القاب و آداب کے بعد اس نے لکھا۔ ''حضور کو یہ جان کر لازماً دکھ ہوگا کہ اپنے جس فرزند کی زندگی بچانے کے لئے حضور نے سجادہ نشین حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے بادشاہ معظم کے لئے عریضہ حاصل کیا اور اسے معافی دلوائی تھی۔ حضرت کے لخت جگر اور ہمارے بھائی محترم وزیر اعظم سلطنت ہندوستان نواب خان خاناں انتظام الدولہ نے اسے قتل کرانے کے لے بادشاہ معظم تک ایک عریضہ پہنچایا ہے۔ تب حضور کو یہ دکھ ہوا تھا کہ خون پر خون کے قتل کا الزام آئے گا، ہم خود اس عریضہ سے آگاہ ہیں۔ بھرت پور کے جاٹ حکمران سورج مل کی طرف سے یہ عریضہ خان خاناں کے توسط سے بادشاہ معظم کے حضور پہنچا ہے۔ جب تک ہم نے تصدیق نہ کر لی ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ نواب انتظام الدولہ جن کی عزت کے تحفظ کے لئے عماد الملک نے بادشاہ معظم سے درخواست کی تھی اور انہیں شکنجے پر چڑھانے سے بچایا تھا۔ وہی خان خاناں عماد الملک کو قتل کرانے کی درخواست میں فریق ہو سکتے ہیں۔ عماد الملک نے خاندان کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے جو کچھ کیا اور حضور کی اس خادمہ نے جو کوششیں کیں وہ حضور سے مخفی نہیں۔ بادشاہ معظم نے ہماری درخواست کے بغیر ہی سورج مل کا عریضہ حقارت سے مسترد کر دیا۔ ہم صرف حضور کی اطلاع کے لئے یہ عریضہ لکھ رہے ہیں تاکہ حضور خاندان میں فساد کا تدارک کر سکیں۔ ہم نے بادشاہ معظم سے درخواست کی ہے کہ وہ عماد الملک کو قندھار بلوا لیں اور سلطنت ہند کے بارے میں اس کے تجربہ اور علم سے فائدہ اٹھائیں۔ بادشاہ معظم نے اپنے وزیر اعظم شاہ ولی خاں اور شہزادہ تیمور شاہ سے مشورہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضور ہماری اس کوشش کو اصلاح کے حوالہ سے دیکھیں

گے''۔ مغلانی بیگم نے مہر لگا کر مراسلہ بند کیا اور مسکرائی، نواب شولا پوری بیگم کے ذریعہ ایک طرف اس نے خان خاناں کو خبردار کر دیا کہ وہ اور عماد الملک ان کے ذریعے سے ملنے والے سورج مل کے عریضہ کے مندرجات سے آگاہ ہیں اور دوسری طرف اس نے عماد الملک کو قندھار لے جانے کی درخواست کی خبر کے ذریعے انہیں یقین دلایا کہ عماد الملک کے پھر سے وزیر اعظم ہندوستان بنائے جانے کا کوئی امکان نہیں اسے یقین تھا کہ اس مراسلہ اور اطلاع کے بعد خان خاناں مطمئن ہو جائے گا اور نواب شولا پوری بیگم اس کے کسی منصوبہ میں شامل نہیں ہوگی۔

***

ہندوستان کا موسم اور بھی گرم ہو گیا تھا اور افغان جلد از جلد واپس افغانستان جانا چاہتے تھے۔ انہیں گھروں سے نکلے چھ ماہ سے زیادہ ہو رہے تھے مگر احمد شاہ ابدالی ابھی تک ہندوستان کے معاملات سے مطمئن نہیں تھے۔ شاہجہان آباد کے علماء اور امراء نے جس مقصد کے لئے انہیں بلایا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ شاہجہان آباد کے امراء اور درباریوں کے رویہ سے سخت مایوس تھے جنہیں کفر کے طوفان کا کوئی احساس نہ تھا اور سب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ علماء کے ایک بڑے طبقہ کی اب بھی خواہش تھی کہ بادشاہ معظم مغل شہنشاہ کو تخت سے اتار کر خود شہنشاہ ہندوستان و افغانستان بن جائیں۔ شاہجہان آباد میں قیام فرمائیں اور مرہٹہ اور جاٹ طوفان کو روکنے کے لئے جہاد جاری رکھیں مگر بادشاہ ہندوستان پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مفتی ہند نے بادشاہ معظم کو علماء کی اس خواہش سے آگاہ کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ ''ہم مسلمانان ہندوستان کو کفر کے غلبہ سے بچانے آئے تھے، یہاں قیام کی ہماری کبھی خواہش نہ تھی''۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر حاضری سے واپس آتے ہی بادشاہ معظم نے واپسی کے سفر کا سامان باندھنے کا حکم دے دیا اور شاہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی کو اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ دوسرے روز شہنشاہ اپنے بیٹوں اور وزراء کے ہمراہ بادشاہ معظم سے الوداعی ملاقات کے لئے ان کی لشکرگاہ میں تشریف لائے۔ بادشاہ نے شہزادہ تیمور شاہ کو حکم دیا کہ وہ لشکرگاہ سے نکل کر اپنے سسر کا استقبال کریں۔ وزیر اعظم شاہ ولی خان اور افغان افواج کے کمانڈر جہان خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔

افغان لشکرگاہ میں شہنشاہ ہندوستان کا شاندار استقبال کیا گیا، بادشاہ معظم نے شاہی خیمہ گاہ کے دروازے پر انہیں خوش آمدید کہا۔ خیمہ شاہی میں بادشاہ معظم اور شہنشاہ کے درمیان بات چیت میں افغان سردار اور امراء بھی شریک ہوئے۔ ''مابدولت کی خواہش ہے کہ حضور نے متھرا اور گوکل سے جن فوجیوں اور غیر فوجیوں کو جنگی قیدی بنایا ہے ان پر رحم فرمایا جائے اور انہیں رہا کرنے کا حکم صادر فرمایا جاوے''۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی نے احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی۔

بادشاہ نے فوری طور پر سب جنگی قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

عالمگیر ثانی نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔

''مابدولت کی خواہش ہے کہ حضور خان خاناں انتظام الدولہ کو وزارت عظمیٰ کے منصب سے الگ کر دیں اور عماد الملک کو پھر سے وزیر اعظم کے منصب پر بحال کر دیں۔'' احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کے مزید کوئی خواہش ظاہر کرنے سے پہلے اپنی خواہش ان کے سامنے رکھ دی۔

عالمگیر ثانی کے لئے یہ حکم تھا جس کا ماننا ان پر واجب تھا، انہوں نے بظاہر خوشی سے بادشاہ معظم کی خواہش کے احترام میں وہیں انتظام الدولہ کو وزارت عظمیٰ

سے الگ کر کے عمادالملک کو وزیراعظم بنانے کا اعلان کر دیا۔

بادشاہ نے اپنی طرف سے عمادالملک کو خلعت عطا کرنے کا حکم دے دیا۔

عمادالملک نے خلعت وصول کر کے بادشاہ کا اس کرم کے لئے شکریہ ادا کیا اور شہنشاہ سے وفاداری کا عہد کیا۔

''شہنشاہ ہندوستان کا کرم ہے کہ انہوں نے تمہاری خطائیں معاف کر دیں۔ مابدولت امید رکھتے ہیں کہ تمام شہنشاہ عالی جاہ کے ہمیشہ شکرگزار اور ممنون رہو گے اور ماضی کی غلطیاں دہرا کر ہماری ناراضگی کے اسباب پیدا نہیں کرو گے''۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

عمادالملک نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے بادشاہ معظم کے حکم پر عمل کرنے اور شہنشاہ ہندوستان سے امور سلطنت میں رہنمائی حاصل کرتے رہنے کا یقین دلایا۔

امراء اور وزراء نے عمادالملک کو مبارکباد دی۔

مغلانی بیگم نے ایک بار پھر شہنشاہ ہندوستان کو نیچا دکھا دیا تھا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی صرف شہنشاہ ہی نہیں تھے، بادشاہ معظم کے فرزند عزیز کے سسر بھی تھے۔ عالمگیر ثانی کے ساتھی شہزادے وزراء اور امراء اس فیصلے پر بہت پریشان ہوئے۔ وہ مغلانی بیگم پر بادشاہ معظم کی نوازشات پر حیران رہ گئے۔ بادشاہ معظم نے اپنے ہی مقرر کردہ وزیراعظم ہندوستان انتظام الدولہ کو الگ کروا کر بیگم کے اسی داماد کو پھر سے وزیراعظم بنوا دیا تھا جس نے پنجاب پر قبضہ کر کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی اور جسے شہنشاہ عالمگیر ثانی امراء وزراء اور علماء کوئی بھی اس منصب پر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو شاہجہان آباد کے دربار میں اپنا نمائندہ مقرر کر کے شہنشاہ ہندوستان سے کہا کہ اگر انہیں عمادالملک کے بارے میں کسی قسم کی شکایت ہو تو وہ نجیب الدولہ کو اس سے آگاہ فرما دیں۔ نجیب الدولہ کو اصل میں عمادالملک پر بادشاہ کی طرف سے نگران مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے مرہٹہ اور جاٹ سب نجیب الدولہ کے جانی دشمن تھے اور عمادالملک کے حامی تھے۔ نجیب الدولہ مستقبل کے خطرات اور جاٹ اور مرہٹہ حکمرانوں کے ارادوں کا گہرا شعور رکھتا تھا اور عمادالملک کی مخالفت کرتا رہا تھا۔ بادشاہ معظم کو اس پر بہت زیادہ اعتماد تھا، وہ اس کی قدر کرتے تھے اور میدان جہاد میں اس کے مشوروں پر عمل کرتے رہے تھے مگر میدان سیاست میں مغلانی بیگم نے ان سے بھی بازی جیت لی تھی، ابدالی کو اس کا احساس تھا۔

اگلے روز احمد شاہ ابدالی لاہور کے لئے چلے تو نجیب الدولہ اور عمادالملک سونی پت تک شاہی لشکر کے ساتھ رہے۔

شاہجہان آباد سے باہر وزیرآباد کے میدان میں ابھی تک فوجی خیمے نصب تھے، یہ نجیب الدولہ اور روہیلہ سرداروں کی فوج کے خیمے تھے۔ سونی پت سے عمادالملک اور نجیب الدولہ اپنے اپنے دستوں کے ساتھ واپس لوٹے تو عمادالملک سیدھے شاہجہان آباد چلے گئے اور نجیب الدولہ اپنی فوج اور روہیلہ ساتھیوں میں واپس آ گئے۔ عمادالملک کو پھر سے وزیراعظم اور نجیب الدولہ کو افغان بادشاہ کا خصوصی نمائندہ مقرر کرنے کی خبر ہر جگہ پہنچ چکی تھی۔ نجیب الدولہ کے ساتھی روہیلہ سردار عمادالملک کے تقرر پر افسردہ تھے۔ نجیب الدولہ کے خیمے میں جمع وہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔

''شہنشاہ ہندوستان بھی وہی وزیراعظم بھی وہی بھرت پور میں وہی سورج مل اور جنوب میں پہلے والے مرہٹہ سرداروں کی حکومت بادشاہ قندھار کے جہاد کا مسلمانان ہند کو کیا فائدہ پہنچا''۔ ایک سردار نے نجیب

الدولہ سے پوچھا۔

''سردار! آپ نے کوشش کی ہم بھی جب تک جان ہے مسلمانوں کے تحفظ کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن اگر ہم نہ رہے تو اپنی نسل کو بتا دینا کہ ہم نے ایک خاتون سے شکست کھائی تھی۔ خدا نہ کرے ہندوستان کی مغلیہ سلطنت برباد ہوئی تو اس کی ذمہ دار مغلانی بیگم ہو گی''۔ نجیب الدولہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔

***

ان کے گھوڑے پسینے میں شرابور تھے، لگامیں کھینچتے ہی وہ سواریوں سے کود گئے۔ خدام نے آگے بڑھ کر لگامیں تھام لیں اور گھوڑوں کو اصطبل کی طرف لے چلے۔

''بیگم حضور کو اطلاع دو''۔ سرفراز خان اپنے کمرے کی طرف نہیں گئے۔

خادم بھاگتا ہوا گیا اور اسی رفتار سے واپس آ گیا۔

''بیگم حضور منتظر ہیں'۔

سرفراز خان نے ملک سجاول کی طرف دیکھا۔

''قاسم ہمارے ساتھ رہے گا''۔

ملک سجاول خاموش رہا۔

وہ تینوں بیگم کے دیوان خانہ کی طرف چل دیئے کسی نے کوئی لفظ نہیں کہا۔

دروازے پر میاں خوش فہم نے انہیں جھک کر سلام کیا اور پردہ ہٹا دیا۔

مغلانی بیگم گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، انہوں نے جھک کر سلام کیا۔

بیگم نے بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا۔''ہم آپ کو دیکھ کر خوش ہیں مگر آپ کے چہرے بتا رہے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی خوشی کی خبر نہیں''۔ اس نے خادمہ کو مشروب لانے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے چہروں پر نقاب نہیں پہن سکتے''۔ ملک سجاول نے بیگم کے دائیں نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم خوش ہیں کہ اس آزمائش میں آپ ہمارے ساتھ ہیں''۔ اس نے ملک سجاول کو مخاطب کیا۔''اور ہمارے دکھ پر دکھی ہیں، ہم نے زندگی میں بہت آزمائشیں دیکھی ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ آزمائش سب سے کڑی ہو گی''۔

''خدا حضور کو دشمنوں کو چالوں سے محفوظ رکھے''۔

ملک سجاول کے بجائے سرفراز خان نے جواب دیا۔

''پہلے جب بھی ہم پر آزمائش آئی احمد شاہ ابدالی نے ہمارے دکھ کو اپنا دکھ جانا لیکن اس بار وہ بھی ہمارے دکھ کو اپنی کامیابی سمجھیں گے''۔ بیگم سنجیدہ تھی۔''شہنشاہ اور امراء شاہجہان آباد نے ہمارے خلاف سازش میں نجیب الدولہ کو بھی شامل کر لیا اس لئے ہمیں عماد الملک سے بھی کوئی امید نہیں لگانا ہو گی''۔

''ہم نے محسوس کیا ہے کہ شاہ ولی خان اس فیصلے پر خوش نہیں''۔ ملک سجاول نے رائے دی۔

''ہم جانتے ہیں شاہ ولی خان اس فیصلے پر خوش نہیں ہو سکتا جہان خان اس سازش میں شامل ہے اور جہان خان ہمیشہ سے شاہ ولی خان کے لئے دل بغض آلود رکھتا ہے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''بادشاہ معظم نے شاہ ولی خان سے حضور کو مراسلہ لکھنے کا حکم دیا ہے چند روز میں ان کا ایلچی بھی پہنچنے والا ہے''۔ سرفراز خان نے بتایا۔

''شاہ ولی خان بادشاہ کا فیصلہ قبول کرنے کے بارے میں ہی مراسلہ بھیجے گا اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ۔۔۔ کا ایلچی پہنچنے سے پہلے ہم لاہور سے رخصت ہو جائیں''۔

''ہم لاہور سے رخصت ہو جائیں''۔ سن کر سرفراز خان اور ملک سجاول نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں۔''کہاں کے لئے رخصت ہونا ہے،

شاہجہان آباد سے واپسی پر انہیں اٹک جانا پڑا تھا، اب کہاں جانا ہوگا''۔ انہوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

''ہم خود بادشاہ معظم سے درخواست کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ہمیں قندھار جانا ہوگا''۔ بیگم نے سرفراز خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم امید کرتے ہیں کہ ہم بادشاہ معظم کو یہ فیصلہ بدلنے پر آمادہ کرلیں گے''۔

سرفراز خان نے سر تسلیم خم کردیا۔

''شاہجہان آباد سے واپسی پر بھی آپ مسلسل سفر میں رہے، ہمیں آپ کی تکلیف کا احساس ہے مگر آپ کا ساتھ ہونا لازم ہے''۔ بیگم نے ملک سجاول کو مخاطب کیا۔

''قاسم کی کمی تو محسوس ہوگی مگر حویلی اور لاہور کے معاملات کے لئے اس کا یہاں رہنا لازم ہے''۔

ملک سجاول کی خاموشی ان کی رضا سمجھی گئی۔

''ہم پرسوں صبح یہاں سے روانہ ہوں گے ہمیں امید ہے کہ آپ اس وقت تک ملک پور کے معاملات نپٹا کر واپس آجائیں گے''۔

''یقیناً''۔ ملک سجاول نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔

''ہم نے آپ کے لئے گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کے گھوڑوں کو آرام کی ضرورت ہے، انہیں یہیں چھوڑ دیں''۔

''شکریہ!'' ملک سجاول نے روانگی کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔

''قاسم کے جواب کے ہم ابھی منتظر ہیں''۔ بیگم نے قاسم کی طرف دیکھا۔ ''ہم چاہتے ہیں ہماری واپسی تک آپ حویلی کے کوتوال بننا قبول کرلیں''۔

''حضور کی خواہش ان کے لئے حکم ہے''۔ قاسم کی بجائے ملک سجاول نے جواب دیا۔ ''حضور! اسے بندرابن کے جوگی کی بانسری ساتھ لانے کی اجازت دے دیں''۔ وہ مسکرایا۔

بیگم اور سرفراز خان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی، ماحول جو کافی سنجیدہ تھا خوشگوار ہونے لگا۔

''ہماری خواہش ہے کہ تم بندرابن کے جوگی کی بانسری کے علاوہ اپنی راوی والی بانسری بھی لے آؤ۔ ہماری بیٹیاں گنا بیگم اور وقار بیگم بانسری سن کر اداس نہیں ہوں گی+۔ شاہجہان آباد سے لاہور کے سفر میں قاسم نے تو انہیں جادو کردیا ہے''۔ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے امید ہے کہ ایک ڈیڑھ دن میں قاسم اپنی بانسریوں کو نئے موتیوں سے سجا لے گا''۔ ملک سجاول نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

قاسم نے سر جھکا دیا۔

''ہمیں امید ہے کہ قاسم نے بادشاہ معظم کی عطاء کردہ تسبیح کے موتی بانسری کی لڑیوں میں نہیں پرو دیئے ہوں گے۔ اس کے لئے ہم سچے موتی منگوا رکھیں گے''۔ بیگم نے معنی خیز نظروں سے قاسم کی طرف دیکھا۔

آداب کی رسم ادا کر کے وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

***

شہزادہ تیمور شاہ پنجاب کے حالات سے پریشان تھا، احمد شاہ ابدالی نے افغانستان واپسی سے پہلے اپنے ہندوستانی مقبوضات اس کے سپرد کر کے ہدایت کی تھی کہ وہ جلد از جلد نظم مملکت بحال کرے۔ بادشاہ اپنی فوجوں کے کماندار جہان خان کو بھی شہزادے کا نائب اور سپہ سالار مقرر کر کے لاہور چھوڑ گئے تھے ان کی کوششوں کے باوجود سکھوں کی سرکشی بڑھتی جارہی تھی۔ جہان خان کے پاس صرف پندرہ ہزار فوج تھی جبکہ سکھ جب چاہتے تیس چالیس ہزار کے جتھے جمع کرلیتے تھے اور مختلف علاقوں میں ان کے بہت سے جتھے وار الگ الگ کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ تیمور شاہ اور جہان خاں دونوں

پنجاب اور ہندوستان کے حالات سے واقف نہ تھے۔ ان کے پاس روپیہ اور پنجاب کے حالات سے آگاہ مشیروں کی بھی کمی تھی۔ تیمور شاہ نے خواجہ عبیداللہ اور خواجہ مرزا خان کو فوجی عہدے دے کر اپنے ذاتی مشیروں میں شامل کر لیا۔ خواجہ مرزا خان جہان خان کو پسند نہیں کرتا تھا جو اسے گرفتار کر کے قندھار لے گیا تھا۔ جہان خان خواجہ مرزا خان کی سازشی فطرت اور پنجاب پر حکمرانی کی خواہش سے واقف تھا اور اس پر اہم معاملات میں اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سید رحیم خاں نے اس کشیدگی سے فائدہ اٹھایا۔ پنجاب کے حالات کا علم اور سید بھکاری خان جیسے منتظم اور کمانڈار سے قریبی تعلق اس کا سرمایہ تھے۔ لوگ اگرچہ بھکاری خان کو بھول چکے تھے لیکن حکمران طبقے اور امراء میں ان کی صلاحیتوں کی یادیں ابھی باقی تھیں۔ تیمور شاہ کے لاہور آتے ہی سید رحیم خان بھی لاہور آ گیا تھا اور بارود خانہ کے قریب مکان حاصل کر کے اپنا حلقہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اب بھی آدینہ بیگ کی ملازمت میں تھا جس نے اسے دربار لاہور سے خبریں حاصل کرنے کو بھیجا تھا۔ اس کا ذکر تیمور شاہ کے دربار تک پہنچا تو اس نے اسے بھی اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔ اس طرح آدینہ بیگ کا مخبر حاکم پنجاب شہزادہ تیمور شاہ کا معتمد مشیر بن گیا جسے اب تک یاد تھا کہ کس طرح مغلانی بیگم کے حکم پر کنیزوں نے سید بھکاری خان کو جوتے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا اور بیگم نے اس کی لاش نخاس میں پھنکوا دی تھی وہ مغلانی بیگم سے بھکاری خاں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مغلانی بیگم کی قندھار کے لئے روانگی کی خبر ملتے ہی وہ قلعہ پہنچ گیا اور تیمور شاہ کو بیگم کے بیگم کوٹ سے فرار کی خبر دی۔

تیمور شاہ نے جہان خان کو بلوایا۔ ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بیگم صاحبہ لاہور سے فرار ہو گئی ہیں''۔ اسے خدشہ تھا کہ بیگم شوالک کی پہاڑیوں میں آدینہ بیگ سے نہ جا ملی۔

''حضور کی اجازت ہو تو ہم تیز رفتار سوار دستے بھیج کر بیگم کو گرفتار کر کے واپس لا سکتے ہیں''۔ جہان خان نے اجازت چاہی۔

''ہم نے پہلے یہ غلطی کی کہ بیگم پر نگران مقرر نہ کئے اب ہم اسے گرفتار کرنے کی غلطی کے حق میں نہیں، اس سے بادشاہ معظم کے غضب کا سامنا کرنا پڑے گا''۔ تیمور شاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''آدینہ بیگ نے ابھی تک حضور کی اطاعت کا اعلان نہیں کیا۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے دوآبہ اور کشمیر کی حاکمیت کی سند وصول کرنے کے بعد سے وہ مائل سرکشی ہے۔ حضور اور دین کے باغی سے بیگم کا تعاون بادشاہ معظم ہرگز پسند نہیں فرماویں گے''۔ سید رحیم خاں نے رائے دی۔

''ہم آدینہ بیگ کو اطاعت پر مجبور کر دیں گے، اس نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا اور دربار لاہور میں حاضر ہو کر اطاعت کا اعلان نہ کیا تو ہماری فوج دوآبہ جالندھر اور آدینہ بیگ کی فوج کو نابود کر دے گی''۔ تیمور شاہ نے جواب دیا۔

''وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مغلانی بیگم کے آدینہ بیگ سے مل جانے سے وہ خوفزدہ نہیں۔

''آدینہ بیگ نے وزیراعظم ہندوستان سے مل کر بادشاہ کابل وقندھار کے خلاف بغاوت کی، ان کے صوبہ پنجاب پر قبضہ کیا اور جب بادشاہ معظم مرہٹوں اور جاٹوں کے خلاف جہاد کے لئے آئے تو ان کے حکم کے باوجود ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا بلکہ باغیانہ روش اختیار کی جو اب تک جاری ہے۔ پنجاب میں سکھوں کی سرکشی اور بدانتظامی کے اہم سبب آدینہ بیگ کے اپنے مخبر نے تیمور شاہ کے روبرو آدینہ بیگ کی اصلیت بیان کر دی مگر مغلانی بیگم کے بارے میں کچھ کہنے سے وہ اب بھی پرہیز

کر رہا تھا۔

''آدینہ بیگ مکار بھی ہے اور غدار بھی ہم اسے ضرور سزا دیں گے۔'' نوعمر شہزادے نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''حضور اجازت دیں تو مغلانی بیگم کی نگرانی کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس کی منزل اور ارادوں سے حضور آگاہ رہیں''۔ جہان خان نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''اس کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں صرف احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم بیگم صاحبہ کے ادب واحترام کے خلاف کچھ برداشت نہیں کریں گے''۔ تیمور شاہ نے واضح کیا۔

سید رحیم خان اور بھی محتاط ہو گیا، اسے اندازہ ہو گیا کہ بیگم سے بدلا لینے کے لئے اسے محتاط اور وسیع منصوبہ بنانا ہوگا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آدینہ بیگ کو دربار لاہور میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے اور اگر وہ حکم عدولی کرے تو اس کو گرفتار کر کے لایا جائے۔ ہماری طرف سے مراسلہ اور فوجی تیاری بیک وقت ہونا چاہئے تاکہ باقی ناظموں کو عبرت حاصل ہو اور وہ جان لیں کہ اب کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی''۔ تیمور شاہ نے حکم دیا۔

جہان خان نے ان کے حکم پر آدینہ بیگ کے لئے مراسلہ تیار کروانے مغلانی بیگم کی نگرانی کے لئے دستہ بھیجنے اور فوجی کارروائی کے لئے احکامات جاری کرنے کا وعدہ کیا۔

***

بیگم نے شاہدرہ کے سامنے سے دریا عبور کرنے کی بجائے راوی کے ساتھ ساتھ اوپر جا کر اجنالہ کے سامنے سے دریا کے پار اتر کر سیالکوٹ سے ہو کر قندھار جانے کا راستہ اختیار کیا۔ وہ گوجرانوالہ اور اس کے گرد ونواح میں سرگرم سکھ جتھوں سے بچ کر نکلنا چاہتی تھیں۔ بیگم کے اجنالہ کی طرف سفر کی بناء پر ہی سید رحیم خان کو اس کے آدینہ بیگ کی طرف فرار کا شبہ ہوا تھا۔

بیگم کا قافلہ راوی عبور کرنے کے لئے کشتیوں کا انتظار کر رہا تھا کہ جہان خان کے سواروں کا دستہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سواروں ن بیگم اور ان کے قافلہ کو راوی پار اترنے میں مدد دی اور بتایا کہ وہ دریا کے ساتھ ساتھ راہداس کی طرف جا رہے ہیں تاکہ سکھوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لے سکیں۔ اس دستہ کے کماندار نے واپس آ کر جہان خان کو اطلاع دی کہ بیگم بادشاہ معظم سے انصاف کے حصول کے لئے قندھار جا رہی ہیں تو اس کے لئے نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

''بادشاہ معظم نے بیگم کی درخواست قبول کر لی تو امن کی بحالی مشکل ہو جائے گی۔'' جہان خان نے تیمور شاہ کو بادشاہ کے حضور عرضداشت بھیجنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''بادشاہ معظم نے جموں وکشمیر اور دوآبہ جالندھر کی جاگیر کا بیگم کے نام حکم نامہ جاری نہ کرنے کا فیصلہ بڑی سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ ہم نہیں سمجھتے بیگم یہ حکمنامہ جاری کرا سکیں گی''۔ تیمور شاہ نے جواب دیا۔

''بادشاہ معظم نے آج تک بیگم کی کبھی کوئی درخواست مسترد نہیں کی''۔ جہان خان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''بادشاہ معظم نے بیگم صاحبہ کو جاگیر دینے کے اپنے فیصلہ کے بعد اس کی سند اس لئے روک لی کہ حضور کو پنجاب اور ہندوستان کے حالات کی اصلاح مطلوب ہے۔ انتظامی طور پر یہ مشکل ہوتا کہ سرہند ہمارے پاس ہو اور درمیان میں دوآبہ جالندھر بیگم کی طرف سے آدینہ بیگ کے انتظام میں رہے سکھوں اور آدینہ بیگ کے پہاڑوں کی طرف فرار اور روپوش ہونے کو روکنے کے لئے

کشمیر اور جموں کا سلطنت لاہور کا حصہ رہنا لازم ہے، بادشاہ معظم کو ہماری مشکلات کا احساس ہے''۔ تیمور شاہ نے جواب دیا۔

''پنجاب کے حالات کی خرابی کے اسباب میں بیگم صاحبہ کی امور مملکت میں مداخلت ایک اہم سبب ہے۔ ان کی زوردار شخصیت اور کمزور حکومت کی وجہ سے کوئی بھی ناظم لظم بحال نہ کر سکا۔ اب بیگم اور آدینہ بیگ مل گئے تو ہم کچھ نہ کر سکیں گے، جہان خان نے بیگم کے طرز حکومت اور دور حکومت کی طرف اشارہ کیا۔

''شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی امراء شاہجہان آباد اور نجیب الدولہ نے بادشاہ معظم کے حضور اپنے عریضوں میں یہ سب باتیں لکھ دی تھیں۔ بیگم صاحبہ کی جاگیر کی سند بادشاہ معظم نے ان سب وجوہ سے آگاہ ہو کر ہی روکی تھی''۔ تیمور شاہ نے جواب دیا۔

''وزیراعظم شاہ ولی خان نے ہمیشہ بیگم صاحبہ کی حمایت کی ہے''۔ جہاں خان اتنا کہہ کر رک گیا۔

''شاہ ولی خان بادشاہ معظم سے بیگم کو جموں کشمر اور دوآبہ کی حاکیت کی سند جاری کرنے کی سفارش کر چکے ہیں، ہمیں بتایا گیا ہے کہ سرفراز خاں کی طرف سے اٹک میں عرضداشت پیش کرنے پر وزیراعظم نے اس پر ہمدردانہ غور کا مشورہ دیا تھا مگر بادشاہ معظم نے شاہ ولی خاں کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا''۔ تیمور شاہ مسلسل مغلانی بیگم کے دورہ قندھار کو اہمیت نہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

قلعہ سے واپس گھر پہنچ کر سید رحیم خاں آدینہ بیگ کے لئے مراسلہ تیار کرنے بیٹھ گیا۔ اسے دربار لاہور کی خبروں اور سرگرمیوں کی اطلاع دینے کے بعد اس نے لکھا کہ تیمور شاہ ناتجربہ کار نوجوان ہے، وہ جلد از جلد اپنے والد کو کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کا نائب جہان خان صاف دل اور تجربہ کار سپہ سالار ہے، وہ

دل کی بستی

یقین کیجئے، جب کسی دِل میں کردار اور محبت کی طرف انگلی اٹھ جائے تو اس دل میں کچھ نہیں بچتا۔ کیونکہ محبت اعتماد کے سیلاب کا آخری پشتہ ہوتی ہے۔ اگر وہ بھی ٹوٹ جائے تو پھر بستی کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

(دستگیر شہزاد)

میدانِ جنگ کا ماہر ہے مگر انتظامی میدان میں فتح حاصل کرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔ پنجاب کے حالات اور معاملات کو فوجی طاقت سے سلجھانے کی اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہیں اس لئے اگر مقامی لوگوں کو انہوں نے ساتھ شامل نہ کیا تو ان کی ناکامی لازمی ہے۔ اس نے آدینہ بیگ کو مشورہ دیا کہ وہ ہرگز دربار لاہور میں حاضر نہ ہو کیونکہ تیمور شاہ اور جہان خان کے ارادے ٹھیک نہیں اس نے مغلانی بیگم کے سفر قندھار اور اس کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ شہنشاہ ہندوستان سے لے کر ہند میں احمد شاہ ابدالی کے نمائندہ خصوص نجیب الدولہ حاکم پنجاب تیمور شاہ اور ان کے نائب جہان خان سب بیگم کے خلاف ہیں اور انہیں کسی علاقہ کی حکمرانی دینے کی مخالفت کر رہے ہیں، اس لئے عام رائے یہ ہے کہ مغلانی بیگم قندھار سے خالی ہاتھ آئے گی۔

خط بند کر کے اس نے مہر لگائی اور قاصد خاص کے سپرد کر سوچنے لگا کہ یہ کتنا عجیب کھیل ہے کہ ایک طرف وہ خود ہی مشورے دیتا ہے اور دوسری طرف خود ہی آدینہ بیگ کو ان کی مخبری کرتا ہے کیا آدینہ بیگ مان لے گا کہ اس کا مخبر شاہ کا اہم ترین مشیر بن چکا ہے۔

***

مغلانی بیگم کے لاہور سے روانہ ہونے کے تین دن بعد پرچہ نویسوں نے احمد شاہ ابدالی کو اس کے سفر قندھار کی خبر پہنچا دی تھی۔ جیسے ہی ان کا قافلہ درہ خیبر سے

نکلا افغان سواروں نے ان کا استقبال کیا اور قندھار تک ان کے ساتھ رہے۔ بادشاہ معظم کے حکم پر انہیں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا اور ان ساتھیوں اور خدام کے لئے روزینہ مقرر کر دیا گیا۔ بیگم نے قندھار پہنچتے ہی بادشاہ کے حضور حاضری کی عرضداشت پیش کر دی تھی لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود بیگم کو حاضری کے لئے طلب نہیں کیا گیا۔ بادشاہ کو تیمور شاہ کے مراسلہ کا انتظار تھا تاکہ اس کی روشنی میں بیگم سے بات کر سکے۔ شاہی مہمان خانے کا سربراہ اور خدام ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے باوجود بیگم کا غصہ بڑھ رہا تھا لیکن انتظار کے علاوہ کچھ اور کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

نویں روز جب شاہ ولی خاں بیگم کو حضوری کے لئے لینے آیا تو اس نے اس انتظار اور سلوک پر ناگواری کا اظہار کیا۔ شاہ ولی خاں نے بادشاہ معظم کی مصروفیات کا بہانہ بنایا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ تیمور شاہ نے پنجاب کے بگڑتے ہوئے حالات کا آدینہ بیگ اور مغلانی بیگم کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور لکھا تھا کہ اگر دوآبہ جالندھر بیگم کے سپرد کر دیا گیا تو آدینہ بیگ کی سرکشی پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔

احمد شاہ ابدالی نے اپنے دربار میں بڑی خوشی سے بیگم کا استقبال کیا۔ سرفراز خان اور ملک سجاول بھی بیگم کے ہمراہ تھے۔ انہیں سرداروں کی نشستوں میں جگہ دی گئی، بیگم نے بادشاہ کے مشفقانہ رویہ میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں محسوس کی۔

''مابدولت دختر عزیز کو اپنے دربار میں دیکھ کر مسرت محسوس کرتے ہیں''۔ بیگم کی بجائے بادشاہ نے بات شروع کی۔ ''اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارے مہماندار باشی نے ان کی اور ان کے ساتھیوں کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی''۔

بیگم نے آداب کے انداز میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''بادشاہ معظم کا اس کنیز پر ہمیشہ کرم رہا ہے، حضور عالی مرتبت کے مہماندار باشی کی مہمان نوازی سے ہم واپسی کی راستہ بھولنا شروع ہو گئے تھے''۔

بادشاہ مغلانی بیگم کے الفاظ سے معنی نہ نکال سکا۔

''مابدولت آپ کے بھائی تیمور شاہ کے رماسلہ کے انتظار میں جلد آپ کو حاضری کے لئے طلب نہ رک سکے''۔ انہوں نے بیگم پر صاف طور پر واضح کرنا چاہا کہ جس مقصد کے لئے وہ حاضر ہوئی ہیں اب اس میں تیمور شاہ کا مشورہ لازم تھا۔

''بادشاہ معظم کی اس کنیز نے ہمیشہ حضور کی سلطنت کے مفاد کو اوّل جانا، شہزادہ تیمور شاہ اور ان کی حکومت کا مفاد ہمیں سب سے عزیز ہے۔ حضور کو اور شہزادہ کو اس بارے میں ہم سے کبھی کوئی شکوہ نہ ہوگا''۔ بیگم جانتی تھی کہ تیمور شاہ نے مراسلہ میں کیا لکھا ہوگا۔

''مابدولت کی سلطنت اور شہزادہ تیمور شاہ کی حکومت آپ کی اپنی سلطنت اور حکومت ہے، آپ کو اس کا مفاد عزیز ہونا لازم ہے''۔ بادشاہ نے کہا۔

''بادشاہ معظم نے اس کنیز پر لطف و کرم کرتے ہوئے دوآبہ جالندھر اور جموں کشمیر اسے عنایت فرمایا تھا۔ یہ حضور کی مشفقانہ روایت کے مطابق تھا لیکن کچھ مفسدوں اور دشمنوں کی سازش کی وجہ سے حضور نے اپنا کرم واپس لے لیا۔ ہم یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے کرم کے سایہ سے ہمیں محروم نہ فرمائیں اس سے حضور کے اور ہمارے دشمن خوش ہوں گے''۔

دختر عزیز کے بارے میں مابدولت دشمنوں سے ہمیشہ ہوشیار رہے، ہم لاہور میں آپ کے بھائی تیمور شاہ اور شاہجہان آباد میں بیٹے عمادالملک کو حکومتیں حوالے کر چکے تو ہم نے سوچا خواتین خانہ کے لئے نظم و ضبط حکومت چلانا کٹھن کام ہیں یہ ہمارا دستور بھی نہیں اب آپ کو آرام سے زندگی گزارنا ہے۔ آپ کے بھائی کو آپ کے

مشوروں سے مدد لینا ہے، آپ کی ہر ضرورت پوری کران اس کا فرض ہے"۔ بادشاہ نے کسی لگی لپٹی کے بغیر جواب دیا۔

"بادشاہ معظم نے ہمارے بھائی اور بیٹے کو حکومت سونپ کر ہم پر کرم کیا۔ ہم اس کے لئے شکر گزار ہیں اور یہ امید اور عرض لے کر آئے ہیں کہ جو علاقے ہمیں عطا کئے گئے تھے ان کی سند جاری کر کے ہم پر بھی کرم کیا جائے"۔ بیگم نے بادشاہ کے رویہ میں تبدیلی محسوس کر کے عرض کیا۔ "ہم امید رکھتے ہیں کہ بادشاہ معظم کے دربار سے ہم خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے"۔

"مابدولت نے تیمور شاہ کو حکم دیا ہے کہ آپ کے لئے ہمارے مقرر کردہ تیس ہزار روپے سالانہ کے وظیفہ کو تین گنا بڑھا دیا جائے، ہم امید رکھتے ہیں کہ ہماری دختر اس پر خوش ہو گی اور آرام سے زندگی بسر کر سکے گی"۔ بادشاہ نے اس وظیفہ میں اضافہ کر دیا جس کی اسے اطلاع بھجوائی گئی تھی۔

"بادشاہ معظم اس کنیز کو اپنی دختر قرار دے چکے ہیں اور ان سے مخفی نہیں کہ عرض گزار کے خاندان میں وظیفہ لینے کی روایت نہیں"۔ مغلانی بیگم نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ وظیفہ لینا ان کے شایان شان نہیں۔

"بہنوں اور بیٹیوں کے لئے وظیفہ مقرر کرنا قدیم شاہی روایت ہے، ہم آپ سے شاہانہ سلوک کریں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا۔

ندیم خاص کے اشارے پر خدام بیگم اور ان کے ساتھیوں کے لئے تحائف لے کر داخل ہوئے تو بیگم سمجھ گئی کہ بادشاہ اس بارے میں مزید گفتگو پسند نہیں کرتے اور علاقے واپس کرنے کا فیصلہ واپس لینے پر آمادہ نہیں انہوں نے شکریہ کے ساتھ تحائف قبول کئے۔

بادشاہ نے دعا کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔

شاہ ولی خان بیگم کے ساتھ مہمان خانے تک گیا۔

بیگم بہت افسردہ اور مایوس تھیں۔ شاہجہان آباد میں اسے امید تھی کہ احمد شاہ ابدالی پنجاب کی حکومت پھر سے اسے سونپ دیں گے لیکن جب انہوں نے اندازہ کیا کہ ابدالی ہندوستانی علاقوں کے نظم کے استحکام کے نام پر اپنے بیٹے اور جرنیل کو لاہور میں چھوڑ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے دوآبہ جالندھر اور جموں کشمیر کی حکمرانی پر صبر کر لیا تھا مگر اب اسے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔

احمد شاہ ابدالی نہ ہی مغلانی بیگم کو دوآبہ جالندھر اور جموں کشمیر عطا کرنے کی عرض داشت قبول کر سکتا تھا اور نہ ہی انہیں ناراض کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شاہ ولی خاں کو حکم دیا کہ وہ بیگم کو وظیفہ قبول کرنے پر راضی کرے۔

"بادشاہ معظم کو اپنے وعدے اور اعلان کا پاس نہیں تو ہم ان کا وظیفہ بھی نہیں لے سکتے۔ ہم وظیفے دینے والے ہیں، لینے والے نہیں ہوتے"۔ مغلانی بیگم نے شاہ ولی خاں کو جواب دیا اور واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شاہ ولی خاں نے بادشاہ کو بیگم کے اس جواب اور رویہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

احمد شاہ ابدالی نے واپسی کے سفر میں اپنے محافظ دستہ کے سواروں کو خیبر تک بیگم کے قافلہ کے ساتھ بھیجا اور لاہور میں جہان خان کو مراسلہ ارسال کیا کہ وہ بیگم کو وظیفہ قبول کرنے پر آمادہ کرے اور ان کے مقام و مرتبہ کا احترام کیا جائے۔

***

لاہور میں موسم گرما شدید ہو رہا تھا، گندم کی فصل اٹھائی جا رہی تھی۔ راوی میں کشتیاں اچلانے والے ملاح دن بھر غلہ دریا سے اس طرف لاتے اور رات کو دیر تک بستی کی چوپال میں خوشی کے گیت گاتے۔ صوبہ میں امن کی حالت کافی بہتر ہو رہی تھی اور شہر کی کنک منڈی میں کاروبار کی تیزی کی وجہ سے ملاحوں کی آمدنی بڑھ گئی تھی

اس کے باوجود کالو جب بھی رات کو چوپال سے واپس لوٹتا تو قلعہ کی بلند فصیل کے اوپر سے شاہ برج کے طاقچوں میں روشن شمع دانوں کو دیکھ کر سوچتا وہ دن کبھی لوٹیں گے جب ''آدھی روٹی کا سوال ہے بابا'' کی صدا لگانے والا فقیر پھر سے آئے گا اور اس کی مٹھی میں اشرفیاں تھما کر اندھیرے میں غائب ہو جائے گا، اس کی بیوی نے کئی بار اس سے پوچھا۔ ''دریاؤں کے بابا خضر کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے ہم سے''۔ ایک شام جب وہ چوپال میں پہنچا تو خبر سنی کہ مغلانی بیگم واپس آ گئی ہے اور اپنی حویلی میں مقیم ہے، اسے بہت خوشی ہوئی اب بیگم صاحبہ جلد شاہ برج آ جائیں گی اس نے اپنے دل سے کہا۔ مغلانی بیگم کئی بار حویلی گئی تھی اور کئی بار شیش محل واپس آئی تھی وہ بیگم کے شیش محل میں واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''سنتے ہیں بیگم پھر سے قلعہ پر حکومت کرنے آ رہی ہیں''۔ ایک شام ایک ملاح نے دوسروں کو خبر سنائی۔

''بڑی مقدر والی ہو دیں یہ بیگم بھی جب شاہجہان والے اسے چرا لے گئے تو کوئی جان سکتا تھا کہ کبھی واپس آ دیں گی''۔ دوسرے ملاح نے کہا۔

''کہوے ہیں افغان بادشاہ تو آیا ہی اسے واپس لانے کو تھا، اب قلعہ بھی سونپ دے گا اسے''۔ پہلے نے اپنی بڑ میں اضافہ کیا۔

''اب تو آئی نہ دکھائی دیں''۔ بوڑھے ملاح نے نوجوانوں کی باتیں سن کر رائے دی۔

کالو کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ ''دکھائی کیوں نہ دیں جو افغان اسے شاہجہان آباد سے واپس لائے ہیں، قلعہ بھی لائیں گے''۔

''مورکھ جب حاکم پتن کا ملاح بدلنا چاہے ہیں تو پہلے پتن پر سرکاری افسر مقرر کر دیوے ہیں۔ افغان بادشاہ نے بھی لاہور میں اپنے افسر بھیج دیئے ہیں وہ مغلانی بیگم کے لئے تو یہاں نہیں چھوڑے گئے''۔ بوڑھے ملاح نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

پھر ایک شام چوپال میں خبر پھیلی کہ بیگم لاہور سے کہیں چلی گئی ہے۔

کالو کو بہت افسوس ہوا اس نے کئی بار سوچا تھا کہ کسی روز وہ بیگم کو سلام کرنے جائے گا مگر لدھونے سے اسے فرصت ہی نہ مل سکی تھی۔

''بیگم کو اب لاہور کی ہوا راس نہ آوے ہے''۔ بوڑھے ملاح نے بیگم کے جانے کے بارے میں سن کر کہا۔ ''معلوم نہیں بے چاری کہاں دھکے کھانے چلی گئی''۔

کالو کے تو جیسے سینے میں تیر اتر جائے۔ ''معلوم نہیں بے چاری کہاں دھکے کھانے چلی گئی''۔ سن کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ صبح وہ کشتی نہیں چلائے گا اور بیگم پورہ جا کر بیگم کے بارے میں معلوم کر کے چوپال والوں کا منہ بند کر دے گا۔

جب حویلی کی ڈیوڑھی کے محافظوں کے کماندار سے اس نے کہا کہ وہ بیگم حضور کا بیٹا ہے اور ان کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہے تو وہ مسکرا دیا۔

''ہم سے کوتاہی ہوا جو بیگم حضور کے ہوتے ہوئے نہ آ سکا''۔

کماندار پھر مسکرایا اور کچھ سوچ کر حویلی کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہباز خان کے ہمراہ واپس آ گیا۔

''ہم کالو ہے کشتی چلانے والا، ہم کو بیگم حضور نے کوڑے مارنے کا حکم دیا تھا اور پھر کہا تھا آج سے تم ہمارا بیٹا ہے''۔ کالو نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''شہباز خان کو یہ تو یاد تھا کہ بیگم عالیہ نے ایک ملاح کو کوڑے لگانے کا حکم دیا تھا مگر بیٹا والی بات وہ نہیں مانتا تھا۔

''وہ آدھی روٹی کا سوال والا بابا بھی ہم کو جانتا ہے، ہم انہیں خواجہ خضر سے ملانے لے جاتا تھا''۔

کمانداراور شہباز خان کو کالو کی باتیں بہت دلچسپ لگیں، شہباز اسے وہیں چھوڑ کر ملک قاسم کو اطلاع کرنے چلا گیا تو کماندار خواجہ خضر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کالو نے جواب دیا۔ ''ہم دریاؤں کے خواجہ کی باتیں بتا کر انہیں ناراض نہیں کر سکتے، ہم اس کے راوی ہیں کشتی چلاتا ہے''۔

ملک قاسم کے لباس اور باتوں سے کالو نے اندازہ کیا کہ وہ کوئی ترک یا افغان نہیں تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ملک قاسم بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا اور دریا میں پانی کی گہرائی کشتی کے ایک پھیرے کے کرایہ اور آمدنی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ راوی کا پرانا ملاقاتی ہے تو وہ اسے اندر لے گیا۔ انہیں ملاحوں کے گیت سنے بہت عرصہ ہوا تھا۔ قاسم کی فرمائش پر کالو نے اردگرد دیکھا اور بلند آواز میں گانے لگا مردانہ اور زنانہ کے سارے ملازم گیت کی آواز سن کر وہاں جمع ہو گئے۔

گنا بیگم اپنے کمرے میں لیٹی تھی اور کنیز سرہانے پنکھا ہلا رہی تھی۔ وہ شاہجہان آباد کی شاہانہ زندگی کی یادیں دل سے نکال تو نہیں سکی تھی مگر زندگی کے نئے حقائق سے کافی حد تک سمجھوتہ کر چکی تھی۔ مغلانی بیگم نے ملک قاسم کی بانسری میں گنا کی دلچسپی دیکھ کر اس کے دل میں قاسم اس کا گاؤں اور وہاں کی زندگی کی جو دلکش تصویر بنانا شروع کی تھی۔ گنا بیگم کے دل کے کینوس پر اس کے نقوش ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔ بیگم قاسم کے علم اور ارادہ کے بغیر اسے گنا کے قریب رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شاہجہان آباد سے قاسم کی نگرانی میں اسے لاہور بھیجا تھا اور قندھار کے سفر کے وقت اسے حویلی کا سربراہ بنا دیا، وہ چاہتی تھی کہ گنا کے دل سے شاہجہان آباد اور وہاں کی یادیں دھل جائیں اور زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں اس کے شاہجہان آباد واپس جانے اور پھر سے وہاں کے امراء کے حلقہ میں موضوع بننے کا امکان نہ رہے۔

احمد شاہ ابدالی نے گنا بیگم کو عمادالملک سے دور رکھنے کے لئے بدخشاں بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر گنا کے پس منظر کی وجہ سے بیگم کو یہ پسند نہ تھا۔

ملاح کے گانے کی آواز کان میں پڑی تو گنا بیگم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''معلوم کریں یہ کون گا رہا ہے''۔ اس نے کنیز کو حکم دیا۔

گانے کا مطلب اس کے فہم کے حدود سے کافی پرے تھا مگر گانے والے کی آواز کی مٹھاس اور لوچ اسے بہت بھلی معلوم ہوئی تھیں۔ کنیز نے واپس آ کر بتایا کہ راوی میں کشتی چلانے والا کوئی ملاح ہے جسے بیگم حضور نے اپنا بیٹا کہہ رکھا ہے۔ وہ ان کا حال معلوم کرنے آیا تھا اور ملک قاسم کی فرمائش پر انہیں ملاحوں کے گیت سنا رہا ہے تو گنا کو یاد آیا کہ مغلانی بیگم شاہجہان آباد میں بھی ان ملاحوں کو یاد کیا کرتی تھیں لیکن پنجاب کی حاکم ہوتے ہوئے بھی وہ عام ملاحوں سے تعلق رکھتی تھی اور ایک کشتی چلانے والے کو اپنا بیٹا کہہ رکھا تھا۔ اسے بہت عجیب سا لگا۔ شاہجہان آباد میں تو کسی امیر وزیر کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کسی مزدور پیشہ کو منہ لگائے گا اور ایسا مزدور پیشہ اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر پہنچ جائے گا۔ وہ شاہجہان آباد اور لاہور کے فرق کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی مگر گانا بار بار اس کی سوچ کا تانا بانا بکھیر دیتا تھا۔

اس نے میاں خوش فہم کو ملک قاسم کے پاس بھیجا کہ وہ بھی ملاح کا گیت سننا چاہتی ہیں اسے زنانہ میں بھیجا جائے، ملک قاسم اور کالو دونوں کے لئے گنا بیگم کی خواہش حیران کن تھی۔

کالو ملک قاسم اور گنا بیگم کو گیت سنانے کی اپنی کہانی بڑے مزے لے لے کر سنا رہا تھا اور چوپال میں موجود سب ملاح خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔ کالو انہیں

ملک قاسم اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ بیگم اپنی حویلی کا انتظام ملک پور کے ایک نوجوان کے سپرد کر گئی ہے اور شاہجہان آباد سے بیگم جس لڑکی کو بیٹی بنا کر لائی ہے وہ پنجابی سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے اور قندھار کے بادشاہ نے شاہجہان آباد کے ان امراء کو بہت ذلیل کیا ہے جنہوں نے مغلانی بیگم کو حوالے جانے میں حصہ لیا تھا اور اب بادشاہ نے بیگم کو قندھار بلایا ہے تاکہ وہ پنجاب میں سکھوں کے بارے میں ان سے مشورہ کر کے انہیں ختم کر دے اور پھر سے قلعہ بیگم کے حوالے کر دے۔

اس نے کہانی میں بہت سی باتیں اپنے پاس سے شامل کر دی تھیں تاکہ ملاحوں کو یقین آ جائے کہ مغلانی بیگم پھر سے قلعہ میں آنے والی ہے اور افغان واپس چلے جائیں گے۔ یہ کہانی ملاحوں میں پھیلی اور ان کی کشتیوں میں راوی پار کرنے والوں کے ذریعے لاہور سیالکوٹ اور آگے کوہ شوالک کے چرواہوں تک پہنچ گئی۔

***

آدینہ بیگ کوہ شوالک کی پہاڑیوں سے نکل کر واپس دوآبہ پہنچ گیا تھا مگر تیمور شاہ نے ابھی تک اسے دوآبہ کی حکمرانی کی سند جاری نہیں کی تھی۔ مغلانی بیگم کی طرف سے جاری کردہ سند احمد شاہ ابدالی کے احکامات کی وجہ سے منسوخ ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اس نے دوآبہ پر قبضہ کر کے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور تیمور شاہ کی طرف سے کسی فوجی کارروائی کے خدشہ کے پیش نظر اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے لاہور کے افغان حکمرانوں کے خلاف شورش تیز کرنے کے لئے سکھوں کی مدد بڑھا دی تھی تاکہ تیمور شاہ ان سے الجھا رہے۔ سکھوں نے ستلج سے چناب تک لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا تھا۔ ان کے جتھے نواح لاہور تک میں بھی اچانک سرگرم ہو گئے تھے۔ تیمور شاہ اور جہان خان مقامی سکھوں کے خلاف کوئی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام دکھائی دیتے تھے۔ اُدھر شاہجہان آباد میں عمادالملک نے ابدالی کے مقرر کردہ نگران نجیب الدولہ کے خلاف مرہٹوں سے مدد حاصل کر کے اسے بے اختیار کر دیا تھا اور پھر سے پہلے کی طرح مختار کل بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدینہ بیگ کے مخبر شاہجہان آباد کی تازہ خبریں اسے بھیجتے رہتے تھے۔ دوآبہ میں مکمل امن و امان تھا اور وہ بڑی ہوشیاری سے پیسہ خرچ کر کے پنجاب پر حکومت کے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سید رحیم خان تیمور شاہ کو اس امر پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ آدینہ بیگ کو دوآبہ کا ناظم مقرر کر دیا جائے اور سکھوں کے خلاف مہم میں اس سے مدد لی جائے تو تیمور شاہ نے آدینہ بیگ کو مراسلہ ارسال کیا کہ وہ لاہور میں حاضر ہو کر اپنی وفاداری کا اعلان کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ اگر آدینہ بیگ دربار میں خود حاضر ہو کر دربار لاہور کی ملازمت حاصل کر لے تو اسے دوآبہ کا باقاعدہ ناظم مقرر کر دیا جائے مگر آدینہ بیگ کو ڈر تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے حکم پر کافروں کے خلاف لڑائی میں شامل نہ ہونے اور باغیانہ رویہ اختیار کر کے پہاڑوں میں جا کر چھپ جانے کے جرم میں تیمور شاہ اسے گرفتار کر لے گا۔ اس نے دربار لاہور سے وفاداری کے اظہار پر تو آمادگی ظاہر کر دی مگر دربار میں حاضر ہونے سے معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ سکھوں کی شورش کی وجہ سے وہ دوآبہ سے باہر نہیں جا سکتا۔

آدینہ بیگ کے انکار پر تیمور شاہ نے اس کے خلاف فوج کشی کا حکم دے دیا اور جہان خان فوجی تیاریوں میں لگ گیا۔ سید رحیم خاں نے جب دیکھا کہ تیمور شاہ آدینہ بیگ کے خلاف فیصلہ کن اقدام کا ارادہ رکھتا ہے اور افغان فوجیں پہاڑوں تک اس کا تعاقب کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں تو اس نے آدینہ بیگ کی

دربار میں حاضری سے معذرت کی صفائی پیش کی اور تیمور شاہ کو مشورہ دیا کہ کسی کارروائی سے پہلے آدینہ بیگ کو ایک اور موقعہ دیا جائے۔ اس نے پیشکش کی کہ وہ خود تیمور شاہ کا حکم نامہ آدینہ بیگ تک لے جانے اور اسے اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ اسے امید تھی کہ تیمور شاہ اس کی تجویز سے اتفاق کرے گا اور وہ آدینہ بیگ کو حالات اور جہان خان کے ارادوں سے آگاہ کر کے کسی سمجھوتہ پر راضی کرلے گا۔

تیمور شاہ نے واقعی اس کا مشورہ قبول کرلیا۔

آدینہ بیگ ان دنوں پٹیالہ میں مقیم تھا وہ اپنی شاندار حویلی میں ہر روز دربار لگاتا تھا اور امراء اور فوجی افسر اس کے سامنے اسی انداز میں قطاریں باندھے مؤدب کھڑے رہتے تھے جس انداز میں مغل حاکم لاہور کے سامنے اس کے امراء اور درباری سر جھکا کر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ اس کا خزانہ فوج اور علاقہ سب محفوظ تھے، اس کے باوجود وہ خوفزدہ تھا اور جانتا تھا کہ دوآبہ جالندھر پر لاہور کی حاکمیت شہنشاہ ہند بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ اب اگر افغان فوجیں اس کے خلاف چل پڑیں تو انہیں روکنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔ مگر وہ اپنی کمزوری کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

آدینہ بیگ نے سید رحیم خاں کا پٹیالہ میں شاندار استقبال کیا۔ ''آپ کی آمد باعثِ مسرت اور علامت کامرانی ہے''۔ اس نے کمرہ تنہائی میں سید رحیم خاں سے بات چیت شروع کرتے ہوئے کہا۔

سید رحیم خاں نے اعتماد اور استقبال کے لئے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کا خادم دو آقاؤں کا ملازم ہے۔ حضور اس کے پرانے آقا ہیں اور تیمور شاہ نیا آقا ہے۔ خادم کا دل آپ کے ساتھ ہے اور دماغ بھی آپ کا ساتھ دے گا''۔

''اس وقت ہم اپنے خادم سے نہیں حاکم لاہور کے سفیر سے مخاطب ہیں اور ان کا پیغام جاننا چاہتے ہیں''۔ آدینہ بیگ نے جواب دیا۔

''خادم کے نئے آقا کا پیغام مختصر ہے، اطاعت دربار لاہور''۔

''ہم آپ کے نئے آقا پر کہاں تک بھروسہ کر سکتے ہیں؟''

''حضور کا خادم دل اور دماغ سے یقین دلاتا ہے کہ اس کا نیا آقا اس کے پرانے آقا کو دوآبہ کی حکومت پر قائم رکھے گا''۔

آدینہ بیگ خوش ہوگیا۔ ''کوئی شرائط؟''

''اظہار اطاعت اور مالیہ کی ادائیگی''۔

''اس بارے میں ہم کل تیمور شاہ کے سفیر کو اپنے جواب سے آگاہ کریں گے''۔ آدینہ بیگ نے کہا۔ ''اب ہم اپنے نمائندہ متعین لاہور سے لاہور کے دربار، امراء اور حکمرانوں کے بارے میں جاننا چاہیں گے''۔

''تیمور شاہ نو آموز اور نا تجربہ کار ہے''۔ سید رحیم خاں نے لاہور کے حالات کا بیان شروع کیا۔ ''اس کا جرنیل جہان خان سکھوں کی شورش دبانے کی پوری کوشش کررہا ہے مگر فوج اور سرمایہ کی کمی کی وجہ سے حالات اس کے قابو میں نہیں آرہے۔ تیمور شاہ اپنے والد کو جلد از جلد کچھ کامیابی دکھانا چاہتا ہے۔ حضور سے مصالحت اور دوآبہ کی حکمرانی قائم رکھنے کا فیصلہ اس کی اسی خواہش کی وجہ سے ہے۔ یہ مصالحت نہ ہوسکی تو وہ فوجی کارروائی کا فیصلہ کر چکے ہیں اور میرے واپس جاتے ہی فوجیں روانہ ہوجائیں گی''۔

آدینہ بیگ فوجی کارروائی کا سن کر تھوڑی دیر خاموش رہا مگر یہ خیال کر کے کہ سید رحیم خاں اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکالے۔ اس نے موضوع بدل دیا۔ ''امرائے لاہور کا رویہ کیسا ہے؟ انہوں نے تیمور شاہ کو قبول کرلیا ہے یا نہیں، تیمور شاہ ان پر اعتماد کرتا ہے؟''

''لاہور کے امراء اور شرفاء میں تیمور شاہ کی قربت کے مقابلہ کی دوڑ جاری ہے مگر جہان خان ان کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ سکھوں کے مقابلہ میں ان کی سابقہ پسپائیوں کی وجہ سے ان پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں''۔

''مغلانی بیگم کس حال میں ہے؟''

''قندھار سے واپس آنے کے بعد سے وہ بازار حکیماں کی ایک ویران سرائے میں پڑی ہے، اس کی صاحبزادی اور خادم بیگم کوٹ کی حویلی میں ہیں مگر وہ خود قلعہ سے قریب سرائے میں رہ رہی ہے تاکہ دربار اور امرائے لاہور سے قریب رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے جہان خان کو اسے منانے اور وظیفہ قبول کرنے پر راضی کرنے کا حکم دیا تھا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ ابھی تک اس امید پر ہے کہ بادشاہ اس کی ناراضگی اور وفاداری کو دیکھ کر اس کی جاگیر بحال کر دے گا''۔ سید رحیم خان نے بتایا۔

''مغلانی بیگم کے لئے احمد شاہ ابدالی کے اس فیصلہ کو ماننے بغیر اب چارہ نہیں''۔ آدینہ بیگ نے رائے دی۔

''بیگم کے لئے اس فیصلہ کو ماننے بغیر چارہ بھی نہیں اور اس میں اسے ماننے کا حوصلہ بھی نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی سفارت کاری اور فتنہ انگیزی سے ڈر کر تیمور شاہ اس کی جاگیر بحال کرنے کی سفارش کر دے گا۔ امراء سے میل ملاپ اور حویلی کی بجائے سرائے حکیم میں قیام اسی وجہ سے ہے''۔

''تیمور شاہ کو بیگم کی ان سرگرمیوں کا علم تو ہوگا؟''

''تیمور شاہ کے پاس بیگم کی نگرانی کے لئے وقت نہیں اور نہ ہی نوجوان تیمور شاہ بیگم کی فطرت سے آگاہ ہے''۔

اس انکشاف پر آدینہ بیگ کو خوشی ہوئی۔ ''ہماری خواہش ہے کہ آپ بیگم سے بھی تعلق رکھیں اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیل سے ہمیں باخبر رکھیں۔ تیمور شاہ کے بعد لاہور میں سب سے اہم مغلانی بیگم ہیں''۔

''حضور کے حکم پر اس میں کوتاہی نہیں ہوگی''۔ سید رحیم خاں نے جواب دیا۔

اگرچہ اسے بیگم سے رابطہ رکھنا سخت ناگوار تھا مگر آدینہ بیگ کے حکم کے بعد وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

آدینہ بیگ نے تیمور شاہ کی اطاعت قبول کر لی اور وعدہ کیا کہ وہ چھتیس لاکھ روپیہ سالانہ اس کے خزانہ میں جمع کرائے گا۔ اس نے ایک بار پھر درخواست کی کہ اسے دربار لاہور میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور معاہدہ کی شرائط طے کرنے کے لئے اس نے اپنے وکیل دلارام کو سید رحیم خاں کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔

تیمور شاہ آدینہ بیگ کی فطرت سے واقف نہ تھا۔ سید رحیم خاں کی ترغیب پر اس نے اس کی پیش کردہ شرائط منظور کر لیں اور آدینہ بیگ کی تقرری کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ جہان خان کو یہ معاہدہ پسند نہیں تھا، اس نے تیمور شاہ کو مشورہ دیا کہ آدینہ بیگ کی طرف سے مالیہ کی رقم کی ادائیگی اور نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر دلارام کو لاہور میں روک لیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ آدینہ بیگ مالیہ کی ادائیگی کا وعدہ کر لیا کرتا ہے مگر اسے پورا کرنے میں کبھی سچا ثابت نہیں ہوا۔

تیمور شاہ نے اس کا مشورہ بھی مان لیا اور دلارام کو لاہور میں قیام کا پابند کر دیا۔ آدینہ بیگ کو معلوم ہوا تو اس نے دلارام کو مراسلہ بھیجا کہ وہ مغلانی بیگم سے رابطہ رکھے اور ان کی ہدایات پر عمل کرے۔ اس نے بیگم کو بھی مراسلہ ارسال کیا اور لکھا کہ میر منو کے خاندان کے پرانے خادم کی حیثیت سے وہ ان کی ہر خدمت کے لئے تیار ہے اور آزمائش کی اس گھڑی میں ان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

***

کالو بہت خوش تھا، وہ چوپال میں موجود ملاحوں کو بیگم کی دعوت اور جلوس کی کہانی بڑی بڑھا چڑھا کر سنا رہا تھا۔ ''بیگم کی دعوت میں افغان جرنیل بھی شریک ہوا اس کے فوجی سردار اور امرائے دربار بھی شریک ہوئے۔ لاہور شہر کے شرفاء اور علماء نے بھی شرکت کی اور سب نے مل کر بیگم کی منت سماجت کی''۔

''بیگم قلعہ واپس آ بھی جائے تو ہمیں کیا؟ اتنی بڑی دعوت کی اور ہماری بستی سے صرف ایک کالو کو بلایا''۔ ایک ملاح نے کالو کو تنگ کرنے کو کہا۔

''کیا معلوم اس نے بلایا بھی تھا یا یہ خود ہی چلا گیا تھا''۔ دوسرے نے کہا۔

''کالو خود گیا تھا یا بیگم نے بلایا تھا، یہ ہماری بستی کی عزت ہے''۔ بوڑھے ملاح نے اس کا مذاق اڑانے والوں کو روکنے کو کہا۔

''تم تو جا کر دیکھو کسی کی دعوت میں بن بلائے کوئی عام آدمی بھی تمہیں گھر میں گھسنے نہیں دے گا، وہ تو مغلانی بیگم کی دعوت تھی جسے افغان بادشاہ اپنی بیٹی کہتا ہے اور جس کی بیٹی مغل والے بادشاہ کے وزیر اعظم کی بیگم ہے''۔ کالو نے غصہ سے کہا۔

بوڑھے ملاح نے اس کو ٹھنڈا کرنے کو کہا۔ ''راوی نے کئی حکمرانوں کو آتے دیکھا مگر راوی میں کشتی کھینچنے والوں کو کبھی کسی نے اتنی عزت نہیں دی تھی، یہ سب کشتی چلانے والوں کی عزت ہے اس پر تو بابا خضر بھی خوش ہوں گے''۔

کالو خوش ہو گیا۔ ''افغان بادشاہ کا جرنیل خود بیگم کو اس کی حویلی تک چھوڑنے گیا۔ جلوس میں اس کے فوجی سوار بیگم کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ تیمور شاہ رک تو اس نے خود روک دیا کہ حاکم کے لئے اچھا نہیں لگتا ورنہ وہ تو خود کہتا تھا میں اپنی بہن کو اس کی حویلی تک چھوڑنے جاؤں گا''۔

جواہر ریزے

* مصیبت کو پوشیدہ رکھنا جواں مردی ہے۔
* نفاق یہ ہے کہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنا اور دوسروں کے عیوب اچھالنا۔
* تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے، باقی تو صرف ہڈیاں اور گوشت ہے۔
* غلطیوں سے نہیں، انسان اپنی غلطیوں پر اصرار سے تباہ ہوتے ہیں۔
* موت کا ذائقہ تو سب چکھتے ہیں لیکن زندگی کا کوئی کوئی۔

(حکیم ممتاز-میانوالی)

''تیمور شاہ دعوت میں تو شریک نہ ہوا، جلوس میں کیسے شریک ہوتا؟'' ایک نوجوان بزرگ کا منشاء سمجھ نہ سکا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کھانا تو اس نے بیگم کا ہی کھایا۔ سرائے سے قلعہ تک ایک بڑا جلوس کھانا لے کر گیا تھا۔ اتنا کھانا تھا کہ سب قلعہ والے بھی ختم نہیں کر سکے تھے۔ حاجت مندوں میں تقسیم کیا گیا ہوگا''۔ کالو نے جواب دیا۔

احمد شاہ ابدالی کو شاہجہان آباد کے حالات کی مسلسل خبریں موصول ہوتی رہتی تھیں۔ مغلانی بیگم کا سرائے میں قیام اسے پسند نہیں تھا اس نے تیمور شاہ اور جہان خان کو ہدایت کی کہ وہ انہیں وظیفہ قبول کرنے اور سرائے حکیم سے بیگم پورہ میں اپنی حویلی میں منتقل ہونے پر راضی کریں۔ تیمور شاہ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے بیگم کو مراسلہ ارسال کیا کہ ہم آپ کے ملک اور شہر میں آئے ہیں اور حضور نے ابھی تک ہماری دعوت بھی نہیں کی۔ اہل ہندوستان جانتے ہیں کہ حضور ہمارے لئے بہن کے مقام پر ہیں۔ وہ کیا کہتے ہوں گے کہ بڑی بہن نے چھوٹے بھائی کو ایک وقت کا کھانا بھی نہ کھلایا؟

اس کا خیال تھا کہ بیگم اپنی حویلی میں دعوت کا اہتمام کریں گی کیونکہ سرائے میں اس کی گنجائش نہیں تھی لیکن بیگم نے تیمور شاہ کے اہل خانہ خدام اور حکام کے لئے اسی سرائے میں دعوت کا اہتمام کیا اور تیمور شاہ کو قلعہ میں ہی کھانا بھجوا دیا اور لکھا کہ ''بھائی حاکم ہے۔ بہن کو پسند نہیں کہ وہ اس کی کٹیا میں آئے، یہ اس کے مقام و مرتبہ کے منافی ہے'' اور نہایت ہوشیاری سے تیمور شاہ کی چال پلٹ دی۔

دعوت کے بعد جہان خان اور اس کے ساتھی بیگم کو وظیفہ قبول کرنے اور حویلی میں واپس جانے پر آمادہ کرنے لگے۔ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے مگر بیگم ان کے ارادہ سے آگاہ تھی۔ ''معین الملک کی روح اور جسم سے دوری ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ بیگم کوٹ سے آ کر حاضری دینا ہمارے لئے دشوار ہو گا''۔ اس نے جاگیر نہ ملنے پر ناراضی کی بجائے سرائے میں قیام کو میر منو کے مزار سے قریب رہنے کی خواہش کو قرار دیا۔

''روحوں کے لئے مسافت کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مزار سے دوری کا علاج حضور کا بھائی کر سکتا ہے۔ حضور جب چاہیں شاہی دستہ اور سواری حضور کی ڈیوڑھی میں موجود ہوں گے''۔ جہان خان کی بجائے ان کے ایک لاہوری امیر نے کہا۔

''لاہور سے ہماری غیر حاضری میں مدرسہ معین الملک کا نظم خراب ہو گیا تھا، ہم مدرسہ کے قریب رہ کر اس کی نگرانی بھی تو کرتے ہیں''۔ بیگم نے جواب دیا۔

بیگم نے اپنے خاوند کے مزار کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا جو اس کی عدم موجودگی میں بھی چلتا رہا تھا۔

''مدرسہ کا نظم تیمور شاہ کی ذمہ داری ہے، بادشاہ معظم معین الملک مغفور کے اس مدرسہ کی نگرانی کا خود اہتمام کریں''۔

جہان خان نے اپنے مشیر کی رائے کی تائید کرتے ہوئے وہیں اعلان کر دیا کہ مدرسہ معین الملک کا انتظام آج سے سرکار کے ذمہ ہو گا۔

رات گئے تک مذاکرات جاری رہے اور جہان خان بیگم کو وظیفہ قبول کرنے اور سرائے سے بیگم پورہ کی حویلی میں منتقل کرنے پر آمادہ کر کے واپس لوٹے، اگلے روز وہ خود جلوس کی صورت میں بیگم کو ان کی حویلی چھوڑنے گئے۔

آدینہ بیگ سے معاہدہ کے بعد یہ تیمور شاہ کی دوسری بڑی کامیابی تھی، انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو اس کی اطلاع ارسال کر دی اور ساری توجہ نظم مملکت کی اصلاح پر لگا دی۔

سید رحیم خاں نے آدینہ بیگ کو تیمور شاہ کی صلح کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ نواح لاہور میں امن و امان بحال ہو رہا ہے۔ راستے محفوظ ہیں، تجارتی قافلے اور عام مسافر بلا خوف آنے لگے ہیں اور لوگوں کو عدل و انصاف کے نظام سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔

نظم پنجاب میں استحکام سکھ ہی درہم برہم کر سکتے تھے اگر جہان خان سکھوں کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا تو ان سے دوآبہ جالندھر بھی واپس لیا جا سکتا ہے۔ مغلانی بیگم کے وظیفہ قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پنجاب کے حالات میں کسی تبدیلی سے مایوس ہو چکی ہے۔ آدینہ بیگ نے ساری اطلاعات اور حالات کا تجزیہ کر کے سکھوں کو روپیہ اور حوصلہ دینے کا نیا منصوبہ بنایا اور صدیق خاں کو اس پر فوری عمل شروع کرنے کی ہدایات دے کر مرہٹوں کی سرگرمیوں اور ارادوں کے بارے میں تازہ معلومات کے حصول کے لئے شاہجہان آباد میں اپنے مخبروں کو فوری مراسلہ لکھنے کا حکم دیا۔

***

اہل لاہور نے ایسا اعلان پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ ''جس کسی مسلمان کے پاس اپنی سواری ہے وہ جہاد کی تیاری

کرے''۔

سکھوں کے خلاف اب تک ہمیشہ حکومتی فوجیں ہی لڑتی رہی تھیں۔ پنجاب پر مسلمانوں کی سینکڑوں سال کی حکومت کے دوران کبھی کسی حکمران نے مسلمانوں کو جہاد کے لئے آواز نہیں دی تھی۔ سکھ مسلمان حکمرانوں کے خلاف مذہبی جوش و جذبہ سے دینی جنگ لڑتے رہے تھے۔ اس کے باوجود عام مسلمان جہاد کے اعلان اور جذبہ سے واقف نہیں تھے۔ افغانوں نے پہلی بار انہیں جہاد کے لئے گھروں سے نکلنے کو کہا تو انہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان کے لئے یہ اعلان بہت عجیب تھا۔ افغان اپنی حکومت کے ساتھ اپنا جہاد بھی یہاں لے آئے ہیں''۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

علماء اور اہل مدرسہ سے پوچھنے چل پڑے۔ ''جہاد کے لوازمات پورے ہو گئے؟ کیا سکھوں کے خلاف لڑائی میں مارے جانے والے شہید ہوں گے؟'' مسلمانان ہند جہاد کی صرف دینی اہمیت کو مانتے تھے، جہاد ان کے عمل و کردار سے بہت دور تھا۔

شاہجہان آباد سے شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء احمد شاہ ابدالی کو مسلمانان ہند کے تحفظ کے لئے جہاد کی دعوت دیتے رہے تھے مگر خود مسلمانان ہند اپنے تحفظ کے لئے کبھی جہاد کے لئے گھوڑوں پر سوار نہیں ہوئے تھے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی باہر سے جہاد کرنے آئے اور انہیں کفر اور کفار سے مکمل تحفظ فراہم کر دے۔ مسلمانان لاہور کے اس رویہ سے ان کے افغان حکمران بہت حیران ہوئے۔ ان دنوں افغان فوجیں لاہور سے دور تھیں اور پرچہ نویسوں نے چک گورو میں سکھوں کے بھاری اجتماع کی خبریں دی تھیں۔ جہان خان نے ان خبروں اور سکھوں کے اجتماع اور اپنی طاقت کا جائزہ لیا تو اسے اہل لاہور کو جہاد میں شمولیت کی دعوت دینا پڑی تھی مگر جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے مسلمانوں میں جذبہ جہاد کی بیداری کی کوئی امید نہیں تو اسے انہیں یہ دینی فرض ادا کرنے پر مجبور کرنا پڑا۔ جہان خان صرف دو ہزار سوار اور پیادہ باقاعدہ اور بے قاعدہ لڑنے والوں کے ساتھ شہر سے نکلا اہل لاہور پر ان کی اپیل اور سختی کا بہت کم اثر ہوا تھا۔

مغلانی بیگم سکھوں کے خلاف جہاد میں افغانوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی، اس نے بھی سواروں کا ایک دستہ بھرتی کیا اور جہان خان کی فوج کے ساتھ چک گورو کی لڑائی میں حصہ لینے بھیج دیا۔

سرائے خان خاناں میں منزل کرنے کے بعد دوسرے روز جہان خان کی فوج چک گورو کے قریب پہنچی تو چاروں طرف سے سکھوں نے اس پر یلغار کر دی۔ انہیں جہان خان کی روانگی اور اس کی بے قاعدہ فوج کی تعداد کی پہلے سے اطلاع مل چکی تھی اور وہ چک گورو سے باہر نکل کر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا، سکھوں نے جہان خان کی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی، وہ تجربہ کار اور جاں نثار جنگجو تھے۔ دوسری طرف جہان خان کے ساتھ بہت سے ایسے مسلمان تھے جنہوں نے پہلے کبھی تلوار نہیں اٹھائی تھی اور نہ ہی کبھی میدان جنگ دیکھا تھا۔ انہیں زبردستی میدان جہاد میں لایا گیا تھا۔ سکھوں کے پہلے ہی حملہ میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنے کماندار کو میدان جہاد میں چھوڑ کر بھاگنا شروع ہو گئے۔ جہان خان کے ساتھ اس کے ذاتی دستہ کے سوار رہ گئے، وہ بڑی جانفشانی سے سکھوں کی یلغار روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کا وقت شہادت آن پہنچا ہے۔

ملک قاسم نے آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی کوشش کی تو جہان خان نے روکا۔ ''صف اور سلامتی میں دشمن کے لئے خلاء پیدا نہ کرو''۔

اس نے گھوڑے کو گھمایا تو عقب سے سکھوں کا ایک گروہ جہان خان کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ ان کی طرف لپکا۔ جہان خان سیدھا آگے نکل گیا۔ صف اور سلامتی میں خلاء پیدا ہو گیا تو طہماس خاں نے اس خلا میں گھوڑے ڈال کر دونوں کی پشت محفوظ کر دی۔ سکھ افغان جرنیل اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو گھیرے میں لے چکے تھے اور ان پر گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ جہان خان اور ان کے ساتھی بڑی جانفشانی سے لڑ رہے تھے۔ اچانک ایک طرف سے نعرۂ تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ افغان سردار طلائی خان اپنی فوج کے ساتھ ان کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔ سکھ پلٹے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ افغانوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔

جہان خان کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا، ان کے ساتھیوں کا میدان جہاد میں کمانداد کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا بہت افسوسناک تھا۔ طلائی خاں کی فوج اچانک مدد کو نہ پہنچ جاتی تو مسلمانوں کی شکست صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہان خاں نے میدان جنگ سے فرار ہونے والوں کو گھیر کر واپس لانے کا حکم دیا اور جب افغان دستے انہیں گھیر کر لائے تو ان میں سے بہت سوں کو جہان خاں نے اپنے سامنے زخمی کروایا۔

ملک قاسم کے دستہ نے اس نازک وقت میں بڑی بہادری دکھائی تھی اور جہان خان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ لاہور واپس آ کر اس نے تیمور شاہ سے ان کے لئے انعام و اکرام کی درخواست کی اور ملک قاسم کی بہادری اور مہارت کی بہت تعریف کی۔ تیمور شاہ نے ملک قاسم اور طہماس خاں کو خلعت عطا کئے اور ملک قاسم کو "خان" کا لقب دے کر اسے افغان سرداروں کے برابر مرتبہ پر فائز کر دیا۔

مغلانی بیگم ان کی اس کامیابی اور عزت افزائی پر بہت خوش ہوئی۔

جہان خان اور تیمور شاہ مسلمانانِ لاہور کی میدانِ جنگ سے پسپائی پر بہت غصہ میں تھے مگر کچھ نہیں کر سکتے تھے، نہ انہیں سزا دے سکتے تھے اور نہ ہی ان کے ناک اور کان کٹوانے کا حکم دے سکتے تھے۔

***

مغلانی بیگم نے راہوار تخیل کی لگامیں کھینچ لیں، راوی کے بیلے میں موروں کے نغمۂ صبح نے اس کے ذہن میں وہ سارے واقعات تازہ کر دیئے تھے جنہیں وہ آج کی صبح بھول جانا چاہتی تھی۔ وہ صبح جب اس نے میر منو کی میت کے سرہانے باغیوں کو پایا تو اور یہ صبح جب وہ گنا بیگم کو ملک قاسم کے ساتھ بیاہنے آئی تھی۔ وہ انتہائے غم کی صبح تھی اور یہ انتہائے مسرت کا دن۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اس پر وہ کچھ بیتا جو کسی خاتون پر نہ بیتا ہو گا مگر آج کی مسرت کے پھولوں میں چھپا دکھ کا کانٹا نکالنا اس کے بس میں نہ تھا۔ گنا بیگم کو ملک قاسم سے بیاہ کر وہ اس غم سے نجات پانے والی تھی جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ گردشِ ایام کے کسی مرحلہ پر گنا بیگم کی شاہجہان آباد واپسی اور عمادالملک کے دل میں اس کے لئے محبت کی خوابیدہ چنگاری کے شعلہ بن جانے کا غم۔ اس غم سے نجات اس کے لئے ابدی خوشی تھی مگر یہ احساس بھی تھا کہ اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں میں پلی اور اقتدار کی اعلیٰ ترین مسند کے نشہ سے آشنا گنا بیگم کو وہ راوی کے بیلے میں بانسری بجانے اور شکار کھیلنے والے نوجوان ملک قاسم سے بیاہ رہی ہے۔ دونوں کے ماضی اور مرتبہ میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس کا انجام بخیر ہو گا؟

اپنی ذاتی بہادری اور صلاحیتوں کی بناء پر قاسم نے تیمور شاہ کی فوج اور دربار میں قابل احترام مقام پیدا کر لیا تھا۔ بیگم نے اس کے اور گنا بیگم کے لئے اپنے نانا عبدالصمد خاں کی شاہانہ حویلی کے دامن میں ایک الگ

حویلی وقف کردی تھی۔ دنیاوی آسائش واحترام کے ان اسباب کے فراہم ہو جانے کے باوجود وہ گنا بیگم کو مظلوم اور معصوم سمجھتی تھی جسے عمادالملک کے گناہوں کی بہت سخت سزا بھگتنا پڑی تھی مگر اس خیال سے اس کا دل قرار پکڑ لیتا کہ قاسم گنا بیگم کی اپنی پسند تھا، اس کی ترغیب کا حسین جال اگرچہ اسی نے پھینکا تھا مگر گنا بیگم نے نئی زندگی کا نیا خواب خود دیکھا تھا۔

چک گورو میں سکھوں کی شکست فاش کے بعد سے موسم بدلنا شروع ہوا تو مسلسل بدلتا گیا۔ گرمی دم توڑ گئی، موسم سرما آیا اور بہار کو دیکھ کر پسپا ہو گیا۔ یہ وہ موسم تھا جب مغلانی بیگم کے بچپن اور جوانی کے موسموں میں ان کا والد ملک پور کے ڈھائے پر آ کر خیمہ زن ہو جاتا تھا اور دیہی زندگی اور سیر وشکار سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا اور وہ سب بہن بھائی سارا سال اس موسم کا انتظار کیا کرتے تھے۔ گزشتہ شام گھوڑے پر سوار وہ گنا بیگم کے ہمراہ دور تک دریا کے ڈھائے پر چلتی گئی تھی۔ بیلے اور ڈھائے کے درمیان دور تک گندم کی فصل لہلہا رہی تھی۔ سرسوں کے کھیتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کیسری رنگ کے ہزاروں لاکھوں پھول کورنش کے لئے جھک گئے ہیں۔ غروب آفتاب سے پہلے پرندے مل کر نغمہ شب گانے لگے تو گنا بیگم نے اپنا گھوڑا روک لیا تھا۔ اسے اس مسحور کن ماحول سے آشنائی نہ تھی۔ شاعرہ گنا بیگم کے چہرے پر سرسوں کی پھولوں کے سی تازگی دیکھ کر مغلانی بیگم کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے وہ کیمپ میں واپس آ گئی تھیں۔ شب رفتہ ملاحوں اور بچھی واسوں کی خواتین کیمپ میں ڈھولکی کی تھاپ پر شادی کے گیت گاتی رہی تھیں۔ دہلوی ثقافت سے آشنا گنا بیگم کے لئے پنجاب کی یہ لوک ثقافت بڑی دلچسپ تھی۔ وہ نئی زندگی کی منزل میں بڑے اعتماد سے داخل ہو رہی تھی۔ مغلانی بیگم نے غموں کی گٹھڑی ایک طرف رکھ دی اور موروں کی پکار کا جواب دینے کے لئے خیمے سے باہر کھلی ہوا میں آ گئی۔

***

مغلانی بیگم اب حکمران نہیں شاہ کی وظیفہ خوار تھی۔ دربار لاہور میں اس کا احترام کیا جاتا تھا لیکن دوآبہ جموں اور کشمیر کی جاگیر چھن جانے کا اسے بہت دکھ تھا اور وہ احمد شاہ ابدالی سے بدلہ لینے کے طریقے سوچتی رہتی تھی۔ تیمور شاہ اور جہان خان کو ناکام بنانے کے منصوبوں پر غور کرنے لگی تھی۔

شاہجہان آباد کے حالات پر نجیب الدولہ کی گرفت کمزور ہونے پر عمادالملک نے پھر سے مرہٹہ فوجیں شاہجہان آباد بلالی تھیں۔ آدینہ بیگ اپنے دونوں طرف کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور پنجاب سے افغانوں کو بھگانے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ مغلانی بیگم نے آدینہ بیگ سے اتحاد کا فیصلہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی سے بدلہ لینے کی ایک یہی صورت تھی۔

ایک صبح جب وہ اپنی نشست گاہ میں بیٹھی اسی منصوبہ کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی تو میاں خوش فہم نے طہماس خاں کی حاضری کی خواہش کی اطلاع دی۔ وہ طہماس خاں کو پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ اس نے جہان خان کا دامن زیادہ مضبوطی سے تھام لیا تھا لیکن افغان دربار تک طہماس خاں کی رسائی سے اسے افغانوں کی سوچ کا اندازہ ہو جاتا تھا، اس نے اجازت دے دی۔

"آج رات نواب معین الملک مغفور نے اپنے اس غلام کو خواب میں جو حکم دیا وہ حضور تک پہنچانے آیا ہوں"۔ طہماس خاں نے عرض کیا۔

بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ جواب نہیں دیا۔

"حضور کا یہ غلام شب رفتہ بھر حسب دستور حضور کے اقبال کی بلندی اور نواب معین الملک مغفور کی روح

کے لئے ایصال ثواب کی دعا کے بعد سویا تو خدائے بزرگ نے اس پر کرم خاص فرمایا اور خواب میں نواب مغفور کا روشن چہرہ دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی‘‘۔

بیگم پھر بھی خاموش رہی۔

’’حضور کا خادم ہر روز نواب مغفور کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے حاضری دیتا ہے‘‘۔ طہماس خاں بتاتا رہا۔ ’’شب رفتہ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب مغفور اپنی قبر کے سرہانے ایک چبوترے پر تشریف فرما ہیں، ان کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ بلند آواز میں حکم دے رہے ہیں ’’تیمور شاہ کو حاضر کرو، تیمور شاہ کو حاضر کرو‘‘۔

’’اور بھی کچھ فرمایا نواب مغفور نے؟‘‘ بیگم نے اس کی بات کاٹی۔

’’نواب مغفور کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں کمخواب کی سرخ قبا تھی۔ یہ غلام بھاگ کر نواب مغفور کے قدموں سے چمٹ گیا تو نواب مغفور نے وہ قبا اپنے اس غلام کو پہنا دی اور حکم دیا۔ ’’تیمور شاہ کو حاضر کرو‘‘۔ نواب مغفور کے چہرے پر ویسا ہی جلال تھا جیسا میدان جنگ میں ناراضی کے وقت ہوتا تھا‘‘۔

مغلانی بیگم کے چہرے پر خوشی کی لہریں نمودار ہوئیں، اس نے اسی وقت کمخواب کی سرخ رنگ کی قبا منگوائی اور طہماس خاں کو پہنا دی

طہماس خاں بیگم کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ ’’حضور کے اس خادم کی خواہش تھی کہ حضرت محمد غوث کے ہاتھ پر بیعت کرے مگر وہ خادم کے بیعت کرنے سے پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس خادم کو بہت دکھ ہوا۔ ایک شب حضرت مرحوم نے خواب میں دیدار دیا اور اس خاکسار کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بھانجے کے ہاتھ میں دے کر حکم دیا کہ اسے ہمارے فرزند سید عابد کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو کہ انہیں مرید کر لیں۔ اگلی صبح یہ مسکین شیرینی لے کر مسجد شاہ محمد غوث میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں اسی شکل صورت کے ایک بزرگ تشریف رکھتے ہیں جن کے ہاتھ میں حضرت نے اس مسکین کا ہاتھ دیا تھا۔ خادم نے شیرینی پیش کر کے مرید کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ توقف کرو۔ تھوڑی دیر میں ایک اور بزرگ تشریف لے آئے۔ جملہ حاضرین تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، یہ خادم بھی کھڑا ہو گیا۔ ان بزرگ نے اسی انداز میں میرا ہاتھ پکڑا جس انداز میں خواب میں سید محمد غوث نے پکڑا تھا اور نئے آنے والے بزرگ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ انہیں مرید کر لیں۔ یہ سید عابد تھے۔ انہوں نے بیعت کے بعد نصیحت فرمائی تھی کہ ہر نماز کے بعد ایک سو دفعہ درود شریف پڑھا کرو۔ اس روز سے حضور کا یہ خادم اس حکم پر کاربند ہے اور نواب مغفور کے مزار پر فاتحہ کے لئے باقاعدہ حاضری دیتا ہے‘‘۔

سید محمد غوث کے مقام و مرتبہ سے سب اہل لاہور واقف تھے۔ طہماس خاں کا خواب سن کر بیگم کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا، اس نے طہماس خاں کو انعام سے نواز کر حکم دیا کہ وہ باقاعدہ ان کے حضور حاضری دیا کرے۔

اگلے روز بیگم نے شیرینی اور تحائف کے خوان شاہ محمد غوث کی مسجد بھجوائے اور سرفراز خاں کے ذریعے تصدیق کرائی کہ واقعی طہماس خاں نے سید عابد کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہے۔

بیگم نے طہماس خاں کے خواب میں نواب معین الملک کو دیکھنے اور ان کی طرف سے تیمور شاہ کو حاضر کرنے کے حکم کی یہ تعبیر نکالی کہ پنجاب سے تیمور شاہ کی حکومت ختم ہونے والی ہے اور نواب معین الملک مرحوم افغانوں سے خوش نہیں ہیں۔

ایک روز جہان خان کو اطلاع ملی کہ بیگم کے اصطبل سے ان کے کچھ گھوڑے رات کے اندھیرے میں چوری ہو گئے ہیں۔ اس نے فوری طور پر عمال سرکار کو بیگم کے

پاس بھیجا جنہوں نے واپس آ کر بتایا کہ بیگم کا ایک ملازم خواجہ سرا محبت ان کے گھوڑے چوری کر لے گیا ہے اور بیگم نے اس کے پیچھے اپنے آدمی بھیجے ہیں۔ جہان خان کو کچھ شبہ گزرا اس نے ملک قاسم کو برق رفتار دستہ کے ساتھ خواجہ سرا کے تعاقب میں بھیجا اور اسے گھوڑوں سمیت پکڑ کر واپس لانے کا حکم دیا۔ اس خیال سے کہ بیگم کو شبہ نہ پڑ جائے اس نے اپنا افغان دستہ نہیں بھیجا تھا۔ ملک قاسم نے خواجہ سرا کو آدینہ بیگ کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے جالیا۔ خواجہ سرا کی جامہ تلاشی لی گئی تو اس سے آدینہ بیگ کے نام بیگم کا مراسلہ آمد ہوا جس میں طہماس خاں کے خواب اور نواب معین الملک کے تیمور شاہ کو حاضر کرنے کے حکم کا ذکر کرتے ہوئے بیگم نے لکھا تھا کہ پنجاب پر سے افغانوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے اس لئے آپ تیاریاں تیز کر دیں۔

ملک قاسم نے مراسلہ پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور خواجہ سرا کو حکم دیا کہ وہ جلد آدینہ بیگ کے پاس پہنچ جائے اور بتایا کہ جہان خان کے حکم کی وجہ سے اس کی تلاشی لینا اس پر لازم تھا ورنہ وہ بیگم عالیہ کے زیر احسان ہے اور ان کے مشن کو اپنا مشن سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو تاکید کی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ جہان خان سے وہ کہہ دیں گے کہ محبت فرار ہو گیا تھا اور وہ اسے پکڑ نہیں سکے تھے۔ گھوڑے بیگم کو واپس کر دیئے گئے اور ملک قاسم کے مشورہ پر بیگم نے اپنے ایک ملازم کو خواجہ سرا محبت کے شریک مشورہ ہونے کے الزام میں قید کر دیا تاکہ جہان خان کو یقین آ جائے کہ گھوڑے واقعی چوری ہوئے تھے۔

چند روز بعد بیگم نے اس ملازم کو گھر اور ملازمت سے نکال دیا اور ہدایت کی کہ وہ معین الملک کے مزار پر گوشہ نشین ہو جائے اور منہ بند رکھے، اسے وظیفہ ملتا رہے گا۔

آدینہ بیگ اس مشورہ پر بہت خوش ہوا اسے یقین آ گیا کہ مغلانی بیگم تیمور شاہ کے خلاف اس کا ساتھ دے گی۔

٭٭٭

مغلانی بیگم بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی، جہان خان نے آدینہ بیگ کے وکیل دلارام کو جیل میں بند کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جب تک آدینہ بیگ مالیہ کے بقایا جات ادا نہیں کرے گا اس کے وکیل کو رہا نہیں کیا جائے گا۔

جہان خان کی طرف سے چھ لاکھ کے بقایا جات ادا کرنے کے حکم پر آدینہ بیگ نے وہی پرانا نسخہ استعمال کیا تھا۔ ''فصل آنے سے پہلے قسط کی ادائیگی ممکن نہیں''۔

جہان خان آدینہ بیگ کے اس حربہ سے واقف تھا اسی لئے اس نے دلارام کو لاہور میں روک رکھا تھا۔ بیگم کو دلارام کی گرفتاری اور قید کی خبر پہنچی تو اس نے فوراً اس کی رہائی کی کوششیں شروع کر دیں اور جہان خان سے تحریری سفارش کی۔ جہان خان نے جواب دیا۔ ''حضور ہمارے لئے خواہر کے مرتبہ پر ہیں آپ اس جھگڑے میں نہ آئیں''۔

بیگم کو جہان خان کے جواب پر بہت غصہ تھا، وہ اس کے جواب کو اپنی توہین سمجھتی تھی، اس نے تیمور شاہ کو مراسلہ بھیجا کہ وہ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ کئی روز گزر گئے مگر تیمور شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے علم تھا کہ بیگم دلارام کی رہائی کی درخواست کرے گی، وہ اسے رہا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ادھر سے ناکام ہو کر بیگم نے آدینہ بیگ کے پاس ایلچی بھیجا کہ مالیہ کی رقم ادا کر کے فوراً دلارام کو رہا کراؤ مگر اس نے بھی نہ جواب دیا اور نہ روپیہ بھیجا۔ دلارام بیگم کا بھی مشیر اور مخبر تھا، اس کی قید سے اسے جہان خان اور تیمور شاہ کے خلاف اپنے منصوبہ پر عمل دشوار ہو گیا تھا۔

سرفراز خاں کمرے میں داخل ہو کر دست بستہ کھڑا ہو گیا، بیگم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم سمجھتے

ہیں تیمور شاہ کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی''۔

''حضور کا اندازہ ہمیشہ کی طرح درست ہے''۔ سرفراز خاں نے جواب دیا۔

''سواری تیار کرائیں، ہم خود تیمور شاہ کے پاس جانا چاہتے ہیں''۔ بیگم نے حکم دیا۔

''غلام گستاخی کے لئے معافی کا خواستگار ہے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان کی طرف سے اذن کا انتظار کرلیا جائے؟'' سرفراز خاں نے استدعا کی۔

''ہم ان کے اذن کے پابند نہیں، ہم نے پیغام بھجوا دیا ہے کہ ہم آرہے ہیں''۔ بیگم نے بتایا۔

''حضور کے جلوس میں اور کون کون شامل ہوگا؟'' سرفراز خاں نے پوچھا۔

''تمہارے اور محافظ دستہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جائے گا، ہمارے ساتھ''۔ بیگم نے فیصلہ سنادیا۔

''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ملک قاسم کو بھی حضور ساتھ شامل کرلیں؟''

''ہم نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کیا جائے''۔ بیگم نے ناراضگی سے کہا۔

سرفراز خاں نے سر جھکادیا۔

بیگم ملک قاسم کو زیادہ اہمیت دے کر گنا بیگم کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

تیمور شاہ کو بیگم کی آمد کا پیغام موصول ہوا تو انہوں نے سید رحیم خاں کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا اور ہدایت کی کہ بیگم کو احترام سے شاہ برج پہنچادیا جائے۔

تیمور شاہ دیگر بھاری مصروفیات ترک کرکے خود شاہ برج پہنچا اور بیگم سے اس سفر کی تکلیف گوارا کرنے کا سبب دریافت کیا۔

بیگم نے پنجاب کے حالات اور آدینہ بیگ کے تجربہ کی تفاصیل بیان کرکے کہا کہ نواب قمرالدین خان مرحوم وزیراعظم سلطنت مغلیہ کے وقت سے شاہجہان آباد اور لاہور کے سب حکمران آدینہ بیگ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اس مرحلہ میں جب ہر طرف سکھوں کی شورش بڑھ رہی ہے اسے برگشتہ کرنا مناسب نہیں۔ ضرورت اس کا تعاون حاصل کرنے کی ہے تاکہ اس شورش پر قابو پایا جاسکے۔ بیگم نے دلارام کو گرفتار کرنے کے جہان خان کے اقدام کو بچگانہ قرار دیا اور کہا کہ ایک بہن اور بادشاہ معظم کی دیرینہ خیرخواہ کی حیثیت سے وہ یہ بتانے آئی ہے کہ دلارام کو قید کرلینے سے رقم بھی نہیں ملے گی اور حالات بھی مزید خراب ہو جائیں گے۔ اس لئے آدینہ بیگ کو ساتھ ملانے اور سکھوں کے خلاف کارروائیوں میں شامل کرنے کے لئے لازم ہے کہ دلارام کو رہا کردیا جائے اور آدینہ بیگ کو رقم بھیجنے کی مہلت دی جائے۔

تیمور شاہ نے بیگم کے خلوص پر یقین کرلیا اور دلارام کو قید سے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

سید رحیم خاں کو بیگم کی کامیابی سے زیادہ تیمور شاہ پر اس کا اثر پسند نہیں آیا، اس نے جہان خان کو دلارام کی رہائی کے نقصانات سمجھائے۔ ''مغلانی بیگم نے حضور کے اختیارات کی توہین کی ہے، دلارام کی رہائی میں آپ کو فیصلہ کرنا تھا''۔

جہان خان کو بیگم کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا مگر وہ تیمور شاہ کے حکم کے سامنے مجبور تھا، اس نے دلارام پر نگران متعین کردیئے۔

جہان خان کی نگرانی کی سختی اور آدینہ بیگ کی طرف سے رقم نہ بھیجنے کی وجہ سے دلارام بہت پریشان رہنے لگا۔ اس پریشانی میں اس کے لئے امید کی واحد کرن مغلانی بیگم تھیں۔ اس نے بیگم کے حضور حاضر ہوکر منت کی کہ اسے جہان خان کے غضب سے نجات دلائی جائے اور خدشہ ظاہر کیا کہ جہان خان اسے جان سے مروادے گا۔

بیگم نے جہان خان سے کہا کہ وہ دلارام کی طرف سے ضامن بننے کو تیار ہیں اگر آدینہ بیگ نے چھ لاکھ روپیہ ادا نہ کیا تو وہ خود اپنے پاس سے ادا کر دیں گی۔

جہان خان کو روپے کی اشد ضرورت تھی اس نے بیگم کی ضمانت قبول کر لی مگر دلارام کے لاہور سے باہر جانے پر پابندی برقرار رکھی۔

دلارام نے آدینہ بیگ کو بہت خطوط لکھے مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب کافی انتظار کے باوجود آدینہ بیگ نے چھ لاکھ روپیہ نہ بھیجا تو بیگم نے آدینہ بیگ کو اپنے پاس سے ہیرے جواہر بھیجے اور کہا کہ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں تو وہ یہ ہیرے گروی رکھ کر کسی ساہوکار سے قرض لے کر جہان خاں کو چھ لاکھ روپیہ بھیج دے۔ بیگم کو ڈر تھا کہ جہان خان کو جلد رقم ادا نہ کی گئی تو وہ پھر سے دلارام کو قید کر دے گا۔

آدینہ بیگ نے بیگم کے اس مراسلہ کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور ہیرے اپنے پاس رکھ لئے۔

***

شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے، پہریدار فصیل اور برجوں میں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچ گئے تھے، دہلی دروازہ سے باہر نواب معین الملک کے مزار پر چراغ جلا کر خادم اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اسے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ غروب آفتاب کے بعد گھوڑسواروں کے اس طرف آنے سے وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ سکھ قوم نواب معین الملک کو اپنا قومی دشمن قرار دے چکی تھی اور کئی جتھے دار مرحوم کی قبر کی بے حرمتی کا حلف اٹھا چکے تھے۔ سواروں نے مزار کے عقب میں گھوڑے روک لئے، آسمان پر چاند اور زمین پر اس کی چاندنی کا راج تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے ایک سایہ برآمد ہوا تو خادم اور بھی سہم گیا۔ گھوڑسوار خاموش رہے۔ ''دلارام'' خادم نے رات کی خاموشی میں سائے کی آواز سنی۔ سواروں نے آگے بڑھ کر سائے کو اٹھایا اور اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کر کے فرار ہو گئے۔ خادم تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھی نے اندازہ کیا کہ کوئی خلاف معمول واقعہ پیش آیا ہے۔

''مغفور نے چراغوں میں تیل کم ڈالنے پر ڈانٹ تو نہیں پلا دی''۔ اس نے مذاقاً پوچھا۔

''نواب مغفور کا سایہ گھوڑسوار اٹھا لے گئے ہیں''۔ پریشان خادم نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم سائے کے لئے اتنے فکرمند ہو رہے ہو، کوئی بات نہیں نواب صاحب کا جسم تو محفوظ ہے''۔

''میں تو اس لئے پریشان ہوں کہ نواب مغفور عمر بھر کفار کے خلاف جہاد کرتے رہے اور ان کا سایہ ہندو ہو گیا''۔

''آج تم ہندو سایہ دیکھ آئے ہو کل کو کوئی سکھ دکھائی دینے آ جائے گا، بات تو واقعی پریشان کن ہے''۔

اس نے اپنے ساتھی کو گھوڑسواروں کی آمد مزار کے عقب سے سائے کے نمودار ہونے اور ''دلارام'' کہہ کر گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ فرار ہو جانے کا سارا واقعہ سنایا تو اس کا ساتھی چونک پڑا۔ ''تمہیں معلوم ہے دلارام کون ہے؟''

''میں تو آپ کو بتا چکا ہوں کہ دلارام نواب معین الملک میر منو مغفور کا سایہ ہے''۔

''نواب معین الملک کا سایہ نہیں آدینہ بیگ کا سایہ ہے جو تیمور شاہ کے پیچھے لگا رہتا تھا اور نواب مغفور کی بیگم نے اسے جہان خان کی قید سے رہا کروایا تھا، اس سائے کی تو افغان نگرانی کرتے تھے''۔

''نواب مغفور کی بیگم نے آدینہ بیگم کے سائے کو قید سے چھڑوایا اور نواب مغفور نے خود اسے تیمور شاہ کے

نگرانوں سے چھڑا دیا۔ بڑا خوش بخت معلوم ہوتا ہے وہ سایہ تو"۔

"اس کی خوش بختی کو چھوڑو اور اپنی بد بختی کا خیال کرو۔ اپنی آنکھوں کو قسم ولاؤ کہ انہوں نے آدینہ بیگ کا سایہ نہیں دیکھا۔ افغانوں کو پتہ چل گیا تو وہ تمہارے اندر سے دلارام برآمد کرنے بیٹھ جائیں گے"۔ اس کے ساتھی نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

پریشان حال خادم اور بھی پریشان ہو گیا۔ "پہلے لوگ سکھوں سے ڈرتے تھے اب تم افغانوں سے ڈرنے لگے ہو۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم بھی چپکے سے بھاگ جائیں کہیں؟"

"اگر روٹی کمانے کا کوئی اور بندوبست ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا"۔

"بھاگ تو جائیں مگر جائیں گے کہاں؟ شہر میں افغان راج ہے، دیہات میں سکھوں کی شاہی ہے، ڈر تو وہاں بھی رہے گا"۔

"تو پھر اللہ کا نام لو، لب سی کر اور آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ، اللہ بھلا کرے گا"۔ دوسرے خادم نے کمرے کا دیا بجھا دیا۔

***

سید رحیم خان کے لئے مغلانی بیگم سے بدلہ چکانے کا اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں ہو سکتا اس کے جاسوسوں نے مغلانی بیگم کے دلارام کو لاہور سے بھگانے کی تمام تفصیلات جمع کر لی تھیں۔ دلارام کی قید سے رہائی کے وقت سے اس نے بیگم اور دلارام کے ملازموں میں اپنے جاسوس شامل کر رکھے تھے۔ سورج کی آنکھ میں شعلے اٹھتے ہی وہ جہان خان کے حضور حاضر ہوا اور بیگم کے دلارام کو لاہور سے بھگا دینے کی ساری کہانی سنا دی۔

سورج کی آنکھ میں تو سرخی اتری تھی جہان خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بیگم کے گھوڑے اور چور پکڑ کر لانے کے بعد ملک قاسم نے اسے اس مراسلہ سے آگاہ کر دیا تھا جو خواجہ سرا محبت سے برآمد ہوا تھا۔ اس وقت سے اس نے بیگم پر نگرانی سخت کر دی تھی مگر اس انداز سے کہ بیگم کو شبہ بھی نہ ہوا اس کے باوجود بیگم نے انہیں مات کر دیا تھا۔ اس نے بیگم پر افغانی ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور فوراً تند خو افغان سواروں کا دستہ بیگم پورہ روانہ کر دیا اور اس کے کماندار کو حکم دیا کہ مغلانی بیگم کو زنجیریں پہنا کر اس کے روبرو پیش کیا جائے۔

"مغلانی بیگم نے بادشاہ معظم کے احسانات کا خیال کیا، نہ حضور کے کرم کا"۔ سید رحیم خان نے جلتی پر تیل ڈالنے کی کوشش کی۔

جہان خان نئے انداز میں سوچنے لگا۔ "اس میں ہم افغان بھی قصوروار ہیں جو مغلانی بیگم کو سمجھ نہ سکے"۔

"قصور نہیں حضور افغان رحم دل ہیں جنہوں نے میر منو کی بیوہ سمجھ کر ہمیشہ اس کی سرپرستی کی۔ یہ بادشاہ معظم کی عظمت تھی مگر بیگم نے ان کی عظمت سرپرستی اور شفقت کا یہ صلہ دیا کہ سلطان معظم کے باغی کے ساتھ سازش میں شریک ہو گئی"۔ رحیم خاں بہت ہوشیار تھا۔

"بیگم نے افغانوں کی شفقت دیکھی ہے، غضب نہیں دیکھا"۔ جہان خان غضبناک ہو گیا۔

بیگم پورہ سے افغان دستہ خالی واپس آ گیا بیگم طلوع آفتاب سے قبل حویلی سے کہیں چلی گئی تھی۔ عمال سرکار دن بھر لاہور میں بیگم کو تلاش کرتے رہے مگر اس کا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔ بیگم کی صاحبزادی اور ملازم سب حویلی میں موجود تھے انہوں نے بتایا کہ بیگم دو سواروں کے ہمراہ حویلی سے روانہ ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ دلارام کو بھگا لے جانے والے سواروں کے ہمراہ آدینہ بیگ کی طرف نہیں گئی ہو گی پھر وہ گئی کہاں؟ کسی کو کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

تیمور شاہ کو دلارام کے لاہور سے اور بیگم کے اپنی

حویلی سے فرار کی اطلاع دی گئی تو وہ بہت ناراض ہوا اسے احساس ہوا کہ اس نے جہان خاں کے مشورہ کے خلاف بیگم کی سفارش مان کر غلطی کی تھی اس لئے اس فرار کی زیادہ ذمہ داری خود اس پر ہے۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب تیمور شاہ اور جہان خان دونوں بیگم کے بارے میں سید رحیم خان کی رائے سے متفق ہو گئے تھے۔

سید رحیم خاں بہت خوش تھا بیگم کی تلاش میں سب سے زیادہ سرگرم وہی تھا۔ بیگم کو رسوا ہوتے دیکھنے کی اس کی خواہش پوری ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

جہان خان کے حکم پر بیگم کی حویلی پر افغان دستہ مقرر کر دیا گیا مگر کماندار کو ہدایت کی گئی کہ بیگم کی صاحبزادی اور ملازموں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

برق رفتار سواروں نے ملک پور سے واپس آ کر اطلاع دی کہ ملک سجاول کو شاہ ولی اللہ نے شاہجہان آباد طلب کر لیا ہے اور وہاں پر بیگم کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔

غروب آفتاب سے پہلے جہان خان نے ناظم لاہور کو طلب کیا اور حکم دیا کہ شہر کے دروازوں کی نگرانی سخت کر دی جائے اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جائے اس کا غضب آتش انتقام میں بدلنے لگا تھا۔ دن بھر کی تلاش اور ناکامی پر وہ عمال سرکار پر بھی شبہ کرنے لگا تھا قلعہ سے اپنی حویلی تک کے سفر میں اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گشت کرتا رہا۔ بیگم کی سازش دلارام کا فرار اور بیگم کی گمشدگی۔

حویلی کی ڈیوڑھی پر گھوڑا خادم کے حوالے کر کے وہ سر جھکائے سوچ میں کھویا ہوا آہستہ آہستہ زنانہ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک خواجہ سرا نے آہستہ سے کوئی خبر دی جہان خان کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

زنانہ میں داخل ہوتے ہی وہ غصہ سے چلایا تو مردانہ میں خدام نے کان اس کی آواز پر لگا دیئے اس کی مردانہ آواز کے بعد اندر زنانہ چیخیں بلند ہونے لگیں اس کے حرم کی آوازیں بھی اس میں شامل ہو گئی تھیں چند لمحے بعد ملازم کسی کو بازو سے کھینچتے ہوئے زنانہ سے باہر لے آئے اور ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں بند کر کے تالا لگا دیا۔

یہ مغلانی بیگم تھی سراسیمہ اور خوفزدہ وہ صبح شہر کے دروازے کھلتے ہی شہر کے اندر آ گئی تھی اور افغانوں کی تلاش کی خبر پا کر جہان خاں کے حرم میں پہنچ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے حرم اور حویلی میں جہان خان اس کے مقام و مرتبہ کا احترام کرے گا مگر جہان خان اسے اپنے گھر میں دیکھ کر اور بھی غضبناک ہو گیا اور اس کے نازک جسم پر گھوڑے کے چابک برسانے لگا۔

مغلانی بیگم کی پٹائی اور گرفتاری کی خبر جہان خان کی حویلی سے نکلی اور کوچہ و بازار سے ہوتی ہوئی ایک ایک گھر اور کٹیا میں پہنچ گئی لاہور کے امراء اور شرفاء کی اکثریت نے یہ خبر سن کر خوشی محسوس کی بعض نے اس پر دکھ کا اظہار کیا لیکن بیگم کی مدد اور رہائی کے لئے کسی نے بھی کچھ نہ کیا کوئی بھی کچھ نہیں آ کر سکتا تھا وہ جہان خان کے غضب سے بھی واقف تھے اور مغلانی بیگم کے جرم کی نوعیت سے بھی شہر میں کوئی بھی ایسے جرم کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

بیگم کی پٹائی اور قید پر سب سے زیادہ خوشی تو سید رحیم خاں کو ہونا تھی اس نے ایک طرح بیگم سے بھکاری خاں کے قتل کا بدلہ چکا دیا تھا اور دوسری طرف اس کے آقا آدینہ بیگ کی کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے تھے اس نے رات بھر جاگ کر مغلانی بیگم کی گرفتاری شہر اور افغان حکمرانوں کے حالات کے بارے میں بڑی تفصیل سے مراسلہ تیار کیا اور شہر کے دروازے کھلتے ہی سوداگروں کے بھیس میں سواروں کے ہاتھ آدینہ بیگ کو روانہ کر دیا۔

ملک قاسم کے لئے یہ صورت احوال بہت تکلیف دہ تھی اسے مغلانی بیگم اور آدینہ بیگ کی سازش کا بھی علم

تھا اور بیگم سے قدیم روابط کا احساس بھی۔
''اس آزمائش میں بیگم حضور کی مدد ہمارا فرض بنتا ہے''۔ اس نے ساری صورت حال کا جائزہ لے کر گنا بیگم کو قائل کرنے کی کوشش کی۔
''ہماری گردن ان کے احسان کے بوجھ سے جھک رہی ہے مگر اس اجنبی ملک اور شہر میں ہم بے بس ہیں''۔ گنا بیگم نے جواب دیا۔
''اگر آپ گوہر افروز بیگم کے نام ایک مراسلہ لکھ دیں اور مغلانی بیگم کے خاندان کی سلطنت مغلیہ کے لئے خدمات کے حوالہ سے اس خاندان کی عزت کے تحفظ میں مدد کو کہیں تو وہ ضرور تیمور شاہ کو بیگم کی رہائی پر آمادہ کر لیں گی''۔ ملک قاسم نے اسے سمجھایا۔
گنا بیگم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''ایسا مراسلہ لکھ کر ہمیں خوشی ہو گی مگر تیمور شاہ امور مملکت میں اپنی بیگم کی مداخلت پسند کرے گا ہمیں شبہ ہے''۔
''مجھے یقین ہے کہ گوہر افروز بیگم کی سفارش ٹالی نہیں جائے گی وہ شہنشاہ ہندوستان کی صاحبزادی بھی تو ہے''۔ قاسم نے کہا۔
''ٹھیک ہے، آپ مراسلہ پہنچانے کا انتظام کریں''۔ گنا بیگم نے اس کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔
تیمور شاہ کے حکم پر جہان خان نے اس شرط پر بیگم کو قید سے رہا کیا کہ وہ چھ لاکھ روپیہ زر ضمانت فوری ادا کر دے۔ جہان خان نے افغان دستہ کی نگرانی میں اسے بیگم پورہ روانہ کر دیا تاکہ وہ زر ضمانت ادا کر سکے۔ جب تک بیگم نے اپنے زیورات و جواہرات بیچ کر چھ لاکھ روپیہ ادا نہیں کر دیا تند خو افغان دستہ ان یک حویلی میں خیمہ زن رہا۔

****

سرفراز خاں بیگم کے حضور حاضری دے کر باہر آیا تو میاں خوش فہم نے جھک کر سلام کیا۔ ''آغا! کس بیگم حضور کی دعائیں قبول ہوں گی؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
''ہماری بیگم حضور کی یا گنا بیگم کی؟''
سرفراز خاں نے قدم روک لئے۔ ''میاں جس بیگم حضور کی دعاؤں کو آپ کی تائید حاصل ہو گی اس کی دعائیں قبول ہو جائیں گی''۔
''آغا! ہماری دعائیں تو دونوں کے ساتھ ہیں، ہم نے بیگم حضور اور ان کے خاندان کا نمک کھایا ہے اور گنا بیگم کو ہماری بیگم حضور نے بیٹی بتایا ہے''۔
''میاں دونوں بیگموں کی دعائیں تو قبول نہیں ہو سکتیں جس طرح ہوشیار پور میں آدینہ بیگ اور مراد خاں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں اسی طرح بیگم حضور اور گنا بیگم کی دعاؤں کے دستے ایک دوسرے سے متصادم ہیں میدان جنگ میں فتح تو ایک فریق کو ہی ہو سکتی ہے''۔ سرفراز خاں نے کہا۔
''مگر ہم تو دعا کرتے ہیں دونوں کی دعائیں قبول ہو جائیں، ہم تو دونوں کا بھلا چاہتے ہیں''۔
''تو پھر ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی دعا ہرگز قبول نہیں ہو گی''۔
''نہ، آغا! ایسا مت کہو''۔ میاں خوش فہم نے منت کی۔
''میں نہ بھی کہوں تو ایسا ہی ہو گا، ملک قاسم کا دستہ مراد خاں کی فوج میں شامل ہے اور گنا بیگم صاحبہ اس کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی ہیں، بیگم حضور کس کی کامیابی کے لئے دعا کر رہی ہیں، آپ خود جانتے ہیں''۔ سرفراز خاں نے جواب دیا۔
''نہ آغا! ہم کچھ نہیں جانتے''۔ میاں خوش فہم نے اسی انداز میں کہا۔ ''ہم تو خادم ہیں، بس یہ جانتے ہیں''۔
سرفراز خاں مسکرا دیا۔
''آغا! اپنے خادموں پر مسکرا کر انہیں شرمندہ تو نہ کریں''۔ میاں خوش فہم کہہ کر آگے نکل گیا۔

(جاری ہے)

جگ بیتی

ہمارے معاشرے کے مہذب ڈاکوؤں کی شرمناک داستان

☆ مولانا محمد افضل رحمانی
0314-4652230

آخری قسط

مہذب ڈاکو کا طریقہ واردات

مہذب ڈاکو کی معاونت اس کی ماں اور بہنیں کرتی ہیں وہ جب کسی لڑکی کو دیکھنے کے لئے جاتی ہیں تو اچھی طرح سے چھان بین کرتی ہیں۔ زمین کتنی ہے، باپ، بھائی کیا کام کرتے ہیں، مکان کیسے ہیں، کمروں میں جھانکتی پھرتی ہیں جہیز میں کون کون سا سامان بنا چکے ہیں، لڑکی والے بچھے چلے جاتے ہیں اونچی بات نہیں کرتے، لڑکی کا دل دھک دھک کرتا ہے، مہذب ڈاکو کی ماں، بہنیں کیا آئیں شیطان کی رشتہ دار آ گئیں وہ خرانٹ عورت جو کبھی خود بہو بن کر آئی تھی آج لڑکی کو اس انداز سے دیکھ رہی ہے جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ وہ غیر ملکی دورے پر گئے ہوئے سربراہ مملکت کی طرح پروٹوکول حاصل کرتی ہے۔ اس کی لڑکیاں آہستہ آہستہ لڑکی کے سراپا کے بارے میں تبصرے کر رہی ہیں۔

"باجو لڑکی کا قد کاٹھ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے ناک کی گھوڑی ذرا ٹیڑھی ہے، ویسے بھی چپٹا چپٹا سا ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے"۔ دوسری کہتی ہے۔

"باجو رنگ بھی اتنا صاف نہیں ہے دیکھو، ہاتھ پاؤں اور چہرے کے رنگ میں فرق صاف نظر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے چہرے پر بڑی ہوشیاری سے میک اپ کیا ہوا ہے۔ نہیں، یہ ہمارے بھائی کو سوٹ نہیں کرے گی۔ ویسے اگر جہیز میں گاڑی دے دیں تو کوئی بات نہیں ناک سے کون سا برتن کا کام لینا ہے، ہم بھائی کے ساتھ گاڑی میں سیر کے لئے جائیں گی اللہ قسم کتنا مزہ آئے گا"۔

"اور اگر گاڑی نہ دیں تو؟"

"پھر ہم نے اس چڑیل کا کیا کرنا ہے، ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی مل سکتی ہے بھائی کے لئے۔ لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے"۔

"بہنیں ذرا لڑکی کو تو ادھر بلائیں"۔ نو وارد نے لڑکی کی والدہ سے کہا۔ والدہ نے بیٹی کو آواز دی بیٹی ذرا ادھر آنا، لڑکی کی حالت ایسی ہوگئی جیسے مجرم کو حوالات سے نکال کر تھانہ انچارج کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ چھوئی موئی سی شرماتی، جھجکتی، ہمشیرۂ ملک الموت کے سامنے بیٹھ گئی۔

"بہن تم نے اسے کوئی تمیز نہیں سکھائی"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ہم اسے دیکھنے کے لئے آئے ہیں اور یہ سیدزادیوں کی طرح پردہ کئے ہوئے ہے"۔

"بس بچی ہے ذرا شرما گئی ہے"۔

"بہن میری بھی بچیاں ہیں لیکن میں نے ان کو یہ ٹریننگ نہیں دی یہ دقیانوسی باتیں اب ہمیں چھوڑ دینی چاہئیں"۔

"لیکن بہن جی ہم مسلمان بھی ہیں بچیوں کو شرم و حیا کی تعلیم دینی چاہئے"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں؟"

"نہیں بہن جی خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں ہے"۔

"چلیں چھوڑیں بیٹی کا جہیز وغیرہ تو تیار ہو چکا ہو گا؟"

"بس جی کچھ کرلیا ہے اور کچھ ابھی کر رہے ہیں"۔

"بہن جی یہ تو ضروری چیز ہے آپ ابھی تک پورا جہیز بھی تیار نہیں کرسکیں"۔

"بس جی کچھ حالات ہی اس قسم کے ہو گئے تھے"۔

"حالات کو نہیں دیکھتے بیٹی والوں کو تو اس کی فکر ہونی چاہئے آج کل تو جہیز میں گاڑی دینے کا رواج بھی ہوگیا ہے، گاڑی اگر نہ ہو تو کاٹھ کباڑ کا کسی نے کیا کرنا ہوتا ہے"۔

''ہاں بہن جی لیکن ہم گاڑی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں''۔

''تو پھر بٹھائے رکھنا بیٹی کو گھر پر ویسے خدا جانتا ہے مجھے تو ہرگز گاڑی وغیرہ کی خواہش نہیں ہے بس میرا بیٹا کہتا ہے کہ اگر جہیز میں گاڑی نہ آئے تو میری انسلٹ ہو گی لوگ کیا کہیں گے کہ اس کے سسرالی اتنے ہی گئے گزرے ہیں آخر میری بھی کوئی عزت ہے معاشرے میں ایک مقام ہے اور میری تو ایک مجبوری ہے میں اپنی جٹھانی کی لڑکی کا رشتہ لینے سے انکار کر چکی ہوں۔ اس نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ اچھا اب میں دیکھوں گی کہ تُو کب ایسی بہو لائے گی جو جہیز میں گاڑی لے کر آئے۔ اب خالی خولی بہو لے جانے سے تو میں رہی، میں نے اس کا طعنہ بھی تو دھونا ہے بہن جی ناک رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پھر وہ اٹھ کر چلی گئیں اور کسی دوسرے شکار کی تلاش میں بوکیر کتے کی طرح مصروف ہو گئیں۔

خرانٹ بوڑھی ساس

ایک خوف خدا سے عاری بڑھیا اپنی بیٹیوں کو دودھ دیتی لیکن بہو کو کھانے کے ساتھ صرف پانی دے دیتی، سب سے چھوٹی انصاف پسند لڑکی نے ایک دن ماں سے پوچھا، اماں بھابی کو بھی دودھ دیا کریں یہ بے انصافی ہے ہم تو سب دودھ پئیں اور بھابی اس سے محروم رہے۔ ماں نے جواب دیا دیکھ بیٹی یہ بھینسیں تیرے باپ کی ہیں اس کے باپ نے جو بھوری بھینس اس کے لئے بھیجی ہے یہ اس کا دودھ پئے۔ اس کے بے غیرت باپ کو شرم نہ آئی کہ بیٹی کے لئے ایک بھینس ہی بھیج دیتا۔

مجبور لڑکی نے جب یہ بات سنی تو خوف کے گھونٹ پی کر رہ گئی اسی دن اس کا بھائی ملنے کے لئے آیا تو تو بہن نے روتے ہوئے بھائی کو ساری بات بتا دی، بھائی نے باپ سے بات کی تو باپ تڑپ گیا اس کی پیاری بیٹی دودھ سے محروم تھی اپنے آڑھتی کے پاس گیا اور اگلی فصل پر ادھار پیسے لئے اور اگلے دن بھینس خرید کر بیٹی کو بھیج دی۔ اس طرح مہذب ڈاکو کے ساتھ اس کے معاون ماں باپ بہنیں واردات میں شامل ہوتے ہیں۔

جہیز یا وراثت

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا اسلام میں لڑکی کے لئے جہیز کا لانا کیا ضروری ہے اگر ضروری ہے تو اس کا کیا ثبوت ہے اور اگر نہیں تو اس کو اتنا ضروری کیوں سمجھ لیا گیا ہے۔

میں چونکہ عالم نہیں بلکہ طالب علم ہوں لیکن جہاں تک میرے محدود علم میں ہے وہ یہ ہے کہ جہیز کا اسلامی تعلیمات میں نام و نشان تک نہیں ہے۔ اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر بیٹیوں کو دیا کیا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لڑکیوں کو اسلام نے باقاعدہ طور پر والد کی جائداد میں حصہ دار بنایا ہے جس طرح لڑکا اپنے باپ کی جائداد کا وارث ہے اسی طرح لڑکی بھی اپنے باپ کی جائداد میں وارث اور حق دار ہے بلکہ وراثت کے معاملہ میں اسلام نے عورت کو خاص طور پر مدِنظر رکھا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشے کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

یاد رہے کہ وراثت کے اصول نسب اور نکاح اور ولا اور فرائض میں سہام کو چھ اوزان میں مقرر فرمایا گیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) نصف $\frac{1}{2}$ (2) $\frac{1}{4}$ (3) $\frac{1}{8}$

(4) $\frac{2}{3}$ (5) $\frac{1}{3}$ (6) $\frac{1}{6}$

(1) نصف کے حقدار پانچ ہیں: 1۔ شوہر ترکہ زوجہ سے اگر وہ بے اولاد تھی۔ ایک بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے عورت کی وہ جائیداد جو اس کو والد سے وراثت میں ملی ہے وہ اس کے خاوند کی ملکیت میں نہیں ہو گی، اصولی طور

پر جہیز پر بھی خاوند کے مالکانہ حقوق نہیں ہیں۔ جہیز اصولی طور پر عورت کی ملکیت ہی ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہیز دینے کی صورت میں لڑکی اپنے باپ کی جائداد میں پھر بھی اسی طرح حقدار ہوگی جو حصہ اسے اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ جہیز وراثت کو زائل نہیں کرتا۔ آج بعض والدین یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بیٹی کو جہیز دے دیا ہے لہٰذا اب اس کا جائداد میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ غلط سوچ ہے اور اگر وہ بیٹی کو اس کے حق سے محروم کریں گے تو اللہ کے ہاں پکڑ ہوگی۔

2- صلبی بیٹی جو تنہا ہو۔

3- یا پوتی

4- بہن اگر ایک ہو (ماں اور باپ سے)

5- ایک بہن جو باپ سے ہو جبکہ ماں باپ کا کوئی بیٹا نہ ہو۔

(2) ربع $\frac{1}{4}$ کے حقدار دو ہیں: 1- شوہر مع ولد زوجہ 2- زوجہ جس کی اولاد نہ ہو۔

(3) ثمن $\frac{1}{8}$ ثمن کی حقدار صرف عورت ہے اگر اس کی اولاد بھی ہو۔

(4) دو ثلث $\frac{2}{3}$ اس کے حقدار چار ہیں: 1- دو بیٹیاں یا زیادہ 2- یا پوتیاں 3- بہنیں جو ماں باپ سے ہوں 4- یا بہن جو باپ کی طرف سے ہو۔

(5) ایک ثلث $\frac{1}{3}$ اس کے حقدار تین ہیں: 1- ماں جبکہ میت کا ولد اور بھائی بہن نہ ہوں 2- ماں کی اولاد دو یا زائد کا جس میں ذکر وراثت برابر ہوں گے 3- دادا جبکہ میت کے بھائیوں کے ساتھ کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔

(6) ایک سدس اس کے حقدار سات ہیں: 1- باپ جبکہ میت کا ولد موجود ہو 2- ماں جبکہ میت کا ولد یا پوتا یا بھائی بہن ہوں 3- دادا، ولد میت کے ساتھ اور بہنوں کے ساتھ جبکہ کوئی صاحب فرض بھی شامل ہو 4- دادا یا دادیاں 5- ماں کی اولاد 6- پوتیاں صلبی بیٹی کے ساتھ 7- پھوپھیاں (سگی بہن کے ساتھ)

صاحب علم و فراست ذرا اس موٹی موٹی تقسیم پر جو علم فرائض کے متعلق ہے غور فرمائیں کہ عورت کو کسی بھی حالت میں محروم نہیں رکھا گیا خواہ وہ بیوی ہو، بہن ہو، ماں ہو، بیٹی ہو، پوتی ہو، پھوپھی ہو، حتیٰ کہ دادی تک کو وراثت میں شامل کیا گیا ہے۔

خاوند اپنی بیوی کی جائداد پر قابض نہیں ہو سکتا خواہ وہ جائداد اسے والد سے ترکے میں ملی ہو یا کسی کاروبار یا ملازمت کے نتیجے میں۔ ہاں البتہ عورت کی وفات کے بعد عورت کی جائداد سے $\frac{1}{4}$ کا حقدار ہے بشرطیکہ زوجہ سے اولاد ہو اور بیوی اولاد نہ ہونے کی صورت میں خاوند کی جائداد سے بھی $\frac{1}{4}$ کی مالک ہے جبکہ اولاد ہونے کی صورت میں $\frac{1}{8}$ کی۔

ہندوؤں میں جہیز کا رواج ضرور ہے کیونکہ ہندو مذہب لڑکیوں کو باپ کی جائداد میں حصہ دار نہیں ٹھہراتا ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی یہ قبیح رسم رواج پا گئی اور اس کے مضر اثرات معاشرے میں ایک ناسور کی طرح پھیل گئے۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق 70 لاکھ نوجوان بچیاں جہیز نہ ہونے اور مناسب رشتے نہ ملنے کی وجہ سے اپنی جوانی ماں باپ کے گھر گزارنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔

شرم تجھ کو مگر آتی نہیں!

مہذب ڈاکو تم مرد ہو کر ایک بے بس اور کمزور عورت کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔ جس بیڈ پر سوتے ہو وہ تمہاری بیوی لائی ہے، جس موٹر سائیکل یا کار پر سوار ہوتے ہو وہ عورت کا لایا ہوا ہے، گھڑی، موبائل، قیمتی سوٹ، سونے کی انگوٹھیاں اور لاکٹ پہن کر اتراتے پھرتے ہو کیا یہی تمہاری مردانگی ہے؟ کیا تم اپاہج ہو، لنگڑے لولے ہو جو بھیک منگوں کی طرح بیوی سے

مطالبے کرتے ہو، طلاق کی دھمکیاں دیتے ہو۔ تشدد پر اتر آتے ہو، وہ عورت جس نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا۔ ماں باپ کو کو چھوڑا، بہن بھائیوں کو چھوڑا، اپنے پیارے وطن کی فضاؤں اور ہواؤں کو چھوڑا، تم تو اپنے گھر، اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس ہی رہے۔ وہ جو بابل کے آنگن سے نکلی تو آسمان بھی تھرتھرا گیا۔ جو چوبارے کی چاروں دیواریں ہل گئیں، باپ نے جگر کا ٹکڑا بھی دیا، خون پسینے کی کمائی سے تنکا تنکا جوڑا ہوا اپنی زندگی کا کل اثاثہ بھی اور پھر اپنے سمدھی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ بھائی جی اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خدارا! کوئی مجھے بتائے لڑکی کے باپ نے کیا گناہ کیا ہے؟

الٹی گنگا

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ لڑکی کو جہیز دینا والد کے ذمے نہیں ہے بلکہ خاوند کے ذمے ہے۔ آیئے ایک بابرکت شادی کا احوال پڑھتے ہیں۔ باپ سیدالانبیاءؐ ہیں، دولہا شیر خدؑا دلہن خاتون جنتؓ۔ منگنی، بارات، نکاح، رخصتی کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔ ابھی میں جو روایت نقل کرنے والا ہوں یہ روایت بعض الفاظ کی کمی بیشی سے شیعہ سنی دونوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مندرجہ ذیل شیعی کتابوں میں یہ روایت دیکھی جا سکتی ہے۔

(1) امالی، شیخ ابو جعفر طوسی (2) مناقب خوارزمی
(3) مناقب ابن شہر آشوب (4) کشف الغمہ
(5) بحارالانوار، باقر مجلسی (6) جلاء العیون، مجلسی

سنی کتب میں بھی یہ روایات موجود ہیں بتغیر یسیر

(1) ذخائر العقبیٰ (2) ریاض النضرہ (3) مواہب الدنیہ بمع شرح زرقانی جلد ثانی۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے مجھے حکم فرمایا کہ اٹھو اور مصارف شادی کے لئے اپنی زرہ بیچ ڈالو۔ میں نے جا کر زرہ بیچ دی اور دام لا کر حضورؐ کے دامن میں ڈال دیئے۔ نہ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کتنے ہیں اور نہ میں نے خود بتلایا کہ اتنے درہم ہیں۔ پھر آپؐ نے بلالؓ کو بلا کر ایک مٹھی بھر کر دی کہ فاطمہ کے لئے خوشبو خرید کر لائے، پھر آپؐ نے دونوں ہاتھ بھر کر ابوبکرؓ کو دام دیئے کہ فاطمہؓ کے لئے سب کپڑے اور دیگر سامان جو درکار ہے وہ خرید کر لائیں۔ عمار بن یاسرؓ اور دیگر احباب کو ابوبکرؓ کے ساتھ روانہ کیا۔ پھر سب حضرات بازار میں پہنچے جس چیز کے خریدنے کا ارادہ کرتے تھے پہلے ابوبکرؓ کے سامنے پیش کرتے۔ اگر وہ اس چیز کا خریدنا درست تسلیم کرتے تو اسے خرید لیتے بس جو چیزیں انہوں نے اس وقت خریدیں وہ مندرجہ ذیل تھیں:

سات درہم کی ایک قمیص، چار درہم کی ایک اوڑھنی، ایک خیبری سیاہ چادر، ایک بنی ہوئی چارپائی، بستر کے دو گدے ایک گدا کھجور کی چھال سے بھرا ہوا تھا دوسرے گدے کی بھرائی بھیڑ کی اون سے کی گئی تھی، ایک صوف کا کپڑا تھا، ایک چمڑے کا مشکیزہ، دودھ کے لئے ایک لکڑی کا پیالہ، سبز قسم کا ایک گھڑا تھا، مٹی کے کوزے تھے، جب یہ تمام سامان خریدا گیا تو اس میں سے کچھ سامان ابوبکرؓ نے اٹھایا، باقی چیزیں باقی چیزیں دوسرے احباب نے اٹھالیں۔ حضور کی خدمت میں یہ سامان لا کر پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں میں لے کر ملاحظہ فرمایا اور دعا کے لئے یہ کلمات ارشاد فرمائے۔ ''اللہ تعالیٰ اس میں اہل بیت کے لئے برکت عطا فرمائے''۔ روایات کے سلسلے میں شیعہ، سنی کتب سے یہ روایت بھی ملتی ہے کہ حضرت علیؓ نے سامان جہیز کی خاطر اپنی زرہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کی تھی اور حضرت عثمانؓ نے یہ زرہ خرید کر قیمت ادا کر دی اور پھر یہی زرہ حضرتؓ کو واپس کر دی اس ہمدردانہ طرز عمل پر حضورؐ نے عثمانؓ

کے حق میں دعائے خیر کے کلمات ارشاد فرمائے۔

دعوتِ فکر

میں ہر انصاف پسند مسلمان مرد و عورت کو دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ وہ مندرجہ بالا روایات کو ایک دفعہ پھر پڑھیں اور سوچیں کہ جہیز کس کے خرچ پر بنا؟ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبی کریمؐ بوجہ غریب ہونے کے جہیز دے نہیں سکتے تھے تو یہ دو طرح سے غلط ہے، پہلی تو یہ ہے کہ آپ سردار کائنات ہیں خدا سے جو مانگتے مل جاتا آپ کا زہد اختیاری تھا اور اگر مادی اور دنیاوی نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت آپؐ بوجہ فتوحات اتنے غریب بھی نہیں تھے کہ خدانخواستہ ایک ضروری کام سے صرفِ نظر کرتے اور اپنی پیاری بیٹی کے حق میں کوتاہی کرتے حقیقت یہی ہے کہ آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں آپؐ کے ہر کام میں امت کے لئے سوائے فوائد اور آسانیوں کے اور کچھ نہیں جن کے لئے احد پہاڑ کو سونا بنانے کی آفر خدا کی طرف سے ہوئی تھی وہ اگر چاہتے تو بیٹی کو سونے میں تول کر علیؓ کو بخش دیتے لیکن امت کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی۔ ہاں البتہ ان روایات سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دولہا اگر غریب بھی ہو پھر بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی گھریلو ضروریات کا لازمی انتظام کرے اس وقت سیدنا علیؓ بالکل غریب تھے اور جب رسول اللہؐ نے علیؓ سے نکاح کے مصارف کے متعلق دریافت فرمایا تو آپ نے جواب دیا کہ میرے پاس دو اونٹ اور ایک زرہ ہے تو آپ نے فرمایا اونٹ رہنے دو جہاد کے کام آئیں گے لیکن زرہ بیچ دو کیونکہ جنگ تو زرہ کے بغیر بھی لڑی جا سکتی تھی۔ الٹی گنگا بہہ گئی نبی کریمؐ تو دولہا سے پوچھیں کہ تمہارے پاس کچھ ہے یا نہیں آج سسر سے سوال ہوتا ہے کہ بیٹی کو کیا دو گے۔

عقلِ سلیم بھی یہی چاہتی ہے

ماں باپ نے بیٹی کو جنا، پھر پالا پوسا، تعلیم دلائی، جوان کیا۔ اس کی عزت کی حفاظت کی لیکن وہ کسی کی امانت ہے۔ اب جب امانت لوٹانے کا وقت آئے تو کیا وہ شخص جس کی امانت کی حفاظت کا حق ادا کر دیا گیا وہ یہ مطالبہ بھی کرے کہ چونکہ تم نے میری امانت کی حفاظت کی ہے لہٰذا مجھے اب مال بھی چاہئے کیا دنیا کا کوئی قانون یہ کہتا ہے کہ اپنے محافظ، باڈی گارڈ، ملازم سے خدمت بھی کرائی جائے اور پھر اسے یہ کہا جائے کہ چونکہ تم نے میری خدمت کی ہے لہٰذا مجھے تنخواہ بھی دو۔ کیا کبھی کسی سر پھرے نے اپنی باورچن، دھوبن، ملازمہ سے خدمت کے عوض رقم وصول کرنے کی ضد بھی کی ہے کہ چونکہ تم میرا کھانا پکاتی ہو، کپڑے دھوتی ہو، گھر کی صفائی کرتی ہو لہٰذا مجھے روپے بھی دیا کرو۔ کیا کبھی کسی نے اشتہار دیا ہو کہ مجھے ایک عدد ملازمہ کی ضرورت ہے جو مجھے دس ہزار روپیہ ماہانہ بھی دیا کرے؟ جب ایسا نہیں ہے تو مہذب ڈاکو تم کس اصول، حق اور کلیے کے تحت بیوی یا اس کے والدین سے فرمائشیں کرتے اور توقعات رکھتے ہو۔

مجبوری کا نام شکریہ

چونکہ بیٹی ایک ایسی مظلوم جنس ہے کہ جسے گھر پر رکھا نہیں جا سکتا ورنہ تو وہ بیٹے سے پیاری بھی ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر خدمت گزار بھی۔ وہ میت کی مانند ہے جسے اگر وقت پر دفن نہ کیا جائے تو گل سڑ جاتی ہے آپ نے کبھی اندازہ لگایا کہ میت اور بیٹی میں کتنی مماثلت ہے۔ میت کو چارپائی پر ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں، بیٹی کو ڈولی میں، میت جب گھر سے اٹھائی جاتی ہے تو آہوں اور سسکیوں کے ساتھ، بیٹی جب گھر سے وداع کی جاتی ہے تو بھی آہوں اور آنسوؤں کے

ساتھ، میت کے لئے عزرائیل آتا ہے، بیٹی کے لئے داماد، دونوں کا کردار ملتا جلتا ہے۔ اسی لئے شعراء نے سفرِ آخرت کے لئے بیٹی کے سسرال جانے کو اپنے اشعار میں بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔

رنگا لے ناں چندری گندا لے ناں سیس
پھر کیا کرے گی اری دن کے دن
خبر نہیں سیاں پیا کب بلا لے
کھڑی منہ تکے گی اری دن کے دن

جب عزرائیل روح قبض کرنے کے لئے آ جاتا ہے تو پھر واپس نہیں جاتا، اسی طرح جب دولہا بارات لے کر آتا ہے تو وہ بھی خالی نہیں جاتا۔

عزرائیل کے سامنے بھی کسی کا بس نہیں چلتا، دولہا کے سامنے بھی باپ، بھائی بے بس ہو جاتے ہیں۔ وارث شاہ نے ہیر کے ڈولی چڑھنے کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں
مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے
مینوں رکھ لے بابلا ہیر آکھے
ڈولی گھت کہار نی لے چلے وے
میرا آکھیا کدی نہ موڑ دا سیں
اوہ سے بابل کتھے گئے چلے وے
تیری چھتر چھاویں رُکھ ہیٹھ بابل
چھٹ وانگ مسافراں بہہ چلے وے
دن چار نہ رج آرام پایا
دکھ درد مصیبتاں سہہ چلے وے
سانوں بولیا چالیاں معاف کرنا
پنج روز تیرے گھر رہ چلے وے

ان اشعار میں موت کا منظر سمجھ لیں یا بیٹی کی رخصتی کے وقت کا سماں، دونوں منظر ناموں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

شاید والدین کی اسی مجبوری کی وجہ سے مہذب ڈاکو اور اس کے معاونین ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور والدین مجبوری کا نام شکریہ سمجھ کر مہر بلب ہو جاتے ہیں۔

اصولی طور پر تو یہ چاہئے کہ داماد اپنے سسر کی خدمت کرے کیونکہ سسر اسے اپنے جگر کا ٹکڑا ہمیشہ کے لئے دے رہا ہے۔ جو اس کا عمر بھر کا ساتھی ہے جس سے اس کی آئندہ نسل چلے گی۔ باعثِ تسکین قلب بھی ہے، تنہائی کی ساتھی، دکھ درد میں حصہ دار، جس کی وجہ سے اسے نصف ایمان کی دولت مل گئی، جس کے ساتھ پیار و محبت نفلی عبادت کا ثواب اس پر مال خرچ کرنے سے صدقہ کا ثواب۔

ذرا سوچئے!

خدارا عقل سے کام لیں، کس دلیل، اصول، قانون، ضابطے اور کلیے کے تحت لڑکی والوں کو جہیز دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اُدھر تو زرہ بیچ کر اور سات سات اور دس دس سال تک بکریاں چروا کر اور دوسری خدمت کرا کے بیٹی کا رشتہ دیا جا رہا ہے ادھر لڑکی کے ساتھ زندگی بھر کا اثاثہ مانگا جاتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر مانگا جاتا ہے آخر کوئی تو بتا دے کہ لڑکی کے والد کو یہ سزا کس غلطی کی بنا پر دی جاتی ہے اس نے کون سا ایسا جرم کیا ہے کہ دُلہا تین چار سو طفیلیوں کو لے کر دندناتا ہوا برق و باد کی طرح آتا ہے اور شام سے پہلے گھر کا مکمل صفایا کرتا ہوا اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ کیا اس کے لئے کوئی قانون نہیں کہ تم نے دن کی روشنی میں وہ کام کیا ہے جو تمہارا اہم پیشہ رات کو کرتا ہے۔

بارات کی شرعی حیثیت

کم از کم میرے ناقص علم و فہم میں کوئی ایسی روایت

پڑھنے دیکھنے میں نہیں آئی جس سے بارات کے جواز کو ثابت کیا جاسکے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر کام کے جواز کے لئے ہمارے پاس اسوۂ پیمبرؐ موجود تھے۔ اب ہم اسوۂ پیغمبرؐ کے تحت دیکھتے ہیں کہ آیا موجودہ زمانے میں مروجہ بارات کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ہم سیدنا علیؓ کی شادی پر نظر دوڑاتے ہیں۔ شیعہ، سنی دونوں کی کتب میں روایات موجود ہیں بخوف طوالت صرف ایک ایک روایت پیش خدمت ہے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریمؐ کی خدمت میں موجود تھا۔ نبی کریمؐ پر وحی نازل ہوئی۔ نزول وحی کے بعد حضورؐ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ اے انسؓ تو جانتا ہے کہ صاحب العرش کی طرف سے جبرئیل کیا پیغام لایا ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا مجھے حکم ہوا ہے کہ فاطمہؓ کو علیؓ ابن ابی طالب کے ساتھ تزویج کردو۔ پس جاؤ میرے پاس ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ و طلحہؓ و زبیرؓ کو بلا لاؤ اور اتنی ہی تعداد میں انصار کو بھی بلاؤ۔ انسؓ کہتے ہیں میں چلا گیا اور ان سب حضرات کو حضورؐ کے پاس بلا کر لایا۔ جب حضورؐ کی خدمت میں یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو حضورؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ الحمدللہ الخ۔ خطبہ میں حمد و ثناء اور نکاح کی اہمیت بیان فرمائی پھر فرمایا میں سب حاضرین مجلس کو اس چیز کا گواہ اور شاہد قرار دیتا ہوں کہ میں نے فاطمہؓ کا علیؓ ابن ابی طالب کے ساتھ چارصد مثقال مہر کے عوض نکاح کر دیا ہے۔ (بحارالانوار ملا باقر مجلسی جلد عاشر صفحہ 37، 38)

ایک سنی روایت بھی ملاحظہ فرمالیں۔

انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے نبی کریمؐ نے فرمایا میری جانب سے جا کر ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و عبدالرحمٰن بن عوفؓ و سعد بن ابی وقاصؓ و طلحہؓ و زبیرؓ اور چند انصار کو بلا لاؤ۔ انسؓ ان تمام حضرات کو بلا لائے جب یہ سب حضرات حاضر خدمت ہو کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور حضرت علیؓ حضورؐ کے فرمان کے مطابق کسی کام کے لئے گھر سے باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے، نبی کریمؐ نے خطبہ نکاح شروع فرمایا۔ خطبہ ہذا کے دوران فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہؓ کا علیؓ ابن ابی طالب سے نکاح کر دوں۔ پس تم لوگ اس چیز کے گواہ اور شاہد ہو جاؤ کہ میں نے فاطمہؓ، علیؓ کو نکاح کر کے دے دی ہے اور چارصد مثقال مہر مقرر کیا ہے۔ پھر کھجور کا تھال منگوا کر سب کے سامنے رکھ دیا پھر فرمایا کہ اس کو لوٹ لو اور آپس میں جھپٹ کر کھاؤ تو ہم جھپٹ، چھین کر کھانے لگے اسی اثنا میں علیؓ کام سے واپس تشریف لائے تو نبی کریمؐ نے علیؓ کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور مسکرائے اور پھر فرمایا۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ سے چارصد مثقال کے عوض تیرا نکاح کر دوں کیا تم اس چیز پر راضی ہو تو حضرت علیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ میں راضی ہوں اور یہ مجھے منظور ہے۔

(ذخائر العقبیٰ لمحب الدین طبری، احمد بن عبداللہ، المتوفی 694ھ صفحہ 30)

اگر تفصیلات پڑھنی ہوں تو دیکھئے ''مواہب الدنیہ للقسطلانی بمع شرح زرقانی جلد ثانی صفحہ 2 تا 7) مندرجہ بالا روایات سے صرف یہ بات ثابت ہوئی کہ حضورؐ نے صرف چند صحابہ کو بلوایا۔ حضرت علیؓ کی طرف سے بارات وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور صحابہؓ کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو علیؓ اور سیدہ فاطمہ کی شادی کا گواہ بنایا جائے، خطبہ نکاح آپؐ نے خود پڑھا اور ایک تھال میں کچھ کھجوریں یا چھوہارے صحابہؓ کو کھانے کے لئے دیئے گئے اور یہ سب مہمان حضورؐ نے خود بلائے تھے۔ سیدنا علیؓ اپنی طرف سے ایک آدمی بھی لے کر نہیں آئے تھے۔

اب جو ہمارے ہاں دولہا میاں فوج ظفر موج کے ساتھ اور بینڈ باجوں کے ساتھ لڑکی والوں پر چڑھائی کرتے ہیں یا یہ ستم کرنا ان لوگوں نے کہاں سے سیکھا ہے۔

لڑکی والوں سے دعوتیں اڑانے کا انتہائی قبیح فعل کا جواز پیش کرنا ان کے ذمے ہے جو وہ قیامت کی دیواروں تک پیش نہیں کر سکتے اور بعض منہ پھٹ قسم کے لوگ لڑکی والوں سے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ذرا اچھا انتظام کرنا ہماری بے عزتی نہ کرا دینا گویا کسی کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں اور اپنی جھوٹی عزت وقار کو لڑکی والوں کی بربادی سے منسلک کر رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک قسم کی ہٹ دھرمی اور ڈاکہ زنی کے مترادف ہے کہ ایک جیتی جاگتی جان بھی لے جاؤ اور گھر کا سامان بھی لے جاؤ۔ یہ بارات والی رسم پرانے زمانے کے طاقتور قبیلوں اور کمزور بستیوں کے مکینوں کی سی ہے کہ ایک طاقتور قبیلہ کمزور قبیلہ کی آبادیوں پر چڑھائی کر دیتا تھا۔ سردار گھوڑے پر سوار ہوتا چند لوگ نقاروں پر چوٹ لگاتے اور باقی نبرد آزما ہوتے، حملہ آور مفتوح مردوں کو قتل کر دیتے جو عورتیں مردوں کے تخلیہ میں آ چکی ہوں ان کو ہلاک کر ڈالتے۔ کنواریوں کو لشکریوں میں بانٹ دیتے اور اس طرح فاتح بن کر لوٹتے۔

(صحیفہ قافیون باب 21 آیت، الغاشیہ 23)

شورش کاشمیری مرحوم کے الفاظ ہیں:

بظاہر عجیب سی بات ہے لیکن ایشیائی اقوام میں بارات کا جو طریقہ رائج ہے اس پر غور کرنے سے پتہ چلا ہے کہ شادی (بارات) اس عسکریت ہی کے ثقافتی ارتقاء کی ایک معاشرتی صورت ہے اور وہ زیور جو دلہنیں پہنتی ہیں ان عسکری فتح مندیوں ہی کی علامتیں ہیں ہتھکڑیوں کا بدل چوڑیاں ہیں یا کڑے، بیڑیوں کی جگہ پاؤں کی جھانجھنیں ہیں، طوق کی جگہ ہنسلی، مالا اور کنٹھا ہیں، نکیل کی جگہ نتھ اور بالیاں ہیں، اب بھی قیدی عورتوں کی جو صدیوں پرانی تصویریں جو دیکھنے میں آئی ہیں ان سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔

(''اس بازار میں'' صفحہ 33، 34)

اگر شورش مرحوم کے ان الفاظ سے اتفاق کیا جائے تو جو نقشہ ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ کافی حد تک ہماری مروجہ رسم بارات سے ملتا جلتا ہے۔ فوج کے ساتھ آئے کھایا پیا، مزے اڑائے، لڑکی کو کار میں ڈالا، ڈھیروں سامان لوٹا اور رفو چکر ہو گئے۔

بارات مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نظر میں:

اب بارات روانہ ہوتی ہے، یہ بارات بھی شادی کا بڑا رکن سمجھی جاتی ہے اور اس کے لئے دولہا والے کبھی دولہن والے بڑے بڑے اصرار و تکرار کرتے ہیں۔ غرض اصلی اس سے محض ناموری اور تفاخر ہے اور کچھ نہیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت جبکہ راہوں میں امن جنہیں تھا اکثر قزاقوں اور ڈاکوؤں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، دولہا، دولہن اور اسباب وغیرہ کی حفاظت کے لئے اس وقت یہ رسم ایجاد ہوئی ہوگی۔ اسی وجہ سے گھر پیچھے ایک آدمی ضرور جایا کرتا تھا مگر اب تو نہ وہ ضرورت باقی رہی نہ کوئی مصلحت، صرف افتخار و اشتہاد باقی رہ گیا پھر اکثر اس میں ایسا بھی کرتے ہیں کہ بلائے پچاس اور جا پہنچے سو، اوّل تو بے بلائے اس طرح کسی کے گھر جانا حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص دعوت میں بے بلائے جائے وہ گیا تو چور ہو کر اور نکلا وہاں سے لٹیرا ہو کر (رواہ ابو داؤد و مشکوٰۃ شریف صفحہ 278) یعنی ایسا گناہ ہوتا ہے جیسے چوری اور لوٹ مار کا۔ پھر دوسرے شخص کی بے آبروئی بھی ہو جاتی ہے کسی کو رسوا کرنا یہ دوسرا گناہ ہے۔ پھر ان باتوں کی وجہ سے اکثر جانبین سے ایسی ضدا صدی اور بے لطفی ہو جاتی ہے کہ عمر بھر اس کا اثر دلوں میں باقی رہتا ہے چونکہ اتفاقی حرام ہے۔ اس لئے جن باتوں سے نا اتفاقی پڑے وہ بھی حرام ہوں گی اس لئے یہ فضول رسوم ہرگز جائز نہیں۔ (بہشتی زیور حصہ ششم صفحہ 24)

رسم ملنی

چونکہ شادی میں زیادہ تر رسمیں لڑکی والوں سے مال

بٹورنے کے اردگرد ہی گھومتی ہیں انہی میں سے ایک رسم ملنی بھی ہے۔ جب بارات لڑکی والوں کے گھر پہنچتی ہے تو دونوں جانب سے یعنی دولہا کی طرف سے اس کا باپ اور دلہن کی طرف سے اس کا باپ آپس میں گلے ملتے ہیں اس موقعہ پر دولہا کے والد کو کمبل اور سونے کی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں گلے ملنے کا تو صرف بہانہ ہی ہوتا ہے اصل مقصد دولہا کے والد کو نوازنا ہوتا ہے حالانکہ حدیث شریف کی رُو سے اگر کسی مرد نے کسی مرد کو سونا پہنایا تو گویا اس نے جہنم کی آگ کا ٹکڑا لیا لیکن یہاں جہنم کی کس کو پروا ہے بس لڑکی والوں سے جو ہاتھ لگے اسے شیر مادر سمجھ کر بغیر ڈکارے ہضم کر جاؤ ''گز ڈانگاں کپڑے چوراں دے''۔

حق مہر

حق مہر چونکہ لڑکی کا حق ہے حتیٰ کہ مہر معجل ادا نہ کرنے کی صورت میں لڑکی حقوق زوجیت سے انکار بھی کر سکتی ہے بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حق مہر کا کچھ حصہ لڑکی کا والد نکاح سے پہلے بھی اس غرض سے لے سکتا ہے کہ اس سے لڑکی کے لئے سامان جہیز تیار کرے۔

(دیکھیں فتاویٰ علماء دیوبند، جلد ہشتم کتاب النکاح صفحہ 162)

لیکن جب کچھ دینے کی باری آئی تو مہذب ڈاکو اور اس کے معاونین لوہے کے تھن بن جاتے ہیں اور ہم بوجہ لاعلمی کے خاموش تماشائی بن جاتے ہیں کیونکہ ہمیں حق مہر کی اہمیت وضرورت کا پتہ ہی نہیں ہے۔

عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ بنوخرندہ کی ایک عورت نے حق مہر میں جوتا لے کر نکاح کر لیا۔ رسول اللہؐ نے اس سے پوچھا کیا تُو خود کو اور اپنے مال کو جوتے کے بدلے دینے پر رضامند ہے اس نے اثبات میں جواب دیا تب آپؐ نے اس نکاح کو نافذ فرمایا۔ (ترمذی شریف) صاف ظاہر ہے کہ یہاں عورت کی اپنی مرضی تھی لیکن رسول اللہؐ نے اسے احساس دلایا تھا۔

ایک دلچسپ مکالمہ

مجھے اپنی ایک شاگرد بچی کا نکاح پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ لڑکی کے والد سے حق مہر کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگے جو آپ مناسب سمجھیں باندھ دیں۔ میں نے دولہا کے والد کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ بھائی صاحب آپ لڑکی کو حق مہر میں کتنی رقم دیں گے؟

جی جو شریعت نے مقرر کی ہے۔

دیکھیں محترم شریعت نے حق مہر میں کوئی رقم مقرر نہیں کی۔

تو پھر کتنا ہونا چاہئے؟

یہ تو آپ کی حیثیت پر منحصر ہے۔ میں نے کہا۔

یہ بات ہم نے صرف آپ سے سنی ہے ہمیں تو یہ پتہ ہے کہ شریعت میں حق مہر بتیس روپے اور چھ آنے ہوتا ہے۔

''یہ آپ کو کس نے بتایا؟

''جناب میرا اپنا جب نکاح ہوا تھا تو اتنا ہی حق مہر باندھا گیا تھا۔

چلیں اسی پر بات کر لیتے ہیں، جب آپ کا نکاح ہوا تھا اس وقت تو بتیس روپے میں بھینس خرید لی جاتی تھی جو آج کل ستر اسی ہزار سے کم نہیں آتی۔

قاری صاحب آپ چاہتے کیا ہیں؟

محترم میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا میں صرف حق مہر کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔

وہ تو میں نے بتا دیا کہ شریعت کے مطابق حق مہر باندھ دیں۔

میں نے عرض کر دیا ناں کہ شریعت میں کوئی مقدار

مقرر نہیں ہے اگر کوئی معین مقدار ہوتی تو میں باندھ دیتا۔
دوسرا آدمی: قاری صاحب اس میں جھگڑے والی بات کون سی ہے اگر کوئی مقدار معین نہیں تو چلو پانچ صد روپے باندھ دو۔
اس لڑکے کے حصے میں کتنی زمین آتی ہے؟ میں نے پوچھا۔
جی آٹھ ایکڑ۔
لڑکا کیا کرتا ہے؟
جی ملازم ہے۔
کتنی تنخواہ لیتا ہے؟
لڑکے کا والد بولا جی پچیس ہزار۔
تو پھر لڑکے کی حیثیت کے مطابق پانچ صد روپیہ حق مہر تھوڑا ہے۔
چلیں پھر آپ اپنی مرضی سے باندھ دیں۔
ٹھیک ہے ایک ماہ کی تنخواہ مبلغ پچیس ہزار کے عوض میں نکاح کر دیتا ہوں لیکن حق مہر معجل ہوگا۔
معجل کا کیا مطلب ہے؟
معجل کا مطلب ہے کہ ابھی ادا کرنا ہوگا۔
دولہا کے والد کا رنگ فق ہو گیا۔
لیکن اتنی بڑی رقم تو ہم نہیں دے سکتے۔ اس نے مریل سی آواز میں کہا۔
اچھا بینڈ والوں کو کیا دیا، گھوڑیوں والوں اور کو کیا دیا؟
آپ اس کو رہنے دیں آپ کا اس سے کیا تعلق؟
اچھا ٹھیک ہے اگر آپ نقد رقم نہیں دے سکتے تو کوئی زیور حق مہر میں لکھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا۔
قاری صاحب کیا یہ حق مہر اتنا ہی ضرور ہے جو آپ اتنی ضد کر رہے ہیں؟
ہاں بھائی صاحب اگر یہ ضروری نہ ہوتا میں دوسری بات بھی نہ کرتا۔ ایک آدمی مجھے ذرا پرے لے گیا اور میرے کان میں کہا قاری صاحب کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ زیورات کا اپنا ہے ہوسکتا کسی کا مانگ کر لائے ہوں۔
کیا یہ واقعی غریب ہے۔ میں نے پوچھا۔ اور پچیس ہزار روپیہ ادا کرنا ان کے لئے مشکل ہے؟
جی نہیں غریب تو نہیں ہیں پچیس ہزار سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں اس آدمی نے آہستہ آواز میں کہا۔
تو پھر آپ ان کو سمجھائیں دیر ہو رہی ہے۔ میں صورت حال کی نزاکت کو سمجھ گیا اگر میں زیادہ ضد کرتا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ لڑکی والوں کی پوزیشن نازک ہوتی ہے۔ میں لڑکے کے والد کے پاس آیا اور اس نے کہا ٹھیک ہے بھائی جی آپ خوشی سے جتنا حق مہر ادا کرنا چاہتے ہیں مجھے بتا دیں تاکہ نکاح پڑھا جائے۔ لڑکے کے والد کو کسی نے سمجھایا یا شاید اسے خود ہی ہوش آ گیا کہنے لگا قاری صاحب دس تولہ سونے کا زیور ہے اب آپ کی مرضی پر منحصر ہے جتنا چاہیں حق مہر باندھ لیں چنانچہ 10 تولہ سونے کے عوض میں میں نے نکاح پڑھ لیا۔

حق مہر معجل یا غیر معجل (مؤجل)

معجل تو اسی وقت ادا کر دینا چاہئے لیکن مؤجل کا وقت طلاق یا موت ہے۔ اگر خاوند فوت ہو جائے تو اس کی جائداد میں سے مقررہ مقدار حق مہر بیوی کو ادا کیا جائے گا یا اگر بیوی سے میل ملاقات کے بعد کسی وقت طلاق دے دے تو مقررہ حق مہر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

اسلام عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا علمبردار

ہماری بہنیں اور بیٹیاں اپنے حقوق کی بات کرتی ہیں لیکن میرے خیال میں وہ اپنے حقوق سے واقف ہی

نہیں ہیں کیونکہ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے انہیں کیا کیا حقوق دیئے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ لاعلمی ہے کیونکہ جو کچھ انہیں پڑھایا جارہا ہے وہ علم نہیں ہنر ہے یہی حال بچوں کا بھی ہے۔ آپ نے حساب پڑھا تو حساب دان ہوئے، سائنس پڑھی تو سائنسدان بن گئے، انجینئرنگ میں ڈگری لی تو انجینئر بن گئے، سیاست پڑھی تو سیاستدان بن گئے۔ کیا آپ ایم اے انگلش کو عالم کہہ سکتے ہیں؟ عالم اسے ہی کہیں گے جو علم پڑھے گا اور وہ علم ہے قرآن و حدیث کا۔ آپ بے شک کتنی ڈگریاں حاصل کرلیں لیکن آپ کو عالم نہیں کہا جائے گا۔ مروجہ تعلیم سے آپ ڈاکٹر تو بن گئے عالم نہیں اور ظاہر ہے طب ایک فن ہے۔ آپ نے نرسنگ کا کورس کیا نرسنگ کا فن آگیا تو یہ تعلیم ایک فن ہے۔ ہنر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ یہ علوم نہ پڑھیں، پڑھتے جائیں یہ تمام علوم مسلمانوں کی گم گشتہ میراث ہیں ان سے آپ کو روزگار ملے گا، ہنر ملے گا۔ مادیت میں ترقی ہوگی آپ پر دنیا کے حقائق منکشف ہوں گے۔

لیکن اگر آپ چاہیں کہ اخلاص، صدق، انابت، محبت، توبہ، تذکر، ورع، زہد، اخبات، تبتل، خوف ورجا، رغبت، تعظیم، تصفیہ وتہذیب، استقامت، صبر، تفویض، ثقہ، تسلیم، تواضع، فقر وغنی، تاسف وحزن، حیا، ریا، شکر، ایثار، مروت، ادب، اُنس، ذکر، علم، حکمت، تعظیم، غیرت، مکاشفہ، حیات بالعلم، حیات بالوجود، معرفت، یقین، صدق، مسئلہ، عرفان صمدانی، مسئلہ صفات ربانی، مسئلہ وجود وشہود، مسئلہ بقائے روح وارتقاء روح، ماہیت نجات، کیفیت رضوان، امتیاز خالق ومخلوق، فرق رازق و مرزوق، مسئلہ شفاعت واعمال، مسئلہ جزا وسزا، مدارج صبر وشکر، منازل توکل وتفویض، مہابت عبادت و ستعانت، روحانیت اُنس ومحبت، مسئلہ گناہ وحقیقت توبہ مراتب دعا وقبولیت، طلاق وو راثت، حقوق اولاد، حقوق والدین، حقوق زوجین، حقوق پڑوسی، حقوق جسم، حقوق انسانیت، حقوق عمران، محارم، شفعہ، حقوق قوم شوریٰ و امارت، ماہیت فساد وفیوض امن، راعی ورعیت کے حقوق اور فرائض وآئین واستبداد وغیرہ تو آپ کو صرف قرآنی علوم سے ملیں گے یا رسول اللہؐ کے دہن اقدس سے نکلے ہوئے موتیوں میں اگر آپ مندرجہ بالا عنوانات پر حصہ بقدر جثہ عبور حاصل کرلیں گے تو آپ نے وہ علم سیکھا جس کو صحیح معنوں میں علم کہا جاسکتا ہے۔

اس سے ہٹ کر آپ جو پڑھیں وہ نالج ہے یا ہنر ہے یا پھر فن۔ اسی لئے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے چلے جارہے ہیں کہ اصلی علم تو پس پشت ڈال دیا اور اگر آپ کو حق مہر کی اہمیت وافادیت کا پتہ نہیں تو اس میں معاذ اللہ اللہ اور رسول اللہ کا کیا قصور؟ خدا اور رسول کو پکار پکار کر تمہیں اپنے حقوق کی طرف بلا رہے ہیں لڑکیوں کے حقوق دقرآن وسنت کے مطابق انہیں دینے کے لئے تیار نہیں ہو اور وہ خود بیچاری اپنے حقوق سے واقف نہیں ہیں کیونکہ آپ نے انہیں وہ علم سیکھنے ہی نہیں دیا جس میں ان کے حقوق کا ذکر ہے۔

مدینے کی ایک عورت اور سیدنا عمر فاروقؓ

چونکہ حق مہر لڑکی کو ادا کرنا ضروری ہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ مقدار کی کوئی حد نہیں لہٰذا لوگوں نے بڑے بڑے حق مہر باندھنے شروع کردیئے۔ چنانچہ عمر فاروقؓ نے اپنے دور حکومت میں ایک دفعہ فرمایا۔ عورتوں کو زیادہ مقدار میں حق مہر نہ دو اس لئے کہ اگر زیادہ دینے میں عزت کا باعث ہوتا اور اللہ کے ہاں پرہیزگاری کا کام ہوتا تو سب سے زیادہ اس کے مستحق نبیؐ ہوتے مجھے رسول اللہؐ کے بارے میں علم نہیں کہ آپؐ نے کسی عورت سے نکاح کرتے ہوئے یا اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کرتے ہوئے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر دیا ہو۔

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، داری، مشکوٰۃ جلد سوم باب الصداق حدیث نمبر 3204)

ایک عورت کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔ اے عمرؓ! تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ ہمارے مہر کو کم کرو۔ آپ یہ پابندی نہیں لگا سکتے جب کہ سورہ نساء میں اللہ پاک کا ارشاد ہے۔ ترجمہ: اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال (حق مہر میں) تو مت واپس لو اس میں سے کچھ کیا لینا چاہتے ہو تم ناحق اور صریح گناہ سے۔ (سورۃ نساء آیت 20) اس آیت مبارکہ میں چونکہ لفظ قنطار آیا ہے جس کا معنی خانہ ہے یعنی بہت سا مال تو اس عورت نے اسی لفظ سے استدلال کیا کیونکہ وہ عورت علم والی تھی اور اپنے حقوق سے واقف۔ جب سیدنا عمرؓ نے عورت کی زبان سے قرآن کی آیت سنی تو فرمایا۔ ایک عورت مجھ پر غالب آ گئی۔ اے اللہ مجھے معاف فرما۔ سب لوگ عمرؓ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ بعد ازاں عمرؓ واپس آئے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اے لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ حق مہر دینے سے روکا تھا اب میں اعلان کرتا ہوں کہ تم لوگ جس قدر چاہو حق مہر دو۔

(تنقیح الرواۃ جلد 3 صفحہ 21) بحوالہ مشکوٰۃ جلد سوم)

مہر فاطمی

یہ تو واضح ہو چکا کہ حق مہر کی کوئی مقدار معین نہیں اب ہم سیدنا عمر فاروقؓ کے اس فرمان کے تحت کہ نبیؐ نے اپنے نکاحوں اور اپنی بیٹیوں کے نکاحوں میں 12 اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں باندھا۔ دیکھتے ہیں کہ 12 اوقیہ کی مالیت ہمارے زمانے میں کتنی ہے۔ بعض روایات میں ساڑھے اوقیہ بھی آیا ہے۔ اس حساب سے ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے مہر فاطمیؓ ایک سو اکتیس تولہ اور تین ماشہ وزن کی چاندی ہے، جس کی قیمت کا اس وقت کا اعتبار ہوگا جب مہر ادا کیا جائے۔ مقدار درہم تین ماشہ ایک رتی اور ایک رتی کا پانچواں حصہ ہے۔ چونکہ حد سے زیادہ حق مہر باندھنا محض نمود و نمائش کی وجہ سے جبکہ نیت ادا کرنے کی نہ ہو سخت گناہ ہے لہٰذا حق مہر فاطمیؓ باندھ دینا چاہئے لیکن اس میں بھی ایک شرط ہے کہ ولی اور لڑکی کی پوری رضامندی ہونی چاہئے اس معاملہ میں لڑکی پر جبر کرنا درست نہیں اگر وہ اس سے زیادہ حق مہر لینا چاہتی ہو تو اس پر کوئی پابندی یا جبر نہیں ہے۔ حق مہر فاطمی کی مقدار آج کل کے حساب سے ایک لاکھ پانچ ہزار تقریباً بنتی ہے۔ چاندی کی قیمت آٹھ سو روپیہ فی تولہ ہے اور یہ وہ حق مہر ہے جس کو سیدنا عمر فاروقؓ نے زیادہ نہیں جانا۔

ہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ دولہا کی مالی حیثیت کو بھی پیش نظر ضرور رکھنا چاہئے اور اس کی حیثیت سے زیادہ حق مہر کا مطالبہ بھی نہ کیا جائے۔ عرض کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم ایک ضروری چیز کو جو کہ لڑکی کا حق ہے نظر انداز کر دیتے ہیں اس طرح ہم لڑکی کے جائز حق سے اسے محروم کر دیتے ہیں اور یہ ایک قسم کا جبر ہے جو لڑکے والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حق مہر رسم نہیں بلکہ عورت کا شرعی حق ہے مگر افسوس ہے ہم شریعت کو پس پشت ڈال کر رسوم کو اپنا لیا ہے اور رسوم بھی ایسی ہیں جن سے لڑکی والوں کا کچومر نکل جاتا ہے اس طرح لڑکے والا فاتح اور لڑکی والے مفتوح بن جاتے ہیں۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟

مجھے بتائیں دولہا میاں اور اس کے والد صاحب اور دوسرے حوارین اور نکاح خواں حضرات کہ صرف پانچ صد روپیہ حق مہر وہ کس برتے پر ایک جیتی جاگتی جان جو انسان کی بچی ہے کوٹلی بھگت سے اچک لے جاتے ہیں جبکہ پانچ صد روپے میں ایک مرغی بھی نہیں آتی۔ کیا

تمہیں ایک کمزور لڑکی کا حق مارتے ہوئے خدا کا خوف نہیں آتا؟ لڑکی کے والد کی مجبوری تو میں سمجھتا ہوں وہ تو مارے ڈر کے زبان نہیں کھولتا وہ تو بیچارہ حالتِ اضطرار میں ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکل جائے جو مہذب ڈاکو کی طبع نازک پہ گراں گزرے اور میری عزت سر بازار نیلام نہ ہو جائیں اس کی مجبوری تو حق بجانب ہے لیکن دوسری طرف کون سی مجبوری ہے اگر وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تو گویا ایک مجبور آدمی کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اس طرح ڈبل گناہ کے مرتکب ہوئے۔

ایک یادگار واقعہ

یہ 1991ء کا واقعہ ہے۔ مجھے ایک دوست نے بہت مجبور کیا کہ خطبہ جمعہ ان کے قصبے میں دوں۔ میں چونکہ خطبہ جمعہ بہت کم کسی اور جگہ دیتا ہوں لہٰذا میں نے اسے کہا کہ کسی وقت رات کا پروگرام بنا لو۔ کہنے لگا جمعہ میں چونکہ زیادہ لوگ آتے ہیں اس لئے ایک جمعہ لازمی ہمیں دے دیں۔ اس نے مجبور کیا تو میں نے حامی بھر لی۔ جب میں ان کے ہاں پہنچا تو میں نے پوچھا کہ کس موضوع پر خطبہ دوں؟ کہنے لگا قاری صاحب اختلافی مسئلہ نہیں کرنا آپ سیدہ فاطمہؓ کی شادی پر اظہار خیال فرمائیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، وقت کی قلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے سیدہ کی منگنی، جہیز، بارات، حق مہر اور رخصتی کو موضوع سخن بنایا۔ میں نے دلائل سے ثابت کیا کہ جہیز دینا دولہا کا فرض ہے لڑکی کے والد کا نہیں۔ حق مہر کے متعلق بھی تفصیل بیان کی۔ منگنی، بارات اور رخصتی کے متعلق بھی مختلف کتب سے حوالے پیش کئے جن کا مختصر بیان آپ آگے پڑھ سکیں گے کچھ پیچھے آپ پڑھ آئے ہیں۔ جب رخصتی کا ذکر آیا تو سچی بات ہے میں خود بھی رویا اور سامعین بھی دل کھول کر روئے۔ وہ مری ماں والی سیدہ جب بابا کے گھر سے رخصت ہونے لگی تو گھر کے ایک کونے میں چلی گئی رسول اللہؐ نے ام ایمنؓ کو فرمایا کہ میری بیٹی کو لے کر آؤ۔ ازواج مطہرات کو فرمایا کہ میری بیٹی کی رخصتی کی تیاری کراؤ۔ یہ بات بیٹیوں والے جانتے ہیں کہ باپ کے گھر سے سسرال جانے کا وقت کتنا المناک اور درد میں ڈوبا ہوتا ہے۔ ام سلمہؓ کی زبان سے نکل گیا اے کاش! اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت آج خدیجۃ الکبریٰ بھی موجود ہوتیں تو وہ بھی اپنی بیٹی کے سر پر دستِ شفقت رکھتیں۔

بس سیدہ خدیجہ کا نام آنا تھا کہ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور تاجدار نبوت کے دل کا طوفان آنسوؤں کی شکل میں رخسار نبوت پر بہہ نکلا۔ پھر فرمایا ام سلمہؓ تم نے ٹھیک کہا ہے اس نے میرے لئے بہت مصائب برداشت کئے، اس نے اپنا تمام مال میرے لئے وقف کر دیا، اس نے سب سے پہلے میری نبوت کی تصدیق کی (عورتوں میں سے) کاش خدیجہ اس وقت زندہ ہوتیں انہیں دنیا سے جاتے وقت اپنی چہیتی بیٹی فاطمہؓ کا بہت خیال تھا وہ حسرت سے کہتی تھیں کہ میں اپنی بیٹی کی شادی نہیں دیکھ سکوں گی اور پھر وہ یہی حسرت لے کر فردوسِ بریں کو رخصت ہو گئیں۔ سیدہ فاطمہؓ کو ماں کی یاد نے بے قرار کر دیا آپ اس قدر روئیں کہ آپ کا آنچل بھیگ گیا اگرچہ امہات المومنین خصوصاً سیدہ عائشہؓ اور ام سلمہؓ نے خدمت اور پیار عطا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا مگر ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ ماں کی کمی کوئی دوسرا پوری نہیں کر سکتا۔ بیٹی کی رخصتی کے وقت ماں کی موجودگی کس قدر ضروری ہوتی ہے۔ اسے یا تو ماں جان سکتی ہے یا سسرال جانے والی بیٹی جان سکتی ہے۔ ماں بیٹی کے دل کی دھڑکنوں کا سکون ہوتی ہے۔ ماں بیٹی کے لئے جنت کی خوشبوؤں کا مہکتا ہوا گلدستہ ہوتی ہے۔ ماں کی یاد نے سیدہ کو غمگین کر دیا۔ رحمت عالم کا دل جوش میں آ گیا بیٹی کو سینے سے لگایا اور آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا۔

یَا فَاطِمَہ اللّٰہُ غَنِیٌ وَ اَنْتُم فُقَرَاء اے فاطمہ اللہ غنی ہے اور تم سب اس کے محتاج۔ بیٹی نہ رو۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

موضوع کو سمیٹتے ہوئے میں نے سامعین سے سوال کیا کہ کون ہے جو عہد کرے کہ سیدہ فاطمہؓ کی شادی کو مشعل راہ بنائے گا۔ الحمدللہ، 9 نوجوان کھڑے ہوئے اور انہوں نے عہد کیا کہ ہم بغیر جہیز کے شادی کریں گے اور سسرال والوں سے ایک پائی کا مطالبہ بھی نہیں کریں گے بلکہ ایک نوجوان نے کہا کہ میری شادی کی شرط ہی یہی ہوگی کہ میں جہیز کی مد میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔ پھر اس نوجوان نے اپنا وعدہ نبھایا۔ ایک غریب خاندان کی لڑکی کو بیاہ کر لایا پھر خدا نے اسے اتنی برکت دی کہ آج وہ شہر کے بہترین علاقے میں تین منزلہ مکان کا مالک ہے اور نچلے حصے میں اس کا ڈھلائی کا کاروبار ہے ذاتی مشینیں ہیں اور کئی کاریگر کام کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد آیا اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ بیوی کو حق مہر فاطمی ادا کروں گا۔

رسم مکلاوہ

بارات کے بعد لڑکی سسرال رخصت ہوگئی۔ رسم بارات اور رسم ملنی اور جہیز سے پیٹ نہیں بھرا، لوٹ مار کی ہوس ابھی تشنہ ہے چنانچہ دوسرے تیسرے دن فاتح ٹیم مزید کھلاڑیوں کو لے کر لڑکی والوں کے گھر پہنچ گئی۔ اب لڑکی والوں پر گویا فرض عین ہے کہ ہر ایک فرد کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، عورت ہو یا مرد ایک ایک کپڑوں کا جوڑا نذر کریں چنانچہ اس مقصد کے لئے لڑکے والے قریبی رشتہ داروں کے جھمگھٹے کو ساتھ لے کر آتے ہیں جن کی تعداد کا لڑکی والوں کو بعض دفعہ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ بعض مہربان از راہ کرم مہمانوں کی فہرست بھیج دیتے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ ذرا خیال رکھنا ہماری بے عزتی نہ ہو جائے، جوڑے ذرا اچھے بنوانا۔

میرے ذاتی علم میں یہ واقعہ ہے کہ ایک لڑکے کا باپ اس انداز سے مطالبہ کر رہا تھا جو بھکاریوں سے بھی گیا گزرا تھا وہ کہہ رہا تھا دیکھیں بھائی جی بچے کو لینے کے لئے میرے داماد اور لڑکیاں بھی ساتھ آئیں گی، انہیں خالی سر واپس نہ بھیج دینا۔ ذرا اُن کے سر ڈھانپ دینا دیسے میں کوشش کروں گا کہ ضروری ضروری لوگوں کو ہی بھیجوں اور جب وہ آئے تو ان کی تعداد پچاس سے اوپر تھی۔ جوڑے کم پڑ گئے۔ دن غروب ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی لڑکی کے والد نے کہا بھائی جی ٹائم کم ہے جن کے جوڑے رہ گئے ہیں وہ ہم بعد میں بھیج دیں گے۔ وہ جھٹ سے بولا۔ کوئی بات نہیں ہم انتظار کر لیتے ہیں، آپ کسی کو بھیج کر قریبی شہر سے منگوالیں۔ ڈھٹائی کی حد ہوگئی مجبور و بے بس لڑکی جننے کا مجرم شام کے بعد کپڑے لے کر آیا اور یوں مکلاوے کی رسم پوری ہوئی۔ اس سے پہلے بارات والے دن "جوڑا الوائی" کی رسم ادا کی گئی تھی جس میں دولہا کو قیمتی کپڑوں کے علاوہ قیمتی گھڑی، سونے کی انگوٹھی، میک اپ کا سامان، سونے کا چین، موبائل فون

> ## جواھر پارے
>
> ❁ زندگی میں کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے آپ کو پچھتانا پڑے کیونکہ پچھتاوا ایسا سایہ ہے جو زندگی بھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔
>
> ❁ خدا سے مانگنا دانشمندی ہے، دے دے تو رحمت، نہ دے تو حکمت۔ دنیا سے مانگنا ذلت ہے، دے دے تو احسان، نہ دے تو شرمندگی۔
>
> ❁ دوست اور دشمن میں فرق صرف اعتماد کا ہے۔ اگر اعتماد قائم ہے تو دشمن بھی دوست بن جاتا ہے۔ اگر اعتماد ٹوٹ جائے تو دوست بھی دشمن بن جاتا ہے۔
>
> (منیحہ عمران۔ بھولیر باجوہ، پسرور)

اور لڑکی کی سہیلیوں کی طرف سے بے شمار تحائف پیش کئے گئے تھے اور بطور سلامی ہزاروں روپے بھی لیکن بقول شاعر "کاسۂ چشم حریصاں پُر نہ شد" یعنی لالچی کی آنکھ کا پیالہ کبھی پُر نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ "تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شد" یعنی جب تک صدف بارش کے ایک قطرے پر قناعت نہیں کرے گی اس میں موتی نہیں بن سکتا۔

لیکن داماد ایک ایسا صدف ہے جس نے قناعت کا سبق پڑھا ہی نہیں اس کا موازنہ صرف جہنم سے کیا جا سکتا ہے جو اربوں کھربوں انسانوں کو لقمہ بنانے کے بعد بھی خدا تعالیٰ سے مطالبہ کرے گی: ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ ترجمہ: کیا کچھ اور بھی ہے؟

رسم تروینڈا

مکلاوے کے بعد کچھ دن سسرال رہ کر جب لڑکی واپس میکے آتی ہے تو پھر چند دن بعد دولہا اسے لینے کے لئے آتا ہے۔ اس دفعہ وہ اکیلا ہوتا ہے لہٰذا اسے دوبارہ چند جوڑے پیش کئے جاتے ہیں اور ایک ضروری آئٹم جس کو ہمارے ہاں "بھاجی" کہتے ہیں جس میں کم از کم دس بیس کلو مٹھائی کا ہونا ضروری ہے۔ بعض منوں کے حساب سے بھی دیتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر بھاجی کی مقدار کم ہو تو ساس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور اس کا خمیازہ معصوم جان کو کوسنوں اور جلی کٹی باتوں کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

رسم وِیم

سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ سال ڈیڑھ سال بعد یا جب اللہ کو منظور ہو تو لڑکی کے ہاں پہلی بچی یا بچے کی پیدائش ہوتی ہے اب ایک دفعہ پھر لڑکی والوں کو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے اور نومولود اور بچی کے علاوہ گھر کے تمام افراد کے لئے جوڑے، گرم چادریں، سویٹر، موسم کے مطابق بنوا کر جس دن عقیقہ ہو لازمی لے جانا پڑتے ہیں۔

رسم نانک والی

یہ سلسلہ صرف اپنی لڑکی تک ہی جاری نہیں رہتا بلکہ جب لڑکی کی اولاد جوان ہو جائے اور ان کی شادی کا وقت آئے تو اگر ماں باپ اس وقت تک فوت ہو چکے ہیں تو ان کی اولاد یعنی لڑکی کے بھائیوں کو نانک والی دینی پڑتی ہے گویا ایک نسل کھاتے ہوئے گزر گئی اب دوسری نسل کا بوجھ بھی لڑکی والوں کو اٹھانا ہے۔ اس وقت تک بھائیوں کی اپنی اولاد بھی جوان ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا بڑے بڑے امیر لوگوں کے لئے بھی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے لیکن کریں کیا "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن"۔

قصہ مختصر

جب لڑکی فوت ہو گئی تو اب کفن کا بھی انتظار کیا جا رہا ہے کہ لڑکی کے بھائی یا اگر بدقسمت باپ زندہ ہے تو اس کا کفن لے کر آئے کہ لڑکی کے فوت ہونے پر کفن دینا بھی میکے والوں کا فرض ہے۔ یہ مہذب ڈاکو ایسا پیچھے لگا کہ مر کر بھی اس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا۔

شکرانہ

ایک مظلوم لڑکی کا والد جسے اس کے داماد نے آئے دن کی فرمائشوں سے ساری عمر تنگ کئے رکھا لڑکی پر تشدد کرتا، مار پیٹ کر کے میکے بھیج دیتا، نہ پہننے کے لئے ڈھنگ کا لباس، نہ کھانے کے لئے اچھی خوراک، لڑکی کو مختلف بیماریوں نے آ گھیرا اور وہ پھر ایک دن چپکے سے خالق حقیقی کے پاس چلی گئی، میکے اطلاع بھیجی گئی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ والد بھی آیا اس کی آنکھوں میں

آنسو تھے بیٹی کی لاش کے سرہانے کھڑا ہو کر خدا کے حضور جھولی پھیلا دی اور ہچکیوں اور آہوں کے درمیان کہنے لگا۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہے''۔ واہ رے مہذب ڈاکو جواں سال بیٹی کی مرگ پر تُو نے بوڑھے باپ کے منہ سے شکرانے کے الفاظ کہلا دیئے۔ تف ہے تیری زندگی پر اور اور اس کی ماں کی زندگی پر جس نے تجھ جیسا ظالم جنا۔

سب سے آسان کام

اسلام میں شادی کرنا سب سے آسان کام ہے۔ کوئی لڑکی پسند آ گئی، رشتہ مانگا، لڑکی کے والدین نے لڑکی کی رضامندی معلوم کرنے کے بعد رشتہ دے دیا۔ حسب استطاعت حق مہر مقرر ہوا۔ نکاح خواں نے نکاح پڑھ دیا بس شادی ہو گئی اس کے علاوہ سب فضولیات ہیں۔ شادی پر جو تھوڑا بہت خرچ آئے وہ لڑکے کے ذمہ ہے۔ لڑکی والوں کے ذمہ کچھ نہیں ہے۔

دن مقرر کرنے کی رسم

یہاں بھی وہی ستم ہے کہ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے لڑکی والوں کے گھر آتے ہیں، اس موقعہ پر بھی لڑکی والے جوڑوں کا انتظام کرتے ہیں۔ کیا یہ تاریخ لڑکے والوں کے گھر مقرر نہیں ہو سکتی؟ براہ کرم مجھے بتایا جائے کہ کون سا آسمان گر جائے گا اگر تاریخ مقرر کرنے کے لئے لڑکے والوں کے گھر کا انتخاب کیا جائے کتنی تکنیک اور بے حیائی سے یہ رسوم بنائی گئی ہیں کہ ہر حال میں لڑکی والے ہی بوجھ برداشت کریں اور لڑکے والے صاف بچ جائیں۔ اسی لئے جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خدا کی رحمت کا استقبال آنسوؤں اور آہوں سے کیا جاتا ہے۔

استقبال دلہن اور رخصتی

ہمارے ہاں دولہے کو صدر مملکت سا پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی فوج ظفر موج کی لذیذ کھانوں سے اور ٹھنڈے میٹھے مشروبات سے تواضع کی جاتی ہے۔ سیدنا علیؓ کو کوئی گھوڑا اور جوڑا نہیں دیا گیا تھا، نہ ان کے ساتھ کوئی بارات تھی۔ صرف چند مہاجرین اور انصار کو حضورؐ نے مدعو کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ شادی کی تشہیر ہو جائے اور یہ کہ شادی کے گواہ بن جائیں اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ صرف چھوہاروں کا ایک تھال تھا جو مدعوئین نے کھائے۔ ہاں البتہ دلہن کے لئے باقاعدہ اہتمام کیا گیا تھا، اصولی طور پر بھی دلہن کا حق بنتا ہے کیونکہ وہ اس وقت بطور ایک نووارد اور مہمان کے ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دولہا کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔ اس کی عزت اور احترام بھی ضروری ہے۔ لیکن اصولی طور پر اس موقعہ پر دلہن مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اب ہم سیدہ فاطمہ کے استقبال اور خصوصی اہتمام کا مختصر منظر دیکھتے ہیں۔

حضرت ام ایمنؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نبی کریمؐ کی خدمت میں علیؓ کو بلا لائی وہ تشریف لائے پھر فرمایا۔ جب میں نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ سیدہ عائشہؓ کے مکان میں تشریف فرما تھے، میرے آنے پر ازواج مطہراتؓ اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔ میں حضورؐ کے سامنے حیا کی وجہ سے سرنگوں بیٹھ گیا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا۔ کیا تمہیں پسند ہے کہ تمہاری اہلیہ کو تمہارے ہاں رخصت کر دیا جائے تو میں نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ ''درست ہے''۔ بڑی مہربانی اور نوازش ہو گی۔ نبی کریمؐ نے فرمایا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آج رات کو ہی یا کل رات ہم رخصتی کر دیں گے۔ اسی فرحت و سرور میں حضرت نبی کریمؐ کی خدمت سے میں واپس آنے لگا تو نبی کریمؐ نے اپنی ازواج مطہرات کو ارشاد فرمایا کہ رخصتی فاطمہ کی تیاری کریں۔ عمدہ لباس زیب تن کرائیں، خوشبو لگائیں،

فاطمہؓ کے لئے ان کے رخصتی کے مکان میں بستر بنائیں۔ پس ازواج مطہرات نے اس فرمانِ نبوی کے مطابق عمل درآمد کر دیا۔ شیعی روایات کے علاوہ ایک سنی روایت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

جناب شعبی جناب مسروقؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ و ام سلمہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے ہمیں حکم فرمایا کہ علیؓ کی طرف فاطمہؓ کی رخصتی کی تیاری کرو تو ہم نے وادیٔ بطحاء سے مٹی منگوا کر رخصتی کے مکان کو لیپا پوچا، صاف کیا پھر اپنے ہاتھوں سے کھجور کی چھال ٹھیک کر کے دو گدے تیار کئے پھر کھجور اور منقہ سے خوراک تیاری کی اور میٹھا پانی پینے کے لئے مہیا کیا۔ پھر اس مکان کے ایک کونہ میں لکڑی گاڑ دی تا کہ اس پر کپڑے اور مشکیزہ لٹکایا جا سکے۔ عائشہؓ و ام سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ فاطمہؓ کی شادی سے بہتر ہم نے کوئی شادی نہیں دیکھی۔

(ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الولیمہ)

معلوم ہوا کہ دلہن کا حق ہے کہ اس کے لئے اچھا مکان، اچھا لباس، بہترین خوشبو، لذیذ کھانے اور دوسری تمام سہولکیات بہم پہنچائی جائیں اور ان تمام چیزوں کے انتظام کا بوجھ دولہے کی جیب پر ہوگا۔

ایک سوال

چونکہ ہمارے معاشرے میں غلط رسومات اس قدر حاوی ہو چکی ہیں خصوصاً جہیز کی لعنت۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر شادی پر بچی کو دیا کیا جائے؟ تو اس کا جواب میں پیچھے دے آیا ہوں۔ لڑکی کو اس کا شرعی حصہ دیا جائے اور وہ اس طرح ہے کہ لڑکا اگر ایک روپے کا حق دار ہے تو لڑکی آٹھ آنے کی۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی کا حصہ لڑکے سے کم کیوں ہے تو اس حکمت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں یا راسخ فی العلم علماء دین،

میرے ناقص خیال میں چونکہ لڑکی اپنے خاوند کی جائداد میں بھی حصہ دار ہے اور اس کی رہائش، خوراک، لباس وغیرہ اب خاوند کے ذمہ ہے شاید یہ وجہ ہو۔ پھر لڑکی خاوند سے حق مہر کی رقم بھی لے گی جو اگر خاوند صاحب حیثیت ہے تو پراپرٹی کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں لڑکی کو لڑکے سے اضافی ملیں گی۔ اس سب کے علاوہ اگر کوئی ماں باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت ہدیتہً کچھ دینا چاہے تو ضرور دیوے۔ سیدہ زینبؓ کو ان کی والدہ سیدہ خدیجہؓ نے ایک سونے کا قیمتی ہار ان کی شادی کے وقت تحفتاً دیا تھا اور بھی مہربانی سے جتنا سلوک والدین کر سکیں وہ کریں۔ بیٹی کو دینے سے خدا تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ مقصد تو صرف یہ ہے کہ جہیز کو جو ہم نے فرضِ عین سمجھ لیا ہے کہ لڑکی ضرور گھر سے لے کر آئے یا دوسری رسومات جن کا مختصر تذکرہ پیچھے ہو چکا ہے۔ یہ سب غلط اور غیر اسلامی ہے۔ لڑکے والوں کا لڑکی کے والدین سے جہیز مانگنا اور انہیں مجبور کر کے بلاوجہ تنگ کرنا انتہائی مکروہ ناپسندیدہ اور مہذب معاشرے کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس بُری رسم نے گھروں کے گھر برباد کر دیئے ہیں اور کئی لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بابل کے ویہڑے سے پیا کے دیس سدھارنے کی امید پر بوڑھی ہو رہی ہیں۔ خدا کی پناہ کتنا عظیم ظلم ہے کہ دنیا کے تھوڑے سے مال ومتاع کی خاطر ایک ضروری اور فرض چیز کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ موجودہ حالات میں اس رسم بد کی اصلاح صرف اور صرف دولہا یا دولہا کے والدین کر سکتے ہیں۔ لڑکی والے تو مجبور محض ہیں وہ تو پریشان ہوں، تنگ ہوں، مقروض ہوں بلکہ وہ تو کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں ڈور دولہے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اگر اسلامی اصول کے مطابق چلیں تو ان شاء اللہ بہت سی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

دیہاتی زندگی

ستارہ نے اپنی آپ بیتی پوری کی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سچی بات ہے میں تو تھکا ہوا تھا ان سے اجازت لے کر سو گیا لیکن میری بیگم اور ستارہ نیچے آ گئیں۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز تہجد میں مشغول ہو گئیں۔ صبح کی نماز کے لئے میں اٹھا۔ صاحب بہادر بھی اٹھ گئے۔ ہم نے نماز ادا کی۔ میری بیگم دودھ بلونے میں مشغول ہو گئی۔

اس زمانے میں الیکٹرک مدھانی ابھی وجود میں نہیں آئی تھی، عورتیں لکڑی کی بنی ہوئی مدھانی سے دودھ بلوتی تھیں۔ ستارہ کے لئے یہ ایک عجیب منظر تھا۔ مدھانی کے درمیانی حصے میں رسی کی ایک ڈور ہوا کرتی تھی جسے عورتیں دائیں بائیں بازوؤں سے کھینچتی تھیں تو مدھانی کا پھل کبھی دائیں کبھی بائیں چاٹی میں گھومتا تھا۔ یہ ایک اچھی خاصی ورزش ہوا کرتی تھی۔ اس پر زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ لگتا تھا اور پھر مکھن دہی سے علیحدہ ہو کر اوپر آ جاتا تھا اور خالص لسی نیچے رہ جاتی تھی۔ پھر عورتیں چاٹی میں ہاتھ ڈال کر مکھن کا بڑا پیڑا نکال لیا کرتی تھیں۔ اس تازہ مکھن سے تیار شدہ پراٹھا اتنا لذیذ ہوتا تھا کہ آج کل تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تازہ لسی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔

میں کبھی کبھی اپنی بیگم سے فرمائش کیا کرتا تھا کہ آج تین تہوں والا پراٹھا کھلائے۔ اُس دن بھی میں نے ستارہ اور شہزاد کے لئے اسی طرح کے پراٹھے پکانے کی فرمائش کی۔ دیسی انڈے، خالص دہی اور اچار کے ساتھ پراٹھوں کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا اور بعد میں دیسی گھی کا حلوہ تو سونے پہ سہاگہ کا کام دیتا تھا۔ دیہاتی مرد اور عورتیں عموماً صبح کے ناشتے میں یہی چیزیں استعمال کیا کرتی تھیں۔ اس لئے تنومند اور صحت مند لوگ معاشرے کی شان تھے۔

آج کل چائے اور ڈبل روٹی یا امیر گھرانوں میں مکھن لگے توسٹ اور آملیٹ، ڈبوں میں بند جیلی اور ناقص اچار ہماری خوراک کا حصہ بن چکے ہیں۔ جعلی کمپنیوں کے دلفریب اشتہار او نچی دُکان اور پھیکا پکوان کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ کسی چیز کا کوئی معیار نہیں، کئی شہروں میں گدھوں اور کتوں کا گوشت بیچا جا رہا ہے۔ طرہ یہ ہے کہ حرام گوشت کی کوالٹی بھی جب سے فریزر آئے ہیں مشکوک ہو گئی ہے۔

دل کے امراض، شوگر، ہیپاٹائٹس سے صرف وہ بچا ہوا ہے جس نے ابھی تک اپنے ٹیسٹ نہیں کروائے۔ بعض عورتیں اور مرد اتنے بھدے اور موٹے ہو گئے ہیں جیسے گوشت کے پہاڑ۔ اکثر نوجوان لڑکیوں کا جب میک اپ اتر جائے یا خراب ہو جائے تو نیچے سے زرد رنگ نئی نسل کی صحت کا پول کھول دیتا ہے۔ نئی نسل کے اکثر بچے اور بچیاں گندے ناول، فحش پروگرام دیکھ دیکھ کر خفیہ مردانہ و زنانہ پیچیدہ امراض کا شکار ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے شادی کے بعد، اسقاط اور دوسرے امراض کا شکار ہو جاتی ہیں جس کی وجہ بچوں میں شرح اموات خطرناک حد تک بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر چھوٹا بڑا فطرت کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ خیر یہ ایک علیحدہ اور نازک موضوع ہے ڈاکٹر اور حکیم صاحبان اس طرف توجہ دیں تو کافی اصلاح ہو سکتی ہے۔

ستارہ دلچسپی سے میری بیگم کو دیکھ رہی تھی اور مختلف سوال بھی کرتی جاتی تھی۔ میری بیگم پڑھی لکھی تھی، وہ بڑے احسن طریقے سے اس کی تسلی کر دیتی۔ میں مکان کے اوپر شہزاد کے پاس چلا گیا۔ سورج نکلنے سے ذرا پہلے باد نسیم اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہمارے جسموں میں گدگدی کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ہمارے لئے تو یہ روز کا معمول تھا لیکن شہزاد صحیح طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

مقدر کا دھنی

''شہزاد تمہارے تاثرات اس وقت کیا تھے جب ستارہ نے تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا؟'' میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا۔

''قاری صاحب میرا خیال ہے الفاظ میں اس وقت کے تاثرات کو ڈھالنا بہت مشکل ہے''۔ شہزاد نے کہا۔ ''کیونکہ الفاظ ایک حد تک ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ میں اس وقت شہر سے باہر تھا اور خودکشی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مجھ پر یاس، ناامیدی اور ڈپریشن کے دورے پڑ رہے تھے۔ میری جھوٹی امیدیں دم توڑ چکی تھیں مجھے اپنے اوپر کوئی کنٹرول نہیں رہا تھا۔ میں اس حالت میں کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن ستارہ سے میں نے ایک وعدہ کیا تھا کہ تایا ابو کی عزت پر داغ نہیں لگنے دوں گا اس لئے میں ستارہ کی شادی والے دن غیر حاضر ہو گیا تھا۔ مبادا مجھ سے کوئی غلط حرکت سرزد نہ ہو جائے۔ محلے میں میرا صرف ایک ہی راز دار تھا اس کے علاوہ کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا یا پھر ستارہ سب کچھ جانتی تھی۔ اُدھر وہ واقعہ پیش آ گیا جو ستارہ آپ کو سنا چکی ہے۔ اِدھر مجھے تلاش کیا گیا تو میں مل نہ سکا۔ ستارہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میرے دوست نے جب صورتِ حال دیکھی تو فوراً میرے پاس پہنچا اور مجھے خوشخبری دی اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گنہگار مومن کو نزع کے وقت جنت دکھا دی جائے۔ میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا اور پھر میرا جسم زور سے کانپنا شروع ہو گیا۔ میرا خیال ہے اچانک افسوس ناک خبر سننے سے جس طرح دماغ و اعصاب پر اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسی طرح انتہائی خوشی کی خبر سننے کا بھی ردِعمل ہو سکتا ہے لیکن پھر میں جلد ہی سنبھل گیا اور اپنے دوست کے ساتھ واپس آیا تو نکاح کے انتظامات مکمل تھے۔ دولہا والوں کی طرف سے معذرت اور راضی نامے کی کوششیں ابھی جاری تھیں لیکن میں ستارہ کی قوتِ فیصلہ اور پھر اپنے فیصلے پر ڈٹ جانے کی عادت سے واقف تھا۔ ستارہ کی خواہش پر مجھے اس کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ ستارہ نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور پھر تھوڑا سا مسکرا کر کہنے لگی۔ ''بھولے اب تو خوش ہو نا؟'' شکریہ ستارہ میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''اچھا بھولے میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے ایک بات پوچھوں''۔ ستارہ نے کہا۔

''پوچھیں''۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''بھولے! جب اس دن تم نے اپنی کنپٹی پر فائر کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ ریوالور خالی تھا اور اس کے بعد تم نے وعدہ کیا تھا کہ ستارہ تایا ابو کی عزت مجھے بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں۔ کیا یہ تمہیں یاد ہے؟''

''ہاں، مجھے یاد ہے''۔ میں نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا اسی لئے آج میں غیر حاضر ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے''۔

''ہاں، بھولے! اس میں کیا شک ہے؟'' ستارہ نے کہا۔ ''لیکن ایک بات تم نے اور بھی کی تھی جو میں سن نہیں سکی تھی''۔

''وہ کون سی؟'' میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بھولے! تم نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ کہا تھا''۔

''ہاں، ستارہ! مجھے اچھی طرح سے یاد ہے''۔

''تو میں وہ پوچھنا چاہتی ہوں، تم نے کیا کہا تھا؟''

''دیکھو ستارہ! میں ایک گنہگار انسان ہوں لیکن میں ہوں تو اسی خدا کا پیدا کیا ہوا''۔ میں نے ستارہ سے کہا۔ ''وہ میرے اور میرے خالق کے درمیان معاملہ تھا۔ وہ راز میرے اور خالق کے درمیان ہی رہنے دو۔ ہاں اتنا یاد رکھو کہ وہ خود کہتا ہے میں مجبور و بے بس کی دعا کو سنتا

ہوں''۔

''ٹھیک ہے، بھولے خدا کا کلام سچا ہے، مجھے تُو دِل کی گہرائیوں سے قبول ہے''۔ ستارہ نے کہا اور پھر شیخ نے ہمارا نکاح پڑھ دیا۔

''شہزاد! تُو نے ستارہ کو حق مہر میں کیا دیا؟''

''قاری صاحب! میرے پاس ہی کچھ نہیں تھا کیا دیتا؟''

''بھائی، حق مہر تو ضروری ہوتا ہے۔ ہاں وہ تو ہے دیا بھی تھا لیکن حق مہر کی رقم تائی حنا نے مجھے دی تھی اور ایک زنانہ انگوٹھی جو میں نے سہاگ رات ستارہ کو پہنائی تھی''۔

''ستارہ کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟''

''انتہائی اچھا جس میں خلوص اور پیار کی ملونی تھی''۔

''ستارہ نے تمہیں غربت، لاأبالی پن اور غیر مہذب یا اَن پڑھ ہونے کا کبھی طعنہ دیا ہو؟''

''کبھی نہیں بلکہ وہ میری اتنی عزت کرتی ہے کہ مجھے بعض دفعہ شرمندگی ہونے لگتی ہے''۔

''وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ میں اطلس کی چادر میں ٹاٹ کا پیوند ہوں۔ ستارہ کی اور میری مثال ایسے ہی ہے جیسے گدھے کے گلے میں جواہر''۔

''کیا تم احساس کمتری کا شکار ہو؟''

''شاید ہو جاتا لیکن ستارہ ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ شہزاد تمہیں پا کر میں بہت خوش ہوں''۔

''کیا تم محسوس کرتے ہو کہ یہ سب اس کی زبانی باتیں ہیں؟''

ہر گز نہیں کیونکہ اس کا رویہ اس کی نفی کرتا ہے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ گھر پر نوکرانیاں ہونے کے باوجود ستارہ خود مجھے کھانا دیتی ہے۔ ہر روز نیا لباس یا دھلا ہوا صاف ستھرا استری شدہ ضد کر کے پہناتی ہے۔ گاڑی میں مجھے کبھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے نہیں دیتی بلکہ اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پہ بٹھاتی ہے۔ ایک دفعہ ستارہ کی ایک سہیلی نے میرے بارے میں چند ریمارکس دیئے جو تھے تو حقیقت پر مبنی لیکن اس کے بعد ستارہ نے اس سے قطع تعلق کر لیا''۔

''قاری صاحب! بات چل نکلی ہے تو ایک بات میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں''۔ شہزاد نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''کریں بات''۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''قاری صاحب! میرے دماغ میں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ستارہ کی حق تلفی تو نہیں ہوئی''۔ شہزاد نے کہا۔ ''اور اس نے محض مجھ پر ترس کھاتے ہوئے ایسا کیا ہے اور اپنے دل کے ارمان پس پشت ڈال دیئے ہیں اور اپنے آپ کو حالات کے دھارے میں چھوڑ کر حقیقت سے منہ موڑ کر مصنوعی اور بناوٹی اطمینان کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو میں خود کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک راز سے پردہ اٹھا رہا ہوں کہ ستارہ کا غم غلط کرنے کے لئے میں نے بے تحاشا شراب پینی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے میرا معدہ اور جگر متاثر ہو گئے تھے اور میری قوت مردمی بے حد متاثر ہو گئی تھی اور اب مجھے سخت قسم کے دورے بھی پڑتے ہیں۔ ان حالات میں مَیں احساس جرم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میں ستارہ کو کوئی خوشی نہیں دے سکا الٹا اسے دکھ اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے''۔

''دیکھو شہزاد! ستارہ نے اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ نکاح کیا ہے۔ اس پر کوئی دباؤ نہیں تھا''۔ میں نے شہزاد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اس نے

تمہاری محبت اور تڑپ دیکھتے ہوئے اپنی رضامندی سے تمہیں اپنایا ہے۔ تم عورت کی نفسیات کو نہیں سمجھتے یہ ایسے ایسے حیرت انگیز اور ناقابل یقین کام کر گزرتی ہے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں اس نے تمہارے جسم کو اہمیت نہیں دی بلکہ تمہاری روح پر مرمٹی ہے جس کے لئے تم اپنی جان دینے کے لئے تیار تھے۔ اس نے اگر اپنا آپ تمہارے سپرد کر دیا تو یہ کوئی بڑی بات تو نہیں تمہیں احساسِ جرم میں مبتلا ہونے کے بجائے احساسِ فخر میں مبتلا ہونا چاہئے۔ آئندہ یہ خیال بھی کبھی دل میں نہ لانا۔ دیکھو تم بیمار ہو اپنا خیال رکھو، ان شاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

"شکریہ، قاری صاحب! آپ کے الفاظ سے مجھے کافی حوصلہ ملا ہے"۔

"اور دیکھو تمہیں ستارہ کا قرض چکانا ہے۔ مرد بنو دنیا کی سب سے بڑی نعمت دیندار اور فرمانبردار بیوی ہے"۔

بھائی جان! نیچے آئیں اور شہزاد کو بھی ساتھ لے آئیں"۔ ستارہ نے صحن سے آواز دی۔

ہم نیچے آئے تو ستارہ نے کہا بھائی جان ہم گندم کے درخت دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھئی گندم کے درخت نہیں چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے ہیں۔ پھر ہم باہر کھیتوں میں آ گئے بیساکھ کا مہینہ تھا گندم کی فصل پک کر تیار ہو گئی تھی۔ میں نے ستارہ کو گندم کے پودے دکھائے اور گندم کے سٹے ہاتھوں سے مل کر گندم کے دانے نکالے اور پھر گندم کی بجائی سے لے کر گندم کے کاٹنے تک اور بھوسے سے گندم علیحدہ کرنے تک کے تمام مراحل مختصر طور پر سمجھائے تو ستارہ اور شہزاد بہت محظوظ ہوئے۔ پھر گھر واپس آ گئے، ناشتہ کیا اور پھر وہ واپس اپنے شہر روانہ ہو گئے۔

دوبارہ آمد

پندرہ دن بعد ستارہ اور شہزاد پھر آئے، حیرت انگیز حد تک دوائی کامیاب رہی تھی۔ واقعی شہزاد کو کوئی دورہ نہیں ہوا، پانی وغیرہ پینے کے بعد ستارہ نے کہا۔ بھائی جان آج ہم رات نہیں ٹھہریں گے کیونکہ ایک دو دن تک ماما کی ڈلیوری ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے ایک بھائی عطا فرما دے۔ آمین! میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں ان کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس گیا۔ حکیم صاحب نے ایک ماہ کی دوائی دی۔ مجھے حافظ آباد ایک ضروری کام تھا ان سے رخصت لے کر میں اپنے کام چلا گیا اور وہ واپس چلے گئے۔

سالانہ کانفرنس

اگلے مہینے دارالعلوم کی سالانہ کانفرنس تھی جس میں ملک کے عظیم سکالرز اور دینی رہنما شریک ہوا کرتے تھے۔ مجھے بھی دعوت نامہ مل چکا تھا۔ میں نے چند دن پہلے ہی حکیم صاحب سے مشورہ کر کے ایک ماہ کی دوائی شہزاد کے لئے لے لی تھی۔ میں دارالعلوم پہنچ گیا، شیخ رحمہ اللہ سے ملا اور وقار عظیم کی رہائش گاہ کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے ایک طالب علم میرے ہمراہ کیا۔ ستارہ کی کوٹھی پہنچے تو گیٹ پر موجود چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ وقار عظیم، ستارہ، شہزاد، حنا سبھی لوگ گیٹ تک آئے اور پُرتپاک استقبال کیا۔ حنا کی گود میں بچہ دیکھ کر میں نے ستارہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔ خدا کا شکر ہے اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ ہم دو بہنیں ہو گئی ہیں۔ میں اہل خانہ کے پُرزور اصرار پر تین دن ان کا مہمان رہا لیکن ہماری گفتگو صرف رات کے کھانے پر ہی ہوتی۔ دن کو میں سو جاتا اور رات کو پروگرام میں شامل ہوتا۔ کھانے کی میز پر ہم دنیا جہان

کی باتیں کرتے۔ وقار عظیم واقعی پُر وقار شخصیت کے مالک تھے اور حنا ایک بھرپور لڑکی۔ گو وہ چالیس کے پیٹے میں تھی لیکن ابھی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ غیر شادی شدہ نوجوان لڑکی ہے۔ پورا گھرانہ صوم وصلوٰۃ کا پابند، صحیح العقیدہ، خدا ترس، دینی اور دنیاوی علوم کا حامل اور اعتدال پسندانہ خیالات جن میں مذہب کا عنصر غالب تھا۔

سچی بات کروں گا جو لوگ آج کل اپنے گھروں میں مغربی کلچر کو فروغ دے رہے ہیں اور ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور غیروں کے معیار اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، رہن سن نشست و برخاست، قیل و قال، میں غیروں کی نقالی کرتے ہیں، حقیقتاً قابل رحم ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اپنا کوئی کلچر، کوئی تہذیب، کوئی زبان نہیں ہے کہ ہمیں اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے لئے اوپرا الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ تو مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے بلکہ افسوس ناک حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے ٹی وی پر ایک مشہور میزبان ہیں ایک پروگرام میں ایک ڈانسر ان کی مہمان تھی، اس سے انہوں نے ان کے فن کا مظاہرہ دیکھنے سے پہلے مختصر انٹرویو لیا جس کے چند جملے ہدیہ قارئین کرتا ہوں۔

حضرات! آج میں جس ہستی کو دعوت دینے والا ہوں وہ پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے سامنے جلوہ افروز ہونے والی ہیں۔ کھڑے ہو کر تالیوں کی گونج میں استقبال کیجئے۔ میڈم......

میرے خیال میں موصوفہ نے کپڑے تو شاید پہن رکھے تھے لیکن معلوم ایسے ہی ہوتا تھا جیسے بے لباس ہی ہیں۔

''میڈم! آپ کی تعلیم؟''

''جی، بی اے، ویسے مجھے ایم اے انگلش کا شوق تھا لیکن پھر میں نے ڈانسر بننے کا تہیہ کر لیا''۔

میزبان: ''ماشاء اللہ جی، بڑی بات ہے''۔ (تالیاں)

میزبان: ''گھر والوں نے تو کوئی اعتراض نہ کیا؟''

میڈم: ''جی نہیں، الحمدللہ سب نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا''۔

میزبان: ''کبھی بیرون ملک بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا؟''

میڈم: ''جی، اللہ کا شکر ہے میں کئی ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہوں''۔

میزبان: جی پھر بسم اللہ کیجئے اور اس کے ساتھ ہی اس نے ڈانس شروع کر دیا۔

ٹالی بیٹھ نشستہ بووم اِٹ گھمکدی آئی
اِف آئی ہیڈ پچھاں نہ کرواسدھی سر وچہ آئی
کجھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ستارہ کا باقی احوال

شہزاد بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا اس کے ہاں اولاد ہوئی۔ وقار عظیم اور حنا حج کے لئے گئے، چھوٹی بچی بھی ان کے ساتھ تھی۔ جدہ سے پی آئی اے کا بوئنگ طیارہ 450 حاجیوں کو لے کر جوں ہی اڑا چند منٹوں بعد دھماکے سے پھٹ گیا۔ جہاز کا ملبہ اور لاشیں چار مربع میل علاقے میں بکھر گئیں۔ عام لوگوں کو وہ جانکاہ حادثہ ابھی یاد ہو گا، مجھے نہ یاد نہیں رہا یوں ستارہ کو ایک ناقابل برداشت صدمہ اٹھانا پڑا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔

حرصاں خوشیاں تے سب کاراں سب پیاں رہ جاون
اچن اچیت پیارے جانی وداع سلام سناون
کیا شطرنج حیاتی والا دل نوں ہو گئی پیاری
کھیڈ گئے کئی لکھ ہزاراں اوڑک بازی ہاری
چپ چپاتیاں قبراں وِچ کرے آواز نہ کوئی
کوئی نہ اپنا حال سناوے کیا کیفیت ہوئی

ختم شد

میں اسی وقت ہیروئن کی پڑیاں لے کر سیدھا گندے نالے پر پہنچا اور سب کی سب پڑیاں نالے میں بہادیں اور رات کو چین کی نیند سویا۔

رنگ کچا تھا

☆ عبدالحفیظ بشر

دسمبر 1973ء کی بات ہے۔ میں نے اپنے چچازاد بھائی امیر علی کے ساتھ لاہور سے پشاور تک کا اکٹھے سفر کیا۔ اس نے پشاور سے آگے کابل سیر و تفریح کے لئے روانہ ہونا تھا۔ کابل کا ویزا اس نے پہلے سے حاصل کر رکھا تھا۔ میرے دل میں بھی ایک دیرینہ خواہش تھی کہ صوبہ سرحد، جس کو آج کل پختونخوا کہتے ہیں، اسی بہانے میں بھی دیکھ لوں گا۔

اس سے پہلے میں نے کبھی راولپنڈی سے آگے تک کا سفر نہ کیا تھا۔ پروگرام کے تحت ہم دونوں بھائی لاہور سے بذریعہ ریل گاڑی پشاور کے لئے روانہ ہوئے اور اگلی صبح پشاور پہنچ گئے۔ دن بھر پشاور کی خوب سیر کی اور رات کو ہوٹل میں قیام کیا۔

اگلی صبح امیر علی بذریعہ بس کابل کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ پشاور میں میرا ایک دیرینہ دوست جس کا نام خالد بٹ تھا، کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں ملازمت کر رہا تھا۔ وہ جب کبھی بھی لاہور اپنے گھر ماں باپ کو ملنے آتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ وہ مجھ سے کہتا جب کبھی بھی پشاور آنا ہو تو اس سے ضرور ملاقات کروں۔ وہ مجھے پشاور کی خوب سیر کرائے گا۔ میں بھی جواب میں یہی کہتا۔ ٹھیک ہے۔ بٹ صاحب! جب کبھی بھی پشاور آیا تو ضرور آپ سے ملاقات ہو گی۔ اب پشاور میں اپنے قیام کے دوران میں نے اس کا کھوج نکال

ہی لیا کہ کہاں ملازمت کرتا رہا ہے۔
ایک دن میں صبح ہوٹل سے تیار ہو کر سیدھا اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران سا ہو گیا۔ سلام دعا ہوئی، خوب خاطر تواضع کی۔ پوچھا کب پشاور آئے ہو اور کہاں ٹھہرے ہو۔
''ہوٹل شبستان میں رہائش پذیر ہوں''۔ میں نے اسے بتایا۔
''ٹھیک ہے۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر ٹھیک ڈھائی تین بجے کے قریب تمہارے ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت تک میں دفتر کے ضروری کام نمٹا لوں گا''۔
خالد ٹھیک ڈھائی بجے وعدے کے مطابق میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ اکٹھے ہوٹل میں کھانا کھایا، چائے قہوہ وغیرہ پیا پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہم ٹیکسی پر سوار ہو کر گھومنے پھرنے نکل گئے۔ کابلی قلعہ دیکھا، پھر پیدل قصہ خوانی بازار میں گھومنے پھرنے لگے۔ شام ہونے کو تھی، دن خوب مصروفیت میں گزرا اور بھوک لگی ہوئی تھی، بازار کے آخر میں ہمیں ایک درمیانہ سا ہوٹل نظر آیا جہاں لوگوں کا خوب رش تھا، چپل کباب، سیخ کباب اور گڑوی گوشت کے پکوان تیار ہو رہے تھے۔ سیدھا ہم ہوٹل میں داخل ہوئے اور گڑوی گوشت گرم گرم تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ بیس پچیس منٹ میں کھانا تیار ہو گیا اور ہم نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت میں نے ایک نظر اپنے دوست خالد بٹ کو دیکھا جو گوشت کو بھوکے شیر کی طرح کھا رہا تھا۔ قدرے پریشان ہوا پھر آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ دوست! لاہور میں تو پہلے تم اتنے شوق سے گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔ کیا بات ہے آج کل تمہارا گوشت کھانے پر زیادہ زور کیوں ہے؟
میرا اتنا کہنے پر قدرے شرمندہ سا ہوا اور اپنی نظریں نیچے کرتے ہوئے کہنے لگا۔
''بس یار! کیا بتاؤں، کبھی کبھار سوٹا لگا لیتا ہوں اور یہ چیز خوراک مانگتی ہے۔ لہٰذا گوشت کھانا ایک طرح کی مجبوری ہے''۔
میں اس کی اس بات کو کچھ زیادہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔
''درست، کیا تمہاری ماہوار آمدن اتنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جو اتنے زیادہ ہوٹلوں میں ہر روز ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہو''۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں''۔ خالد بٹ نے جواباً کہا۔ ''لیکن شام کو میں تھوڑا بہت سائیڈ بزنس کر لیتا ہوں جس سے روزمرہ کے اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں''۔
''کس قسم کا کاروبار کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''کچھ پتہ تو چلے''۔
''ڈرائی فروٹ بیس پچیس ہزار کا خرید لیتا ہوں نرخ بہتر ہونے پر فروخت کر دیتا ہوں جس سے مجھے ماہوار ایک اچھی خاصی آمدن تنخواہ کے علاوہ ہو جاتی ہے۔ بس، زندگی میں مزے ہی مزے ہیں''۔
اتنے میں بیرا کھانے کا بل لے آیا۔ جو اس زمانے میں تقریباً ڈھائی سو روپے تھا۔
خالد نے سو سو کے تین نئے نوٹ جیب سے نکالے اور بڑی فراخ دلی و بے نیازی سے بیرے کو کہا باقی پیسے تم رکھ لینا۔
میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ خالد کو پشاور کی فضا بڑی راس آئی ہے جو اتنا زیادہ خوش حال ہو گیا ہے۔ ورنہ لاہور میں تو ہمیشہ اسے تنگ دست اور بدحال ہی دیکھا تھا۔ اکثر یار دوستوں سے دو چار سو ادھار لے کر ہی گزارا کرتا تھا۔ یار دوست اسے مذاق میں ''کنگلا بٹ'' کے نام سے پکارتے تھے۔
مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرا دوست یہاں پشاور میں ایک خوشحال اور مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے۔ کھانا کھانے

کے بعد ہم ہوٹل سے نکلے اور ٹیکسی لے کر سیدھا سینما پہنچے۔ وہاں فلم دیکھی۔ رات بارہ بجے کے قریب واپس ہوٹل آ گئے۔ اس رات خالد بھی میرے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرا۔

صبح اٹھتے ہی ناشتہ وغیرہ کیا۔ اس دن خالد نے اپنے دفتر سے چھٹی لے لی کہ آج کا دن وہ میرے ساتھ گھومنے پھرنے، سیر سپاٹے کرنے میں گزارے گا۔

پورے دن کے لئے ٹیکسی کرائے پر لی۔ پورا پشاور شہر دیکھا پھر دوپہر کو طورخم بارڈر دیکھنے چلے گئے اور باڑہ مارکیٹ کی سیر کرنے کے بعد واپس پشاور آ گئے۔ دوپہر دو بجے کے قریب کھانا کھایا۔ کھانا، کھانے کے بعد کچھ دیر پیدل گھومتے رہے۔ اسی دوران شہر کی ایک مارکیٹ سے گزر ہوا جہاں لوگوں کا بہت زیادہ آنا جانا تھا۔ خالد نے مجھ سے کہا کہ یار! تم کچھ دیر کے لئے یہاں رک جاؤ۔ مجھے یہاں کوئی ضروری کام ہے۔

''ٹھیک ہے، میں یہاں سڑک کنارے کھڑا رہتا ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''تم جلدی سے کام سے فارغ ہو کر آ جاؤ''۔

مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر لوگ عجیب نظروں سے دیکھنے لگے جیسے میں کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔ میں نے سرخ رنگ کی قمیص اور سیاہ رنگ کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ میں یہی سمجھا شاید میرے لباس پر انہیں کوئی اعتراض ہے۔ میں بھی ایک اجنبی ہونے کے ناطے لوگوں کو اسی نظر سے دیکھتا۔

ٹھیک چار پانچ منٹ بعد خالد واپس آ گیا۔ جہاں میں اس کا منتظر تھا۔ وہ بہت خوش نظر آیا۔ میں سمجھا شاید وہ کوئی رقم وصول کر کے آیا ہے۔ بہر کیف بعد میں پتہ چلا کہ صورت حال قدرے مختلف تھی۔ خیر جلد جلد ہم نے وہاں سے رکشہ لیا سیدھا یادگار چوک آ گئے۔ میں نے وہاں سے اپنے گھر والوں کے لئے چلغوزے اور کچھ اخروٹ بادام وغیرہ خریدے جس کا بل بھی خالد نے ادا کیا۔ جو مجھے مناسب نہ لگا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن بازار میں رونق ماند نہ پڑی۔ پتہ چلا ابھی ایک آدھ گھنٹہ لوگ خرید و فروخت کریں گے پھر مارکیٹ دکانیں بند ہو جائیں گی۔

ہم واپس ہوٹل آئے۔ دن بھر کی تھکاوٹ نے نڈھال کر رکھا تھا۔ دوسرے اگلی صبح میں نے پشاور سے واپس گھر کے لئے لاہور روانہ ہونا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے کرائے کا رکشہ لیا اور سیدھا لاری اڈا پہنچے اور لاہور کے لئے میں نے اپنی سیٹ بک کرائی اور پھر واپس ہوٹل آ گئے۔ صبح اٹھے اپنی اپنی تیاری مکمل کی، ناشتہ کیا پھر رکشے پر سیدھا بس سٹینڈ پہنچ گئے۔

خالد نے مجھے سوار کرایا اور مجھ سے اجازت لے کر رخصت ہوا کیونکہ اس کے دفتر جانے کا وقت ہو رہا تھا۔

بس میں سوار ہوتے ہی میں نے اپنا سامان سنبھالا۔ رات بھر کا تھکا ہارا تھا۔ بس میں سوار ہوتے ہی پانچ سات منٹ کے اندر اندر بس وہاں سے روانہ ہو گئی۔ نیند کی کمی کے باعث میں جلد ہی اپنی سیٹ پر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد اٹک چیکنگ پوسٹ آئی مجھے کوئی خبر نہ تھی کیونکہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کسٹم حکام نے بس روکی اور دو تین کسٹم کے اہلکار گاڑی میں داخل ہوئے میں سویا ہوا تھا جگایا گیا۔ اٹھو اٹھو کر شریف آدمی؟ میں نے یکدم اپنی آنکھیں کھولیں اور دو تین باوردی سپاہیوں کو اپنے سامنے پایا۔

''کیا بات ہے؟'' میں ذرا سا تلخ لہجے میں بولا۔

''ابھی بتاتے ہیں، پہلے تم یہ بتاؤ تمہارا سامان کدھر ہے؟'' ایک اہلکار نے غصے کے انداز میں پوچھا۔

''یہ میرے پاس ہے''۔ میں نے جواباً کہا۔

''ذرا نیچے اترو گاڑی سے اور ہمارے ساتھ چلو''۔

انہوں نے عجیب وغریب نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا جیسے میں نے کوئی بڑا جرم کیا ہو۔ میں وقتی طور پر پریشان ہوگیا۔ تاہم پریشانی کے عالم میں اپنا سامان پکڑا اور بس سے نیچے اترا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری بس وہاں مجھے چھوڑ کر اپنی منزل کو چل نکلی۔ میں بس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب میں بخوبی سمجھ گیا ضرور کوئی گڑبڑ لگتی ہے اور صورت حال پریشان کن ہیں میرا رنگ اڑ گیا۔ مختلف قسم کے خیالات میرے دل ودماغ میں آنے لگے لیکن ساتھ ساتھ میں بڑی حد تک مطمئن بھی تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔

کسٹم حکام مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور میرا سامان جو ہینڈ بیگ میں تھا۔ چیک کرنے لگے پھر میری جامہ تلاشی لی گئی۔ میری جیب میں اس وقت بس کا ٹکٹ اور پانچ سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ میرا سامان اور نقدی دونوں چیزیں انہوں نے اپنی تحویل میں لے لیں۔

''اب بتاؤ، سودا کدھر ہے''۔ ایک اہلکار نے پوچھا۔ ''کہاں چھپا رکھا ہے؟''

''بڑے ہی (Kassbi) یعنی پیشہ ور اور تجربہ کار لگتے ہو''۔ دوسرے نے کہا۔

''سودا...... کیسا سودا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''برخوردار! بڑے ہی بھولے بنتے ہو، ابھی نہیں تو بہت جلد سب کچھ بتاؤ گے''۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا لگتا ہے آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے''۔ میں نے اپنی صفائی میں جواباً کہا۔

''ہماری انفرمیشن کبھی غلط نہیں ہوتی''۔ ایک سخت چہرے والے اہلکار نے کہا۔ ''اچھا تم یہ بتاؤ تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ تو دو دن پہلے کابل چلا گیا ہے۔ وہ میرا ساتھی نہیں میرا کزن تھا''۔ میں نے جواباً کہا۔

''نہیں، نہیں ہم دو دن پہلے کی نہیں، کل کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ساتھی جو کل سارا دن تمہارے ساتھ پشاور میں گھومتا پھرتا رہا۔ موٹا تازہ گول مٹول لڑکا جس نے دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی، وہ لڑکا...... گندم مارکیٹ پھر یادگار چوک جہاں سے تم لوگوں نے ڈرائی فروٹ بھی خریدا تھا۔ یاد آیا، ہم اس ساتھی کا پوچھ رہے ہیں''۔ انہوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

اب میں بخوبی اس نتیجے پر پہنچا اور سمجھا کہ یہ لوگ واقعی ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ چند منٹوں کے لئے خالد بٹ مجھے سڑک کنارے کھڑا کر کے گندم مارکیٹ گیا تھا۔ پھر وہاں سے ہم ڈرائی فروٹ خریدنے یادگار چوک بھی گئے تھے۔ ان کی انفرمیشن بڑی حد تک ٹھیک تھیں۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو کس نے خبر پہنچائی۔ بہرکیف میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ کہیں مخبری ہوئی ہے اور ان لوگوں نے شک کی بناء پر مجھے یہاں روک رکھا ہے۔ میرے ہاتھ چونکہ صاف تھے اور مجھے کسی قسم کا خوف ڈر نہ تھا۔ مجھے افسوس صرف اور صرف اس بات کا تھا کہ میری بس جس میں سفر کر رہا تھا وہ چھوڑ کر چلی گئی۔

میں کھڑا کھڑا مختلف قسم کی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔

''سچ سچ بتاتے ہو یا پھر میں چھتر پریڈ کا عمل شروع کروں''۔ ایک سپاہی نے بڑی بدتمیزی سے کہا۔

''دیکھیں صاحب! آپ لوگ میری بات پر یقین کریں، آپ کسی حد تک ٹھیک کہتے ہیں۔ کل جو شخص میرے ساتھ ساتھ تھا وہ میرا دوست خالد بٹ تھا۔ پشاور میں گھومنے پھرنے کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا تھا اور میں آج واپس اپنے گھر لاہور جا رہا ہوں''۔ میں نے جواباً کہا۔

''یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے کتنی مرتبہ پشاور آئے ہو؟'' ایک کسٹم اہلکار نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ تم پکے پھیرے باز ہو''۔

نہیں، صاحب! میں خدا کی قسم کہہ کر کہتا ہوں کہ زندگی میں پہلی بار پشاور دیکھنے آیا تھا''۔ میں نے جواباً کہا۔

''میرے اتنا کہنے پر کسٹم اہلکاروں نے آنکھوں آنکھوں کے اشارے سے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ کہا پھر میرا سامان پکڑا اور ساتھ عقب میں ایک کمرے میں لے گئے۔ میں نے دیکھا ایک موٹا سا بھاری بھرکم کسٹم انسپکٹر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ایک بید کی چھڑی تھی اور وہ اپنی لمبی لمبی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اہلکار نے ایک ساتھ اس کو سلوٹ کیا۔

''سر! یہ سرخ قمیص اور سیاہ پینٹ والا آدمی ملا ہے۔ ایک اہلکار نے کہا۔ ''ادر چلغوزے بادام وغیرہ بھی اس کے پاس ہیں لیکن سودے کا بالکل نہیں بتاتا۔ ہم لوگوں نے ٹھونک بجا کر تین بار اس کی جامہ تلاشی بھی لی ہے لیکن وہ چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اس کا دوسرا ساتھی اس کے ساتھ نہیں۔ بس اتنا کہتا ہے کہ وہ اس کا دوست تھا اور یہ بات بھی یقین کے کہتا ہے کہ زندگی میں پہلی دفعہ پشاور دیکھنے آیا تھا۔ یہ کیس ہماری سمجھ میں نہیں آرہا۔ اب آپ ہی اس کی تفتیش کریں۔ ہوسکتا ہے معمہ حل ہوجائے''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ باہر چلے جائیں''۔ کسٹم انسپکٹر نے اہلکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب میں کمرے میں اکیلا انسپکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ کسٹم انسپکٹر شکل وصورت سے پٹھان لگتا تھا لیکن بڑی کرخت زبان بولتا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہاں، اب بتاؤ خوچے تم کیا کام دھندا کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''جھوٹ بالکل نہ بولنا''۔

"سر! لاہور میں ہماری سگریٹ کی ایجنسی ہے"۔ میں نے اسے بتایا۔

"کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"باپ دادا سے ہم لوگ سگریٹ ڈیلر کا کام کرتے چلے آرہے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"پشاور کتنی مرتبہ آئے ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"پہلی دفعہ سر!" میں نے جواباً کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی سر! سو فیصد سچ کہتا ہوں"۔ جس نے کہا۔

"جو دوست کل تمہارے ساتھ پشاور میں تھا اس سے کیا تعلق ہے تمہارا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ میرا بچپن کا دوست ہے"۔ میں نے کہا۔ "اس نے لاہور میں تاکید کی تھی کہ جب بھی میں پشاور آؤں تو سے ضرور ملوں۔ اتفاقاً اس سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ دیکھیں سر! پ لوگ مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔ میرا ایک ریف پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق ہے۔ میری بس بھی پ لوگوں نے روانہ کردی۔ میرے گھر وقت پر نہ پہنچنے پر رے والدین پریشان ہوں گے"۔ میں نے انسپکٹر سے ا کرتے ہوئے کہا۔

"میں دوبارہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دوست ں کے متعلق آپ جان کاری لینا چاہتے ہیں اگر وہ آپ طلوب ہے تو اسے آپ پکڑیں"۔

"کوئی اس کا اتا پتہ؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"مجھے کوئی خبر نہیں"۔ میں نے کہا۔ "آپ لوگ نے ذرائع سے اس کو تلاش کریں۔ آپ لوگ مجھے کیوں ان کررہے ہیں"۔

"تو تم ایسے نہیں مانو گے"۔ انسپکٹر نے گھٹیا زبان کا ال کرتے ہوئے کہا اور اپنے ڈنڈے سے ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر سے گدی کو اٹھایا اور کہا۔ "اس کو اچھی طرح سے دیکھو"۔

میں نے دیکھا، گدی کے نیچے دو تین پستول اور ایک چرس ہیروئن کا پیکٹ نظر آیا"۔

"یہ سب چیزیں تمہارے حساب میں ڈال کر سیدھا دس سال کے لئے جیل بھجوادوں گا"۔ انسپکٹر نے خباثت سے کہا۔

میں اچانک سب کچھ دیکھ کر دب سا گیا۔ بے شک میں بے قصور تھا لیکن میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا کیوں کہ میں اکیلا تھا اور پاکستان کے قانون کو بھی تھوڑا بہت سمجھتا تھا اور پولیس کے تشدد کو بھی۔ جو مرغی کو ملزم اور ہاتھی کو ہرن میں بدل دیتی ہے۔ میں نے آفیسر کو واسطہ دیا۔ ہاتھ جوڑے سر! میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ میں نے کوئی جرم وغیرہ نہیں کیا۔ آپ میری حالت پر رحم کریں۔

"تم ایسے نہیں مانو گے برخوردار!" انسپکٹر نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں لگ رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے مجھے قربانی کا بکرا بنا دیں۔

اس وقت میرے ذہن نے کام کیا۔ میری ایک دیرینہ عادت تھی کہ میں جب بھی سفر کرتا اپنے پاس جیب میں قرآن مجید کا دل یعنی سورۃ یٰسین رکھتا۔ دوران سفر میری یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ میں باوضو رہوں کیونکہ میرا صورت میں سورۃ یٰسین آسانیاں پیدا کرتی ہے اور محفوظ رکھتی ہے اور چھوٹی بڑی مشکلیں بھی دور رہتی ہیں۔

"میری بات سنیں انسپکٹر صاحب!" میں نے انسپکٹر کے سامنے سورۃ یٰسین کا نسخہ رکھا اور بسم اللہ پڑھ کر ایک مسلمان ہونے کے ناطے کہا۔ "آپ کا اس سورۃ یٰسین پر یقین ہے، میں باوضو ہوں۔ اس نسخے کو وسیلہ بنا کر خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ اقرار کرتا ہوں مجھے اس کلام کی قسم، مجھے میرے دوست کے قول وفعل کا واقعی کوئی علم نہیں کہ کیا

دھندہ کرتا ہے یا پھر کس گروہ سے اس کا تعلق ہے۔ آپ میری حالت پر رحم کریں۔ آپ مجھ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میرا ایک شریف گھرانے سے تعلق ہے۔ اس سے زیادہ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا''۔

میرے اتنا کچھ کہنے پر آفیسر قدرے مطمئن نظر آیا یقیناً سمجھ گیا ہوگا کہ میں بے قصور ہوں۔

''ٹھیک ہے''۔ اس نے کہا۔ ''اس کلام کو پہلے اپنی جیب میں رکھو اور اس کرسی پر بیٹھ جاؤ''۔

اب میری حالت قدرے سنبھل گئی اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں اس وقت؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''بس کا ٹکٹ اور پانچ سو روپے کا ایک نوٹ۔ یہ دونوں چیزیں اس وقت میری جیب میں تھیں جو آپ کے اہلکاروں نے اپنی تحویل میں لے رکھی ہیں''۔ میں نے کہا۔

''اچھا تو یہ بات ہے''۔ انسپکٹر نے کہا اور فوراً گھنٹی بجائی اور سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔

''او خوچے پائندہ گل! جو چیزیں اس لڑکے کی جیب سے تم لوگوں نے برآمد کی تھیں ابھی میرے پاس لے کر آؤ''۔

سپاہی پائندہ گل دونوں چیزیں اسی وقت لے کر حاضر ہو گیا۔ آفیسر کی میز پر چیزیں رکھ کر واپس کمرے سے باہر چلا گیا۔ ٹکٹ تو انسپکٹر نے مجھے دے دیا جو اس وقت میرے لئے بے کار تھا۔ پانچ سو کا نوٹ اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔

''سر! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا اور کہا۔ ''اس ٹکٹ پر تو اب میں سفر نہیں کر سکتا کیونکہ میری بس یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔ میرے پاس تو اور پیسے بھی نہیں۔ میں یہاں سے لاہور تک کا سفر کیسے کر

پاؤں گا؟"

"او خو چے! فکر مت کرو ہم تمہیں لاہور تک کا سفر بغیر ٹکٹ کے کرا دیں گے"۔ آفیسر نے کہا اور دوبارہ گھنٹی بجائی، سپاہی حاضر ہوا۔

"سنو"۔ آفیسر نے اسے حکم دیا۔ "اب کوئی کار یا گاڑی جو لاہور تک کے لئے جا رہی ہو اسے روک کر اس لڑکے کو بٹھا دو اور کنڈیکٹر یا ڈرائیور کو تاکید کرنا کہ ہمارا آدمی ہے اس سے ٹکٹ کے پیسے نہیں لینا سمجھے"۔

"ٹھیک ہے سر! آپ کا شکریہ"۔ میں نے کہا۔

سپاہی نے اپنے آفیسر کا حکم سنا اور کمرے سے نکل کر فوراً سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ دو تین منٹ میں ایک سرخ رنگ کی کرولا کار آ گئی۔ سپاہی نے اسے رک جانے کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔ سپاہی نے کار ڈرائیور سے کہا کہ صاحب کا ایک آدمی ہے، اسے لاہور تک لے جائیں"۔

ڈرائیور نے جواباً کہا لیکن ہم تو جہلم تک جا رہے ہیں۔ اہلکار نے آ کر انسپکٹر سے کہا کہ اس نے کار روک رکھی ہے لیکن وہ لوگ جہلم تک جائیں گے۔

"ٹھیک ہے، اس لڑکے کو بٹھا آؤ"۔ انسپکٹر نے اہلکار سے کہا۔

"لیکن میں جہلم سے آگے تک کا سفر کیسے کروں گا جناب!" میں نے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے، جہلم سے لاہور تک کا کتنا کرایہ ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

"پچاس روپے"۔ میں نے کہا۔ اس وقت گاڑیاں جی ٹی روڈ کے ذریعے آیا جایا کرتی تھیں موٹر وے نہیں تعمیر ہوا تھا۔

"لو یہ لو، پچاس روپے"۔ آفیسر نے بڑی بددلی کے ساتھ مجھے پچاس کا نوٹ دیا۔

میں نے جلدی جلدی پچاس روپے کا نوٹ پکڑا اور اپنا سامان لے کر کار میں جا بیٹھا اور اللہ کا شکر ادا کیا اور دل ہی دل میں کہا۔

"جان بچی سو لاکھوں پائے"۔

اب کار اپنی منزل کو چل دی۔ کار میں تین آدمی سفر کر رہے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا کیونکہ میری ان لوگوں سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ بس علیک سلیک ضرور ہوئی۔ وہ آپس میں محو گفتگو تھے اور شادی کی کسی تقریب میں جا رہے تھے۔ موسم ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ دو تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جہلم شہر آ گیا۔ مجھے انہوں نے لاہور سٹیشن کے قریب اتار دیا اور کہا کہ لاہور کے لئے تمہیں یہاں سے بس مل جائے گی۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بس سٹینڈ پر چلا گیا اور جلد ہی لاہور جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد میں دو گھنٹے کی مسافت کے بعد بخیریت لاہور پہنچ گیا۔ میری جیب خالی تھی۔ پیدل گھر پہنچا تو میری چھوٹی بہن اور بھائی موجود تھے۔ پتہ چلا کہ رات والد صاحب کو دل کی تکلیف کے باعث ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ میں پہلے سے ہی ذہنی طور پر پریشان حال تھا۔ والد کی اچانک بیماری کا سن کر مزید پریشان ہو گیا۔ وقتی طور پر میں اپنی پریشانی جو دوران سفر مجھے پیش آئی بھول گیا۔ سامان کو گھر پر چھوڑا سیدھا موٹر بائیک پر ہسپتال پہنچا۔ میرے گھر کے دیگر افراد وہاں موجود تھے۔ علیک سلیک ہوئی پتہ چلا والد صاحب کی

عبدالحفیظ بشر کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا

بزرگ صحافی اور ماہنامہ "حکایت" کے فیچر رائٹر عبدالحفیظ بشر جنہیں چند ماہ قبل فالج کا حملہ ہوا، آج کل وہ علیل ہیں اور روزمرہ کے معمولات انجام دینے سے قاصر ہیں۔ دوست احباب سے اپیل ہے کہ ان کی مکمل صحتِ کاملہ کے لئے خصوصی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ آمین! (ادارہ)

حالت خطرے سے باہر ہے اور آج شام تک ان کو ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ہم سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ شام کو والد صاحب کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور گھر منتقل ہو گئے۔ دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ میں نے گھر والوں کو اپنے ساتھ سفر میں ہونے والا سلوک کا قصہ سنایا۔ سن کر سبھی حیران و پریشان ہو گئے۔

خاص طور پر میری والدہ نے تو شدت سے میرے ساتھ ہونے والے سلوک کو محسوس کیا۔ فوراً میرے بخیریت گھر پہنچنے پر صدقہ اور خیرات ضرورت مندوں کو دیا کہ کس مشکل سے اس کا بیٹا خیر خیریت سے گھر لوٹا۔ ساتھ ساتھ والدہ نے تاکید کی کہ بیٹا آئندہ کبھی اپنے اس قسم کے دوست سے نہ ملنا۔

دراصل جو سلوک کسٹم حکام نے میرے ساتھ کیا وہ بھی بڑی حد تک ٹھیک تھا۔ معاملہ کچھ یوں تھا جو میں نے بعد میں اخذ کیا کہ پشاور قیام کے دوران خالد بٹ جب مجھے گندم مارکیٹ کے قریب سڑک کنارے کھڑا کر کے پانچ سات منٹوں کے لئے مارکیٹ کے اندر گیا وہاں اس نے ہیروئن کی کچھ پڑیاں اپنے پینے کے لئے خریدیں۔ وہاں سے کوئی مخبر ہمارے پیچھے پیچھے لگ گیا اور پشاور سے روانگی تک اس مخبر نے ہمارا تعاقب کیا اور اٹک چیکنگ پوسٹ پر اطلاع کر دی لیکن اتفاق سے وہ بس سٹینڈ پر لوگوں کے رش کی وجہ سے یہ نہ جان سکا کہ میرے ساتھ میرا دوست بھی سفر کر رہا ہے یا وہ مجھے یہاں سے خدا حافظ کہہ کر الوداع ہو گیا ہے۔ مخبر نے دونوں کی اطلاع دے دی تھی جبکہ میں اکیلا محوِ سفر تھا۔ ایک عرصے تک میرے ذہن میں یہ المیہ سوار رہا۔ تاہم آہستہ آہستہ بھولتا چلا گیا اور عہد کیا کہ آئندہ زندگی بھر خالد بٹ کو ہرگز نہیں ملوں گا جس کی وجہ سے مجھے ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس طرح شب و روز گزرتے چلے گئے اور دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا۔ مجھے اپنے ایک اور کاروباری دوست کی شادی میں پشاور جانے کا اتفاق ہوا اور میں پشاور پہنچا۔ اتفاق سے میرا پہلا دوست خالد بٹ بھی وہاں مدعو تھا جس کو میں نے نہ ملنے کا عہد کر رکھا تھا، شادی کے ہجوم میں اس نے مجھے دیکھ لیا۔ فوراً دیکھ کر میرے پاس پہنچا اور زبردستی میرے ساتھ بغلگیر ہوا۔ ملتے ہی میں نے غصے میں اسے کہا۔

''ہٹ جاؤ، دور ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے۔ کمینے، گھٹیا انسان! تم تو دوست کی شکل میں ایک سانپ کی مانند ہو''۔ میری ڈانٹ ڈپٹ سن کر وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

''بھائی! کیا بات ہے، کیا غلطی گستاخی کی ہے میں نے، جو اتنا زیادہ خفا ہو مجھ پر؟'' خالد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے گھٹیا انسان!'' میں نے کہا اور وہاں سے ہٹ کر دور ہو کر جا بیٹھا۔ پانچ سات منٹ کے بعد نہ جانے اسے کیا سوجھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ میرے پاس آن بیٹھا۔ آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لئے کہا۔ ''خدا کے لئے میرا قصور بتائیں؟''

''کیا قصور بتاؤں تمہیں؟'' میں نے غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یاد ہے، جب میں دو ڈھائی سال پہلے پشاور آیا تھا تو تم مجھے ساتھ لے کر گندم مارکیٹ گئے تھے اور وہاں اپنے نشے کے لئے ہیروئن خریدی تھی۔ وہاں سے ہی کسی نے تمہاری مخبری اٹک پوسٹ پر کر دی تم تو پشاور ٹھہر گئے اور مجھے انہوں نے شک کی بنیاد پر کسٹم پوسٹ پر روک لیا اور بہت زیادہ ذلیل و رسوا کیا۔ کیا بتاؤں، بس چھوڑو...... بتا نہیں سکتا تمہیں کچھ احساس ہونا چاہئے تھا۔ دوست کی عزت کو مقدم جاننا چاہئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم یہاں پشاور میں اس قسم کی بدنام زندگی گزار رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے''۔

میری اتنی ڈانٹ ڈپٹ اور تقریر سن کر اس کا سر شرم

کے مارے جھک گیا۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ جو بات میں کر رہا ہوں سو فیصد درست ہے۔ کچھ دیر تک وہ کسی سوچ میں کھو سا گیا اور سر نیچا کر کے شرم کے مارے خاموش رہا پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی۔ فوراً غصے کے عالم میں اس نے اپنی جیب سے چھ سات ہیروئن کی پڑیاں نکالیں اور میری گود میں پھینک دیں جن کا وزن تقریباً پندرہ بیس گرام تھا۔

''مجھے معاف کر دو دوست!'' اس نے کہا۔ ''میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی نشہ نہیں کروں گا''۔

میں نے جلدی سے ہیروئن کی پڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔ کیونکہ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میرا دوست اب جذباتی بنا بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے نشے کی طلب ہو گی دوبارہ مجھ سے مانگ لے گا اور میں اسے واپس کر دوں گا۔

لیکن نہ جانے کیوں اس دوران نہ تو اس نے پڑیاں مانگیں اور نہ ہی میں نے اسے واپس کیں بلکہ سنبھال کر اپنے کوٹ کی جیب میں محفوظ کر لیں۔ تاہم اب میرا غصہ قدرے کم ہو گیا۔

خالد بٹ کھانا کھانے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ رات بسر کرنے کے لئے مہمانوں کے لئے اردگرد گھروں میں سونے کا بندوبست کر رکھا تھا میں نے رات وہاں آرام سے بسر کی صبح سویرے نہا دھو کر کپڑے بدلے، میرے ناشتہ کیا اور وہاں سے اجازت لے کر لاہور آنے کے لئے رخصت ہوا کیونکہ اگلے دن میرے والد صاحب نے حج بیت اللہ کے لئے سعودی عرب روانہ ہونا تھا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب بس سٹینڈ پہنچا۔ ٹھیک آٹھ بجے میری بس وہاں سے لاہور کے لئے روانہ ہوئی۔

میں رات کو کم سویا تھا نیند کا غلبہ طاری تھا۔ مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ اسی دوران اٹک پوسٹ کراس کر کے راولپنڈی یہاں تک کہ بس جہلم پہنچ گئی۔

میرے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ جلد سے جلد گھر پہنچوں کیونکہ اگلے دن میرے والد نے گھر سے حج کے لئے روانہ ہوا ن تھا۔ تین ساڑھے تین گھنٹوں میں سہ پہر شام کو میں گھر بخیریت پہنچ گیا۔ میرے گھر والے میری آمد کے منتظر تھے۔ شام کو اکٹھے گھر کے افراد نے کھانا کھایا۔ پشاور شادی کے متعلق باتیں چلتی رہیں۔

میری ماں نے خصوصی طور پر پوچھا کیا اس مرتبہ تمہاری خالد بٹ سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ جب میری ماں نے خالد کے متعلق سوال کیا تو اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور فوراً میرا ماتھا ٹھنکا اور جو میں نے اس کو برا بھلا کہا تھا یاد آیا پھر مجھے ہیروئین کی پڑیاں بھی یاد آئیں جو میں نے اس سے لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھیں۔ اپنی ماں کو کوئی جواب دیئے بغیر اسی وقت کھانے کی میز سے اٹھ کر بیڈروم میں گیا جہاں میں نے سفر سے آ کر کوٹ ہینگ کیا تھا۔ کوٹ کو ہینگر سے نکالا۔ تلاشی لینے پر ہیروئن کی پڑیاں ملیں۔ میں دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے اگر خدانخواستہ چیکنگ پوسٹ پر کسٹم حکام مجھے چیک کر لیتے اور تلاشی لینے پر یہ ہیروئن کی پڑیاں برآمد ہوتیں تو میں ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو کر جیل بھی جا سکتا تھا۔

تقدیر بھی ہم لوگوں کے ساتھ کیا کھیل کھیلتی ہے جب پہلی مرتبہ میں پشاور گیا تو اس وقت میرے پاس کوئی اس قسم کی چیز تک نہ تھی تو کسٹم والوں نے مجھے کس قدر پریشان و ذلیل اور رسوا کیا۔ اب جبکہ دوسری مرتبہ میرے پاس ہیروئن کی پڑیاں تھیں تو کسٹم والوں نے چیک تک نہ کیا۔ دراصل یہ سب کچھ میرے اوپر قدرت کا ایک انعام تھا چونکہ میری نیت صاف تھی۔ میں نے اپنے گھر کے کسی فرد کو نہ بتایا کہ اب کے میرے پاس ہیروئن تھی تو کسی کسٹم والے نے نہ پوچھا۔ میں اسی وقت ہیروئن کی پڑیاں لے کر سیدھا گندے نالے پر پہنچا اور سب کی سب پڑیاں نالے میں بہا دیں اور رات کو چین کی نیند سویا۔

▲□▲

ناقابل فراموش

ایک پُر خلوص اور سادہ لوح شخص کا عجیب قصہ۔ ایک ذرا سی بات پر وہ اپنی جان پر کھیل گیا۔

اتنی سی بات

☆ محمد نذیر ملک

بھادوں تپ گیا تھا گرمی صبح صبح ہی پسینہ نکال رہی تھی۔ کسان کہتے ہیں کہ بھادوں کا بھاگا ہوا پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ بارانی علاقہ جات میں گندم کی بیجائی کے لئے زمین کی تیاری میں بھادوں کا مہینہ نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر کسی کسان کا بھادوں کا ہل رہ جائے تو اسے نالائق اور نکما کسان سمجھا جاتا ہے۔

سورج نصف النہار تک پہنچ چکا تھا۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں میں زور و شور سے ہل چلا رہے تھے۔

ڈلوال گاؤں کے قریب لب سڑک ایک تنگ سا اور غیر آباد گہرا کنواں تھا۔ اس کنویں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ملک کی تقسیم کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے یہ علاقہ چھوڑتے ہوئے اپنا ہر طرح کا اسلحہ اس میں پھینک دیا تھا جس میں تلواریں، برچھیاں، نیزے، چاقو، چھرے اور کرپانیں شامل تھیں۔ لہٰذا اس طرح کے اسلحہ کے خوف کے پیش نظر لوگوں نے اس کنویں سے پانی نکالنا بند کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ کنواں مکمل طور پر متروک ہو گیا۔

اس کنویں کے قریب برگد کا ایک بہت بڑا اور گھنا پیڑ تھا۔ گرمیوں میں کسان اس کے سایہ کے نیچے بیٹھ کر ستا لیا کرتے تھے۔ کنویں کی منڈیر کے ساتھ شہتوت کا ایک درخت تھا جس کے ٹہن بڑھتے بڑھتے کنویں کے اوپر تک آ گئے تھے اور ان کے پتوں کے سائے نے نیچے کنویں میں قدرے اندھیرا سا کر رکھا تھا۔

کنویں کے قریب قریب میں ہل چلانے والے کسانوں نے دیکھا کہ ایک جوان سا آدمی کنویں پر آیا اس نے اپنی قمیص اتار کر منڈیر پر رکھی تہبند کا لنگوٹ کسا پھر جوتے اتار دیئے۔ وہ کنویں سے ہٹ کر تھوڑی دور پیچھے کو چلا۔ پھر کنویں کی جانب دوڑ کر آیا اس نے کنویں میں جھانکا اور اُچھل کر اس کے اوپر چھائے شہتوت کے درخت کا ٹہن پکڑ لیا۔ ہل چلانے والوں کے لئے یہ وقت

بہت قیمتی تھا کسی نے بھی اپنا ہل نہ چھوڑا کہ جا کر اس سے بات کرے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ بس وہ اپنی نظریں اٹھا اٹھا کر اس شخص کو دیکھتے گئے۔

وہ آدمی دوبارہ پیچھے کو آیا پھر سے کنویں کی جانب دوڑ لگا دی اور کنویں میں جھانک کر ٹہن پکڑ لیا۔ ہل چلانے والے کسانوں نے کہا یہ کوئی بے وقوف آدمی ہے شاید کنویں میں چھلانگ لگانے کی مشق کر رہا ہے لیکن اب بھی کسی نے ہل چلانا نہ چھوڑا اور وہ ہل چلاتے ہوئے گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ تیسری بار جب وہ شخص دوڑ کر کنویں پر آیا اور اوپر لٹکے ہوئے ٹہن کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ آگے کیے تو ٹہن اس کے ہاتھ نہ لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کنویں میں جا گرا۔ اب کسانوں نے ہل روکے اور کنویں کی جانب دوڑ پڑے اور جا کر کنویں کے اندر جھانکنے لگے مگر چھلانگ لگانے والے شخص کا کنویں کے اندر کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ البتہ پانی کی سطح پر کچھ بھنورے سے ناچ رہے تھے۔

ہل چلانے والوں نے سر جوڑے کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ کون تھا کس گاؤں کا تھا کچھ خبر نہ تھی۔ ڈلوال کے نمبردار کو اطلاع کی گئی۔ وہ آیا اور اس نے بھی کنویں میں جھانکا۔ کچھ دیر پہلے پانی کی سطح پر جو بلبلے تیر رہے تھے۔ وہ بھی ٹوٹ چکے تھے اور کنویں کے اندر پانی کی سطح بالکل ساکت تھی جیسے اس کے اندر کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ نمبردار کو کسانوں نے تمام واقعہ سنایا۔ اس نے دو آدمی تھانے دوڑا دیئے۔ تھانہ ایک نواحی قصبہ میں تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ تھانیدار آن پہنچا۔ اس کے ہمراہ تین دیگر پولیس والے تھے۔ تھانیدار نے آتے ہی سب سے پہلے جا کر کنویں میں جھانکا۔ پھر واپس مڑ کر کنویں کی منڈیر پر پڑی اجنبی کی قمیص اور جوتے دیکھے نمبردار سے کہا کہ انہیں سنبھال لیا جائے۔ تھانیدار کچھ دیر تک کنویں کے گرد پھرتا رہا پھر برگد کے پیڑ کی طرف چل دیا۔ اس اثناء میں پیڑ کے نیچے گاؤں سے چار چار پائیاں لا کر بچھا دی گئی تھیں۔ ان پر نئی چادریں اور تکیے سجا دیئے گئے تھے۔ تھانیدار اور دیگر عملہ چارپائیوں پر جا بیٹھے۔ اتنے میں گاؤں سے 4 لسی کے بھرے جگ بھی پہنچ گئے۔ دو میں مکھن کے گولے تیر رہے تھے۔ مکھن والے جگ تھانیدار کی جانب بڑھا دیئے گئے۔ اس نے لسی بڑی رغبت سے پی اور مکھن کے دونوں پیڑوں کے ساتھ بھی برابر کا انصاف کیا۔ باقی کی لسی عملے نے بانٹ لی۔

تھانیدار نے حکم دیا کہ لاش کو کنویں سے باہر نکالا جائے۔ جب تک لاش برآمد نہیں ہوگی اگلی کارروائی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا کہ کنویں میں اترنے والے لوگوں کو بلایا جائے۔ سب نے کہا کہ سلطان ملیار اس فن کا ماہر ہے۔ وہ کنویں میں اترتا رہتا ہے۔ تھانیدار نے کہا تو پھر جاؤ اور جا کر اسے بلا لاؤ۔

کچھ ہی دیر میں سلطان نامی آدمی جو ایک قریبی گاؤں میں رہتا تھا، حاضر ہو گیا۔ وہ چھوٹے قد کا گورا سا گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔

تھانیدار نے سلطان سے کہا کہ وہ کنویں میں اتر کر لاش نکالنے کا بندوبست کرے۔ سلطان نے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کنویں میں بہت سا اسلحہ پڑا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی تیز دھار آلہ کی زد میں آ کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔ پھر بھی وہ سرکار کے حکم کی تعمیل میں کنویں میں اترے گا لیکن اترنے سے پہلے وہ سرکار سے ایک درخواست کرے گا کہ سرکار اسے لکھ کر دے کہ اس کی موت کے بعد سرکار اس کے اہل و عیال کی کفالت کرے گی۔

تھانیدار نے کہا کہ لاؤ کاغذ قلم میں لکھے دیتا ہوں کہ اگر تجھے کچھ ہو گیا تو سرکار تمہارے بال بچوں کی کفالت کرے گی۔ کاغذ لکھ کر تھانیدار نے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے اس مقصد کے لئے اور کاغذ سلطان ملیار کے ہاتھ پکڑا دیا۔ سلطان ملیار نے اپنے بڑے بیٹے

کو بلوا کر کاغذ اس کے حوالے کیا اور خود کنویں میں اترنے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک چارپائی لائی گئی جسے الٹا کر کے اس کے چاروں پائیوں کے ساتھ لمبے اور مضبوط رسے باندھے گئے اور چارپائی کو سلطان سمیت کنویں میں اتارا گیا۔ ایک ایک رسہ کو دو دو آدمیوں نے پکڑا ہوا تھا۔ چارپائی نیچے گئی اور جونہی کنویں کے پانی کی سطح قریب آئی سلطان نے اتر کر کنویں کے پانی میں ڈبکی لگا دی۔ کافی وقت گزر گیا سلطان پانی سے باہر نہ نکلا۔ لوگ فکرمند ہونے لگے کہ خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ لوگ پہلے سے ڈرے ہوئے تھے ان کے اندر ممکنہ اسلحہ کا خوف بھرا ہوا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سلطان نے اپنا سر پانی سے باہر نکالا۔ بتاتے ہیں کہ سلطان نے بڑے لمبے وقت تک کے لئے سانس روکے رکھنے کی مشق کر رکھی تھی۔

سلطان نے کنویں کے اندر پانی میں تیرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اوپر والوں کو سمجھایا کہ پانی میں لاش نہیں ملی۔

تھانیدار جو برگد کے پیڑ کے سایہ میں پڑی چارپائی پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا اسے جگا کر بتایا گیا کہ سلطان ملیار کہہ رہا ہے کہ کنویں میں سے لاش نہیں ملی اور اب اس کے لئے اگلا کیا حکم ہے؟ تھانیدار اٹھا اور اس نے ڈھیلی کی ہوئی پیٹی کو پیٹ پر دوبارہ کسا اور کنویں کی جانب چل پڑا۔ وہ کنویں کی منڈیر پر چڑھ کر اندر جھانکنے لگا۔ سلطان نے جو اس اثناء میں کنویں میں لٹکی ہوئی چارپائی پر جا بیٹھا تھا تھانیدار کو اشارے سے بتایا کہ کنویں میں لاش نہیں ہے۔ اب سرکار کا اس کے لئے کیا حکم ہے؟

تھانیدار نے کنویں کے منہ کے کنارے سے منہ ملا کر نہایت اونچے سُر میں سلطان ملیار کو موٹی سی گالی دے کر کہا کہ وہ دوبارہ پانی میں دفع ہو جائے اور لاش لے کر آئے ورنہ اسے کنویں سے نہیں نکالا جائے گا۔

سلطان نے جواب میں جیسے کہا ہو جو حکم سرکار کا اور دوبارہ پانی میں غائب ہو گیا۔

اس بار سلطان کو پانی میں گئے پہلے سے بہت زیادہ وقت ہو چلا تھا۔ کنویں کے اوپر کھڑے لوگوں نے کہا کہ بس جی سلطان ملیار کا کام ہو گیا وہ اب کنویں سے کبھی زندہ باہر نہیں نکلے گا۔ بے چارہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے چھوڑ گیا ہے لیکن تقدیر پر کس کا زور چلتا ہے۔

سلطان کا وہ بیٹا تو جسے وہ تھانیدار کا دستخط شدہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑا گیا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لوگ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور بعض گلے لگا کر اسے دلاسہ دیئے جا رہے تھے۔

پھر کیا ہوا کہ اچانک سلطان ملیار کا سر پانی سے ابھرا تو لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور سلطان کے آٹھ سالہ بیٹے کو جسے وہ گلے لگائے ہوئے تھے۔ جھٹکے کے ساتھ پرے دھکیل کر خوش ہونے لگے۔ ادھر سلطان کے بیٹے نے بھی جس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں اپنے والد کا پانی سے ابھرتا ہوا سر دیکھ کر اپنا سانس وہیں کا وہیں روک لیا اور اپنی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھنے لگا۔

سلطان کے ہاتھ میں اس بار لاش تھی جسے اس نے سر کے بالوں سے پکڑا ہوا تھا۔ متوفی نے اس زمانے کے رواج کے مطابق سر کے بالوں کے بڑے بڑے پٹے رکھے ہوئے تھے۔ سلطان اس کی لاش کو پانی میں سے کھینچ کر اوپر لے آیا۔ سلطان کے پاؤں پانی میں تھے کنویں کی زمین تو کہیں دور تھی کیونکہ کنویں میں بہت زیادہ پانی تھا۔ وہ خود تیر کر لاش کو کھینچ لایا تھا۔ پانی میں کوئی چیز کھینچنا زمین کی نسبت سہل ہوتا ہے، وہ ایک ہاتھ سے لاش کو تھامے ہوئے چارپائی پر چڑھ آیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے لاش کو پکڑ کر چارپائی پر کھینچ لیا۔

چونکہ چارپائی پر پانچ کر لاش کا وزن بڑھ چکا تھا لہٰذا

لاش کو اطمینان سے چارپائی پر رکھ کر خود دوبارہ نیچے پانی میں اتر گیا اور لوگوں کو اشارہ سے کہا کہ چارپائی کھینچ لی جائے۔ لوگوں نے رسے کھینچنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ چارپائی لاش سمیت کنویں سے باہر نکال لی۔ لاش کو منڈیر پر ڈال کر سلطان کے لئے چارپائی دوبارہ کنویں میں لٹکائی گئی اور سلطان کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ تھانیدار نے سلطان ملیار کو شاباش اور تھپکی دی۔ لاش کو دوسری چارپائی پر ڈال دیا گیا۔

لاش تازہ تھی اور اس کی شناخت میں کوئی دشواری نہ تھی۔ ڈلوال گاؤں والوں نے کہہ دیا کہ یہ آدمی ان کے گاؤں کا نہیں ہے۔ چونکہ موقع واردات لب سڑک تھا لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر ہر کوئی آتا جاتا وہاں رک جاتا۔ پولیس نے بھی لاش کھلی رکھی ہوئی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان لے۔ آخر ایک شخص نے کہا کہ یہ لاش اس کے گاؤں کی ہے اور متوفی کا نام لعل خان باشندہ ہے۔ متوفی کا گاؤں ''وعومہ'' سامنے دکھائی دے رہا تھا لیکن کنواں موضع ڈلوال کی حدود میں تھا۔ اس جگہ دیگر بھی کئی ایک کنویں تھے لیکن وہ سب آباد تھے۔ اس علاقہ میں غیر آباد بھی ایک کنواں تھا۔ لعل خان نے سوچا ہوگا کہ آبادی والے کنویں پر جاکر اگر وہ یہ کام کرے گا تو لوگ اسے کرنے نہ دیں گے اور اسے بچالیں گے۔ اگر وہ بچ گیا تو بھی اس کی موت ہے۔ لہٰذا اس نے خوب سوچ کر اس غیر آباد کنویں کا انتخاب کیا تھا جہاں پر کوئی اسے بچانہ سکے۔

لاش اٹھوائی گئی اور ضروری کارروائی کے بعد متوفی کے گھر ''وعومہ'' بھیج دی گئی اور ساتھ یہ پولیس بھی اس کے گاؤں پہنچ گئی۔ تھانیدار نے وہاں کے ایک گھر کی بیٹھک میں ڈیرہ جمالیا اور اقدام خودکشی کے تحت مقدمہ درج کرکے واقع کی تفتیش شروع کر دی۔

تھانیدار نے متوفی لعل خان کے گھر والوں اور رشتہ داروں کو بلوا لیا۔ اس کے دو بیٹے تھے جو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ بعد میں چھوٹا بیٹا ہمارے ساتھ پڑھتا بھی رہا اور جتنا عرصہ وہ پڑھتا رہا اسے اپنے ہم جماعت لڑکوں کی طرف سے ہمیشہ اس طنز کا سامنا کرنا پڑتا کہ ''یہ وہ لڑکا ہے جس کے باپ نے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی''۔ اس کے باپ کا یہ فعل بیٹے کے لئے ہمیشہ باعث ندامت بنا رہا۔

تھانیدار کے بلوانے پر متوفی کی بیوی سمیت سب رشتہ دار آ گئے تھے۔

متوفی کی بیوی سے جب ماجرا پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ''صبح صبح وہ یہ کہہ کر گھر سے نکلے تھے کہ شاہ جی نے بلایا ہے اور پھر واپس نہیں آئے اور اب ان کی میت آئی ہے''۔

شاہ جی کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ کون ہیں۔ تھانیدار نے ان کو بھی بلوالیا اور پوچھا کہ کیا ہوا۔ کہا۔ ''میں نے لعل خان کو کل بلایا ضرور تھا لیکن آج سویرے سویرے میں ایک ضروری کام کے لئے گھر سے نکل گیا اور لعل خان میری غیر حاضری میں میرے گھر آئے اور میرا پتہ کیا۔ میری اہلیہ کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے لعل خان کو بلایا ہوا ہے۔ لعل خان نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا تو اہلیہ نے دروازے کی اوٹ سے پوچھا کون ہے؟ کہا۔ میں لعل ہوں، شاہ جی گھر پر ہیں کیا؟ اہلیہ نے کہہ دیا کہ شاہ جی آتے ہیں تو تم سے پوچھتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہوئی اور اب ہم سب نے لعل خان کو مرا ہوا دیکھا ہے''۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن بات کا بتنگڑ بن گیا۔ لعل خان نے فی الواقع کنویں میں چھلانگ لگا دی اور اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ اس بے چارے کو اپنی بیوی اور معصوم بچوں کا بھی خیال نہ آیا کہ وہ کتنا بڑا قدم اٹھا رہا ہے۔ اس کے بعد ان کا کیا بنے گا۔ میرا تو لعل خان کی میت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ میرا دوست تھا جن تھا کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتا تھا''۔

آخر معلوم یہ ہوا کہ لعل خان انتہائی سادہ لوح اور پُر خلوص شخص تھا۔ وہ شاہ جی کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور وہ اسے کچھ نہ کچھ کام دے دیتے تھے۔ اس بار جب وہ شاہ صاحب کے بلانے پر ان کے گھر گیا اور جا کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اتفاق سے شاہ جی اس وقت گھر پر موجود نہ تھے تو اندر سے شاہ جی کی اہلیہ نے پوچھا کہ کون ہے؟ کہا لعل۔ بولیں۔ شاہ جی آتے ہیں تو تم سے پوچھتے ہیں۔ جبکہ بات کچھ بھی نہ تھی۔ ادھر لعل خان ڈر گیا اس نے سوچا نہ جانے شاہ جی آنے پر کیا خیال کریں اور اس کے بارے میں کیا سوچیں یا پھر اس سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو چکا ہے جس کی شاہ جی اسے کڑی سزا دیں گے۔ لہٰذا اب جینا بے کار ہے۔ اگر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ نہ کیا تو ضرور شاہ جی اس کی جان نکال لیں گے۔ بس اسی بات پر لعل خان نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

ادھر سلطان ملیار سے جب کنویں میں موجود ممکنہ اسلحہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے بتایا کہ اس نے کنویں میں کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہیں پایا۔ ممکنہ اسلحہ کے خوف سے لوگوں نے ایک مدت سے اس کنویں سے پانی نکالنا چھوڑ رکھا تھا اور کنواں ویران پڑا تھا لیکن سلطان ملیار کی جانب سے اسلحہ کی عدم موجودگی کی تصدیق کے بعد یہ کنواں پھر سے آباد ہو گیا۔ لوگ اس کنویں سے دوبارہ پانی نکالنے لگ پڑے۔ اس کنویں کی پھر سے آبادکاری میں متوفی لعل خان کا بہت حصہ ہے۔ لعل خان اگر اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے اس کنویں کا انتخاب نہ کرتا تو لوگوں کے دلوں میں نا معلوم کب تک اس کے اندر ممکنہ اسلحہ کا خوف جاگزیں رہتا اور وہ اس کنویں کا رخ نہ کرتے۔

یہ کنواں پھر سے آباد ضرور ہوا لیکن ایک انسانی جان کا نذرانہ لے کر۔

***

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

مرگی کا کامیاب علاج

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب و نفسیات

میرے پاس جو مریض آتے ہیں ان میں ذہنی معذور افراد، مرگی، جوڑوں کے امراض، فالج، جنسی امراض اور ایسے افراد ہیں جنہیں ایک لمبے عرصے تک علاج کے باوجود بھی شفا کا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا اور آ کر مجھ سے ایک سوال لازمی کرتے ہیں کہ جی ڈاکٹر صاحب کہیں دنیا میں اس مرض کا علاج ہے۔ یہاں پیٹ کے امراض میں بھی ایسے کئی کیس کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں اور وہ بے حد خوش ہیں۔ ایسا ایک کیس دو ماہ قبل بھی دیا جا چکا ہے۔ اپریل میں میں نے کوئی کیس نہیں لکھا، وجہ یہ تھی کہ میری تسلی کے مطابق کوئی کیس نہیں ہوا تھا، میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مریض صحت یاب ہو کر لاپتہ ہو گیا اور اس نے ہمیں نہ بتایا اور پھر کوئی مریض اس کے حوالے سے آیا تو ہمیں حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح کئی کیس رپورٹ ہونے سے رہ بھی جاتے ہیں۔

مجھ سے اکثر اصحاب گلہ کرتے ہیں کہ میرے کیس خاصے مختصر ہوتے ہیں تو جناب عرض یہ ہے کہ جو اصل ہوتا ہے میں اتنا ہی لکھتا ہوں، نہ کچھ گھٹاتا ہوں اور نہ ہی اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہوں کیونکہ اگر وہ مریض خود اپنی کیس پڑھے گا تو مجھے جھوٹا ہی کہے گا تو فائدہ کیا۔

اس ماہ دو کیس شفایاب ہوئے ہیں ان کی تفصیل دے رہا ہوں۔

پہلا کیس

یہ کیس گاؤں گرو چک، تحصیل ڈسکہ (پوسٹ آفس قلعہ کالر والا) ضلع سیالکوٹ کے ایک درمیانے سے زمیندار جناب محترم ابوالحسن کے پیارے بیٹے امیر حمزہ کا

ہے۔ جس کی عمر 16 سال ہے۔ انہوں نے 6-12-2014 کو ہمارے شعبہ طب ونفسیات (دستِ شفاء) سے رابطہ کیا۔

باپ بیٹا میرے پاس آئے اور بتایا کہ ہم "حکایت" کے قاری ہیں اور آپ کے کیس پڑھ کر بڑی امیدوں سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ بڑی تفصیل کے ساتھ ان کا کیس دیکھا گیا۔ معلوم ہوا کہ بیٹے کو پانچ چھ سال کی عمر میں بخار ہوا جس کے بعد مرگی کے دورے پڑنے لگے۔ اب پانچ سال ہو گئے ہیں ڈاکٹروں کے مشورے سے Epival اور Topmax گولیاں استعمال کر رہے ہیں۔ شروع میں قدرے آرام رہا مگر اب ان ادویات کا بھی پوری طرح اثر نہیں ہوتا۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ تمام عمر یہ ادویات نہ چھوڑنا ورنہ پچھتاؤ گے اور اس کے بغیر کوئی حل نہیں۔ دورے میں تمام جسم اکڑ جاتا ہے سوائے بازوؤں کے۔ بچے کی گردن میں بھی سخت اکڑاؤ ہے۔ رات کو تین بار پیشاب آتا ہے جلن دار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان ادویات اور بیماری کی وجہ سے چونکہ دماغ ٹھیک طرح کام نہیں کرتا اس لئے بچے کو سکول سے بھی اٹھالیا گیا ہے۔ بچہ سارا سارا دن اپنے خیالوں میں گم رہتا ہے اور سوالوں کے ٹھیک طرح جواب بھی نہیں دے سکتا۔ جواب دینے سے قبل خاصا سوچنا پڑتا ہے تب ہی جواب سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ انگلش بالکل نہیں آتی جس کی وجہ سے سکول جانے کو دل نہیں کرتا ہے۔ البتہ باہر یار دوستوں کے ساتھ گپ شپ اچھی لگتی ہے کبھی کبھار رات کو نیند بھی لیٹ آتی ہے۔ پہلے بچہ دوستوں کے ساتھ کوئی گیم بھی کر لیتا تھا مگر اب دل نہیں کرتا۔

سارا کیس تفصیل سے دیکھا گیا۔ چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے کے اندر بخار بھی رہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بچہ ہر کام کو جلدی کرنے کا عادی ہے۔ بچے کو ایک ماہ کی ادویات دی گئیں اور اس کے والد صاحب کو بتایا گیا کہ کم از کم 4 ماہ سے قبل علاج نہ چھوڑیں اور فی الحال اگر ضرورت ہو تو Epival دیں۔ ورنہ نہ دیں اور امید ہے کہ تقریباً دو تین ماہ کے اندر اچھا رزلٹ ہوگا اور اس کے بعد انگریزی ادویات کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ 5 جنوری 2015ء کو وقت لے کر باپ بیٹا دوبارہ پھر لاہور آفس میں آئے اور مندرجہ ذیل رپورٹ دی۔

پانچ دن کے بعد آرام شروع ہوا۔ پہلے ایک ایک گھنٹہ کا دورانیہ ہوتا تھا دورہ کا جو کہ کم ہوا ہے۔ پھر 12 دن کے بعد دورہ نہیں ہوا۔ (پہلے ناغہ نہیں ہوتا تھا) پھر ایک دن کا ناغہ/ وقفہ ہوا۔ پھر دو دن کا ناغہ ہوا۔ پھر 3 سے 11 یوم تک دورہ نہیں ہوا اور دورانیہ بھی کم ہوا۔ پہلے دورے کے دوران ہاتھ پاؤں ٹھنڈے رہتے تھے اب گرم ہوتے ہیں۔ گردن میں مستقل رہنے والا اکڑاؤ بھی اب کم ہے۔

سب قارئین اور معالجین اس بات پر اتفاق کریں گے کہ مندرجہ بالا رپورٹ نہایت حوصلہ افزا تھی۔ اور اس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی تھی کہ ادویات نے مرض کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاہم مریض بچہ ابھی ذہنی طور پر Under develop تھا۔ پھر ایک ماہ کی ادویات تھوڑے ردو بدل کے ساتھ دی گئیں اور چند ہدایات بھی دی گئیں جن میں سے خاص یہ تھیں۔

(1) بچے کو کسی گیم کی طرف راغب کریں۔

(2) بچے کو بے جا روک ٹوک نہ کیا کریں اور جہاں تک ممکن ہو شفقت سے پیش آئیں اور کوئی ٹینشن نہ دیں۔

اس دوران فون پر بھی رابطہ ہوتا رہا اور مختلف مسائل پر بات چیت ہوتی اور ہدایات دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ انہوں نے ہدایات پر پوری طرح عمل کیا اور ہم نے بھی دیانت داری سے کام کیا جس کا بہت اچھا رزلٹ نکلا۔

اگلی بار ادویات لینے کے لئے جب بھی آئے تو

بہت اچھی رپورٹ ملی اور انہوں نے کہا کہ اب ہفتے کے بعد دورہ پڑتا ہے اور انگریزی ادویات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور دورہ کا دورانیہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ اس دوران ایک وقوعہ یہ ہوا کہ ان کے خاندان میں کسی کی فوتگی بھی ہوئی جس کا بچے کے ذہن پر بہت منفی اثر پڑا۔ ادویات میں قدرے ردو بدل کیا گیا اور پھر سے شفایابی کا عمل دوبارہ شروع ہوا۔ اب پھر ان سے ہدایات پر عمل کرنے کا پکا وعدہ لیا گیا۔ جب وہ اگلی بار 11 اپریل 2015ء کو آئے تو بہت خوش تھے اور ساری تفصیلات بتائیں۔ اب گردن کا اکڑاؤ بھی ختم تھا اور دورہ صرف دس، پندرہ دن کے بعد ہلکا سا ہوتا تھا۔ نیند بھی ٹھیک تھی اور پیشاب کا مسئلہ بھی ٹھیک تھا۔ بچے کو گیمز میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور گھر کے کام کاج میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔

11 مئی 2015ء کو بچے کا والد اکیلے ہی دوا لینے آیا اور بتایا کہ اب ماشاء اللہ امیر حمزہ بہت ہی بہتر حالت میں ہے اور دوبارہ پڑھنا بھی چاہتا ہے۔ میں نے بھی انہیں بخوشی اجازت دی کہ بچے کو لازی پڑھنا چاہئے۔

(نوٹ: بچے کے والد سے جب کیس کو شائع کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دی اور پورا ایڈریس نام اور فون نمبر دینے کی بھی تاکید کی۔ ان کا فون نمبر 0300-7156514 ہے۔ تاہم ادارہ کی خواہش ہے کہ انہیں بے جا تنگ نہ کیا جائے کیونکہ ہر بندے کی پرائیویٹ مصروفیات بھی ہوتی ہیں۔ شکریہ!)

دوسرا کیس

یہ کیس پاکستان کے ایک مشہور شہر راولپنڈی سے تعلق رکھتا ہے۔ بچے کا نام دانیال ہے اور عمر سات سال ہے۔ اس کی والدہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ بچے کی Left Eye Lid کے اوپر ایک خاصی بڑی Hard Cyst ہے جو کہ عرصہ تقریباً تین سال سے بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ سے آنکھ بھی نہیں کھلتی اور دیکھنے میں بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں آنکھوں سے گندہ خراشدار مواد بھی نکلتا ہے۔ بچے کے ابو ایک سرکاری آفیسر ہیں۔ کئی بار نامور ڈاکٹروں کو دکھایا مگر سب کی ایک ہی رائے ہے کہ جی آپریشن ہوگا۔ اوپر سے کاٹ دیں گے پھر ساری عمر ایسے ہی چلتا رہے گا۔ فکر نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بچے کی ہسٹری لی میڈیکل تفصیلات دیکھیں پھر ایک ماہ کی ادویات دیں۔ تقریباً 20 دن کے بعد ہی فون پر بچے کی والدہ نے بتایا کہ 50 فیصد تک آرام ہے۔ Cyst بہت کم ہوگئی ہے اور گندے مواد کا نکلنا بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے بہت حیرت کے ساتھ ساتھ بے حد خوشی بھی ہوئی۔ پھر ایک ماہ کی ادویات دی گئیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ کسی قسم کی تکلیف یا نئی علامات کے بغیر ہی یہ کیس کلیئر ہوگیا۔ بچے کے والدین بھی بہت حیران اور خوش ہیں اور یہ کیس ان ڈاکٹروں کے لئے بھی ایک Chalange ہے۔ خاص بات اس کیس کی یہ ہے کہ بچے کو صرف کھانے والی ہومیوپیتھک ادویات دی گئیں۔ کوئی لوکل میڈیسن یا آنکھوں میں ڈالنے کی دوا نہیں دی گئی۔

نوٹ: (1) اگر کوئی میڈیکل سٹوڈنٹ مجھ سے ادویات کے بارے میں پوچھے تو فری بتاؤں گا اور اگر کوئی ڈاکٹر پوچھے تو فیس دینی پڑے گی۔

(2) اس ماہ راولپنڈی اسلام آباد کا پروگرام رکھا ہے۔ دو دن کے لئے اب ملتان والے بھی اصرار کر رہے ہیں جو مریض وہاں ملنا چاہیں جناب عارف صاحب سے اس فون نمبر 0323-4329344 پر رجوع کریں اور اپنا نام پتہ اور مسئلہ لکھوادیں۔

(3) عید کے بعد فیصل آباد کے دورہ کے بارے میں مطلع کیا جائے گا۔ انشاء اللہ!

O*O

نوجوان خطرناک نتائج کے باوجود ایسی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں اور یہ واقعات کیوں جنم لیتے ہیں؟ جہاں تک شادی اور جیون ساتھی کے چننے کا مسئلہ ہے تو یہ انسانی ضرورت بھی ہے، فطری امر بھی اور شرعی حکم بھی۔

یہ محبت کی شادیاں

☆ عبدالوارث ساجد

ایک ہفتہ قبل بشریٰ گھر سے بھاگ گئی اور اس نے عدنان عمر سے شادی کر لی۔ عدنان عمر بھی گھر چھوڑ کر دور منتقل ہو گیا۔ لڑکی کا ماموں اشفاق بھی اسی محلہ میں رہتا تھا۔ بشریٰ کے اپنی مرضی سے شادی کر لینے کا اس کو بھی رنج تھا۔ جمعہ کو محلہ میں کسی کی شادی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس میں شرکت کے لیے آئے۔ یہ دیکھ کر لڑکی کے ماموں اشفاق کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اپنا غصہ دونوں پر ظاہر نہ ہونے دیا اور انہیں شادی کی مبارک باد دے کر کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ دونوں اس کے گھر ضرور آئیں۔

پولیس کے مطابق رات کو دونوں شادی سے فارغ ہو کر لڑکی کے ماموں اشفاق کے گھر چلے گئے جہاں اس نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر ان کو پلائی اور بعد میں باری باری دونوں کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور ان کی نعشیں بوری میں بند کر کے چوک پٹواریاں میں پھینک دیں۔ صبح ''بیت ابراہیم'' کی دیوار کے پاس دو پُر اسرار بوریاں دیکھ کر علاقہ میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ یہ سمجھے کہ شاید ان میں بم ہیں پولیس کو اطلاع کی گئی لیکن پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی بعض نوجوانوں نے بوریاں کھولنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ اس میں نعشیں ہیں۔ پولیس نے سینکڑوں مکینوں کی موجودگی میں بوریاں کھولیں تو ان میں سے بدنصیب جوڑے کی نعشیں برآمد ہوئیں۔

دونوں اچھے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ لڑکی نے بھاری میک اپ کر رکھا تھا اور مرنے کے بعد بھی اس کے گلے میں طلائی چین اور کانوں میں کانٹے تھے۔ بوریوں سے نعشیں برآمد ہوتے دیکھ کر موقع پر موجود خواتین اور بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ متعدد خواتین یہ منظر نہ دیکھ سکیں اور واپس لوٹ گئیں۔ ایک عورت نے لڑکی کی نعش کو پہچان لیا اور ''ہائے میری بشریٰ'' کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔ پولیس

کے مطابق ملزم اشفاق فرار ہو گیا ہے۔

یہ ایک واقعہ نہیں۔ لومیرج کرنے والے جوڑوں کے ایسے بھیانک اور عبرتناک انجام کے واقعات روز سننے کو ملتے ہیں۔ طلاق اور خودکشی کی خبریں آئے روز اخبارات میں آتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے، محبت کی شادی کے ایسے بھیانک انجام کے واقعات سننے اور پڑھنے اور چینلو پر دیکھنے کے باوجود بھی ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے حالانکہ اسلامی تعلیمات میں لومیرج کا تصور نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی تعلیمات کے برعکس ہے۔

لومیرج کرنے والوں کی شادی سے پہلے ہی محبت بہت عروج پر چلی جاتی ہے اور توقعات جو وہ ایک دوسرے سے لگاتے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی غلطیوں اور کوتاہیوں سے سے چشم پوشی کرتے ہیں (صرف شادی کے لئے) مگر بعد میں ان غلطیوں کو برداشت کرنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اکثر یہ شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں بڑوں کی طرف سے طے کردہ شادی کے معاملات میں چونکہ مذکورہ باتیں نہیں ہوتیں اس لئے وہ عموماً ناکام نہیں ہوتیں۔

لومیرج کو بنیاد بنائیں گے تو یہ بنیاد کمزور ہوگی۔ آج اس کا حشر ہم مغربی معاشرے میں دیکھ رہے ہیں۔ لو آفٹر میرج کا مطلب ہے کہ جب ماں باپ نے وکیل بن کر لڑکے کے لئے بہتر لڑکی تلاش کر لی اور لڑکی کے لئے بہتر لڑکا تلاش کر لیا تو اب وہ میاں بیوی بن چکے۔ اب انہیں ایک دوسرے کے ساتھ محبت پیار سے زندگی گزارنی چاہئے۔ وہ جس قدر محبت اور پیار سے زندگی گزاریں گے، اس پر انہیں اجر و ثواب ملے گا۔ بیوی خاوند کو دیکھ کر مسکراتی ہے اور خاوند بیوی کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

محبت کی شادیاں......ناکام شادیاں

محبت کی شادیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ میاں بیوی کا ایک دوسرے کی توقعات پر پورا نہ اترنا ہے۔ یہ بات سوشل ایڈ آرگنائزیشن (ساؤ) شعبہ خواتین کی جانب سے کئے گئے ایک حالیہ سروے میں سامنے آئی ہے۔ تنظیم کی جانب سے ''ارینج میرج'' اور ''لومیرج'' کی کامیابی کے تناسب پر کرائے گئے سروے میں پتہ چلا ہے کہ ارینج میرج کی صورت میں ناکامی کا تناسب صرف انتالیس فیصد ہوتا ہے اور ناکامی کی صورت میں فریقین کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے جبر سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہتے ہیں۔ طلاق کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ارینج میرج کی شکل میں طلاق کا تناسب اعشاریہ سات فیصد جبکہ محبت کی شادیوں میں طلاق کا تناسب چھ فیصد ہے اور محبت کی اَسّی فیصد شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ لومیرج کرنے والے جوڑے کے خاندان بھی اختلافات کی صورت میں ان جوڑوں کے مابین صلح کروانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اہل خانہ کی کوشش ہوتی ہے کہ میاں بیوی کو اپنی مرضی کرنے کی سزا ملے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو۔ اگر انہیں کوئی مسئلہ درپیش ہو جائے تو خاندان والے عموماً سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالات کے دباؤ کی وجہ سے فریقین ایک دوسرے کو مشکلات کا باعث سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے پر طعنہ زنی بھی کی جاتی ہے۔ محبت کی شادیوں میں فریقین کو ایک دوسرے سے توقعات بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ مخالف فریق اس کے ساتھ وہی رویہ رکھے جس کی وہ شادی سے پہلے قسم کھاتا تھا۔ لومیرج کے بعد مرد روزگار کی تلاش میں اور خواتین گھریلو کاموں میں مصروف ہو کر پہلے والا رویہ رکھنے میں ناکام ہو جاتی

ہیں۔

ناقدری کا احساس بھی جھگڑے کی بنیاد بن جاتا ہے جب کہ ارینج میرج کے صورت میں فریقین کسی بھی قسم کی توقعات نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ لومیرج کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان پہلے سے ہی بے تکلفی ہوتی ہے اور وہ برابری کی بنیاد پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ برابری کا عدم توازن بھی اختلافات کا سبب بن جاتا ہے۔ ارینج میرج کی صورت میں اگر خاندانوں کے تعلقات آپس میں اچھے ہوں تو اس کا اثر جوڑوں کی ازدواجی زندگی پر بھی خوشگوار ہی ثابت ہوتا ہے جب کہ لومیرج کرنے والے جوڑے مشترکہ خاندانی نظام میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے۔ شادی سے پہلے کی انڈرسٹینڈنگ عملی زندگی میں ناکام ہو جاتی ہے کیونکہ شادی کے بعد کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ارینج میرج کی شکل میں گھر والے لڑکے اور لڑکی کی پسند کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکی اور لڑکے کی تعلیم اور حیثیت میں زیادہ فرق محسوس نہیں کیا جاتا اور والدین اپنی اولاد کے ذہنوں کو سمجھتے ہوئے رشتہ طے کرتے ہیں۔

رات کا چین نہ دن کا سکون

ہمارے ہاں لومیرج کی جو وبا نوجوان نسل میں پھیل چکی ہے اس کی وجہ سے معاشرے میں جو ناسور اور انتشار پھیلا ہوا ہے اس کے ساتھ انسانی زندگی بھی اجیرن ہوگئی ہے۔ لڑکی کے گھر والے زندہ ہی درگور ہو جاتے ہیں لیکن لڑکے والوں کو بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ معاشرے میں خاندانی جھگڑوں میں اضافہ اور دیگر مسائل کے انبار صرف اسی لومیرج کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق سال 2012ء کے پہلے چھ ماہ میں محبت کا ناکام یا لومیرج سے پیدا ہونے والے مسائل گھریلو جھگڑے، طلاق میں اضافہ جیسی پریشانیوں کی وجہ سے 63 فیصد افراد نے خودکشی کی جن میں 73 مرد اور 90 عورتیں شامل ہیں۔ ان میں سے 70 فیصد نے زہر، 14 فیصد نے تیل چھڑک کر اور 6 فیصد نے گاڑیوں تلے آ کر جان دی۔

یہ رپورٹ صرف صوبہ پنجاب کی ہے جبکہ پاکستان کے دیگر تین صوبوں سندھ، سرحد اور بلوچستان کے شہروں، دیہاتوں میں اس لومیرج اور محبت کی ناکامی کی وجہ سے کتنے افراد اجل کے منہ میں گئے، اس کا اندازہ پنجاب کی اسی رپورٹ سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

صوبہ پنجاب میں 73 مرد اور 90 عورتوں سمیت مرنے والے ان انسانوں کے علاوہ 42 مردوں اور 47 خواتین نے بھی خودکشی کی کوشش کی تاہم وہ دیگر اسباب کی بنیاد پر جان بچانے میں کامیاب رہے۔ اس رپورٹ میں بھی وہی لوگ شمار ہو سکے جن کے کیسز کسی تھانہ کچہری میں درج ہو سکے۔ جب کہ کتنے ہی ایسے مرد و زن ہیں جنہوں نے خودکشی کی اور ان کا اندراج کسی تھانہ میں نہ ہو سکا اور یوں وہ اس تحقیقی رپورٹ میں شامل نہ ہو سکے۔ پھر بھی اگر چھ ماہ میں اس تعداد کو دیکھا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کس دلدل میں پھنستا چلا جا رہا ہے اور نوجوان نسل محبت کے نام پر موت کو سینے سے کس قدر تیزی سے لگانے میں مصروف ہے۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔

علاوہ ازیں اس رپورٹ میں قابل غور بات یہ ہے کہ محبت کرنے اور پھر ناکامی کے بعد پریشانی کا شکار ہونے پر خودکشی کرنے والوں کی زیادہ تعداد لڑکیوں پر مشتمل ہے جو اپنے مستقبل کو حقیقت کا روپ دیتے ہوئے کسی دل پھینک لڑکے کے دام فریب میں آ جاتی ہیں اور چند روز کی سیر و سیاحت کے بعد جب عصمت گوہر سے محروم ہو جاتی ہیں تو پھر نہ کسی محبوب کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی

عاشق کا۔ پھر حوا کی بیٹی کو پتہ چلتا ہے کہ شادی کا جھانسہ دینے والا اصل میں عزت کا لٹیرا تھا اور آسمان سے چاند تارے توڑ کر لانے کے وعدے کرنے والا دغاباز تھا۔ اب لڑکی کے لئے سوائے پریشانیوں، گلی محلے کے طعنوں اور ماں باپ کی رسوائی اور خود کی عزت چلے جانے کے بعد ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کرتی ہے اور اپنی زندگی کے خاتمے کے ساتھ والدین کی زندگی مزید اجیرن کرتی ہوئی اگلے جہان کو سدھار جاتی ہے اور اگر کوئی لڑکی شادی کے مراحل سے گزر بھی جائے تو اس کے بعد اس پر کیا گزرتی ہے، وہ اسی مضمون میں پڑھا جاسکتا ہے۔

منہ بولتا ثبوت

ایک اخباری خبر کے مطابق ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے لوئر کالونی میں محبت کی شادی کا انجام خونی واردات کی شکل میں سامنے آیا۔ بیوی نے اپنی بہن کے ساتھ مل کر خاوند، ساس اور سسر سمیت پانچ افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ دونوں بہنیں تھانے میں خود پیش ہو گئیں۔ تفصیلات کے مطابق ایک سال قبل لوئر کالونی کے رہائشی وریام گادھی کے لڑکے شوکت نے مدینہ بلاک کے شیخ مبارک کی دو لڑکیوں عابدہ اور کوثر کو اغوا کر کے ایک لڑکی عابدہ سے کورٹ میرج کر لی۔ شادی کے چند ماہ بعد میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا اور وہ جھگڑا طوالت اختیار کر گیا اور دونوں بہنوں نے تھانہ پیر محل میں گادھی خاندان کے خلاف درخواست دے دی مگر پھر صلح ہو گئی۔ اس کے بعد مقتول شوکت گادھی نے عابدہ جو کہ شوکت گادھی کے بیٹے کی منکوحہ ہے، کی بہن کوثر پر تشدد کیا جس کا دونوں بہنوں کو شدید رنج تھا اور گزشتہ شب دونوں بہنوں نے گھر والوں کو دودھ میں نشہ آور گولیاں پلا کر اپنے سسر گادھی اور ساس اللہ وسائی، خاوند شوکت، وریام گادھی جو کے داماد اور بیٹی کو رات تقریباً دو بجے 22 بور پسٹل کے فائر کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد گھر کو آگ لگا دی جس سے گھر کا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا اور دونوں قاتلہ بہنیں خود جا کر تھانہ میں پیش ہو گئیں۔

احاطۂ عدالت میں لڑکی کو برہنہ کر دیا

محبت و عشق کے چکر چلا کر خاندان سے بغاوت اور اس کے بعد لو میرج کو مغربی معاشرے میں برداشت کر لیا جاتا ہے البتہ مشرقی معاشرے میں اس کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ہمارا مذہب کے اس بے حیائی کی اجازت دیتا ہے۔ اصولاً یہ بات بھی قابل برداشت نہیں کہ ایک لڑکی کو اس کے والدین 18 یا 20 سال تک پالتے پوستے ہیں، اس کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں اور جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تو ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملاتے ہوئے کسی نامعلوم آوارہ عاشق لڑکے کے ساتھ بھاگ کھڑی ہو، ایسی لڑکی پر اس کے والدین، بھائی یا پھر دیگر رشتہ دار غضبناک ہو جاتے ہیں۔

کہروڑ پکا میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لو میرج کر کے خاندان کی عزت کی نیلامی پر اس کے عزیز و اقارب نے احاطۂ عدالت میں ہی اس بدمزاج کو ناک، کان اور بال کاٹ کر باعث عبرت بنا دیا۔ تفصیلات کے مطابق کہروڑ پکا کے نواحی موضع واہی نو کی رہائشی کنیز مائی نے محبت کر کے محمد اعظم ولد پٹھانا سے شادی کر لی جس پر اس کے بھائی محمد اقبال نے محمد اعظم کے خلاف تھانہ دھنوٹ میں حدود کا مقدمہ درج کروا دیا۔ محمد اعظم نے ایڈیشنل سیشن جج کہروڑ پکا کی عدالت سے عبوری ضمانت کروالی۔ چند روز بعد کنیز مائی ایڈیشنل سیشن جج کہروڑ پکا کی عدالت میں بیان دینے کے لئے اپنے خاوند اعظم کے ہمراہ گاڑی میں آئی تو وہاں پر پہلے سے موجود اس کے رشتہ دار مسلح ہو کر عدالت کو گھیر چکے تھے۔ ان کی گاڑی کو بھی گھیر لیا گیا اور زبردستی کنیز مائی کو گاڑی سے نکال کر تھپڑوں، مکوں کی

بارش کردی، کنیز مائی کے ساتھ آئے ہوئے کچھ ساتھیوں نے مزاحمت کی کوشش کی تو ملزموں نے ان پر بھی اسلحہ تان لیا۔ ملزموں نے کنیز مائی کو برہنہ کیا اور تشدد کرتے رہے۔ اس نے مدد کے لئے چیخ و پکار کی تو اس کے منہ پر جوتیاں برسا دیں۔ موقع پر موجود پولیس اہلکار تماشا دیکھتے رہے۔ بعدازاں ملزم لڑکی کو برہنہ حالت میں آدھ کلومیٹر تک گھسیٹتے ہوئے سرکلر روڈ تک لے آئے اور اس کے بال اور ناک کاٹ ڈالی اور پھر اغوا کر کے لے گئے۔

اب کوئی بھی صاحب عقل آدمی سوچے کہ ایسی شادی کا کیا فائدہ جس سے عزت بھی برباد ہو اور خاندان میں بھی بدنامی کا داغ لگ جائے اور شادی کے بعد سکون و اطمینان کی بجائے عدالت اور کورٹ کے چکر کاٹنے پڑیں۔

بیوی کو قتل کر کے نوجوان نے خودکشی کر لی

جنوبی چھاؤنی لاہور میں 3 ماہ قبل لو میرج کرنے والے خاوند نے بیوی کو قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی۔ بتایا گیا ہے کہ یمن آباد کے رحمان نے چند ماہ قبل بیرون ملک سے واپس آ کر بیدیاں روڈ گلشن پارک کے ٹیلر ماسٹر انور کی بیٹی گلشن سے لو میرج کر لی اور سسرال کے قریب ہی علی ویو پارک میں مکان لے کر رہنا شروع کر دیا۔ گزشتہ روز ماسٹر انور نے پولیس کو اطلاع دی کہ اس کی بیٹی اور داماد دو دن سے نظر نہیں آئے اور گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا جا رہا ہے۔ جس پر پولیس نے بیڈ روم کا دروازہ توڑا تو اندر بیڈ پر دونوں میاں بیوی کی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کے سر میں ایک ایک گولی لگی ہوئی تھی جبکہ رحمان کی نعش کے قریب ہی پستول پڑا تھا۔ پولیس کے مطابق حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمان نے بیوی کو مارنے کے بعد خودکشی کر لی ہے۔

سروے رپورٹ

اس معاملے پر ایک سروے کرایا گیا تو 62 فیصد افراد کی یہ رائے تھی کہ شادی والدین کی مرضی سے ہونی چاہئے۔ ماں باپ کی عزت خاک میں ملا کر خوشی حاصل کرنا انسانیت نہیں۔ والدین اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ یورپ نے اپنی معاشرتی تباہی کے بعد خاندانی نظام کی اہمیت تسلیم کر لی لیکن ہم اس کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ لڑکا شادی سے پہلے لڑکی کو سبز باغ دکھاتا ہے، بعد میں نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسلام نے بھی شادی کے معاملے پر لڑکے اور لڑکی کی رضامندی جاننے کی اجازت دی ہے۔ اپنی مرضی کی شادی کے باعث طلاق کی شرح میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے، مغرب میں پسند کی شادی کی وجہ سے جو برائیاں پھیل رہی ہیں، ہمارا معاشرہ ان کا قطعاً متحمل نہیں ہو سکتا۔

لڑکا شادی سے پہلے تو لڑکی کو سبز باغ دکھاتا ہے بعد میں لڑکی کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ والدین کو فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شادی کے لئے لڑکی اور لڑکے کی رضامندی بھی لینی چاہئے۔ اس سے بے شمار مسائل خود بخود دم توڑ دیں گے۔

صرف 38 فیصد افراد نے پسند کی شادی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ایک خاتون نے کہا کہ وہ والدین سے اپیل کرتی ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے کی رائے خاص طور پر معلوم کر لیں کیونکہ میرا شوہر اب بھی اپنی پہلی پسند کو چاہتا ہے۔ برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی نے کہا کہ یورپ نے اپنی معاشرتی تباہی کے بعد خاندانی نظام کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اخلاقی قدروں کی پاسداری پر بہت زور دیا جا رہا ہے لیکن ہم یورپ کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اپنے مسائل میں اضافہ کر رہے ہیں۔ والدین کے لئے اولاد

سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں ہوتی۔ وہ کبھی بھی اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہتے۔ اس لئے شادی میں ان کی رائے کو فوقیت ملنی چاہئے۔ ایک شہری نے کہا کہ ہر چیز کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی لہٰذا والدین کی مرضی کے ساتھ لڑکے اور لڑکی کی پسند کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے تو بہتر ہے۔

سوال یہ ہے کہ نوجوان خطرناک نتائج کے باوجود ایسی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں اور یہ واقعات کیوں جنم لیتے ہیں؟ جہاں تک شادی اور جیون ساتھی کے چننے کا مسئلہ ہے تو یہ انسانی ضرورت بھی ہے، فطری امر بھی اور شرعی حکم بھی۔

مرد عورت کی ازدواجی زندگی کے بارے میں تو اسلام کا تصور ہی یہ ہے کہ یہ تعلق (یعنی نکاح) زندگی بھر کی رفاقت نبھانے اور ایک دوسرے کے ساتھ وفا کرنے کا تعلق ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ خاص طور پر فریقین کے دلوں میں محبت اور مودت کے جذبات پیدا فرما دیتے ہیں حتیٰ کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی قربت سے سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ازدواجی تعلق کی اس چھوٹی سی اکائی کے اندر نظم وضبط، اتحاد اور یکجہتی کو اسلام کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کا اندازہ ان حقوق سے لگایا جا سکتا ہے جو اسلام دونوں کے لئے متعین کرتا ہے۔ رہی بات یہ کہ ایسے واقعات کیوں پیدا ہوتے ہیں تو اس کی بڑی وجہ ہمارا میڈیا ہے۔ میڈیا ایک ایسا محاذ ہے جس کے ذریعے قوم کو جس سمت بھی چلایا جاتا ہے وہ اس راستے پر گامزن ہو جاتی ہے۔

آج کل ٹی وی پر دکھائے جانے والے ڈرامے مادر پدر آزاد ماحول سے مزین ہوتے ہیں، ان میں معاشرتی مسائل کے اصلاحی پہلو اجاگر کرنے کی بجائے بگاڑ کے مواقع نظر آتے ہیں۔ عشق و محبت کے مناظر، پارکوں، سکولوں اور کالجوں میں مخلوط لوسین، کورٹ میرج کی عکس بندی اور اس کے ساتھ ساتھ ڈائجسٹ رسائل میں عشقیہ کہانیوں افسانوں کے ہی کردار نسلِ نو کو ایسے افعال پر ابھارتے ہیں۔

انسان خدا کی بہترین مخلوق ہے اس لئے اسے اشرف المخلوقات بھی کہا جاتا ہے اور ہر انسان کو اپنی زندگی اپنی سوچ اور مرضی سے گزارنے کی بجائے ان حدود وقیود میں گزارنی چاہئے جو اس کے خالق و مالک نے مقرر کی ہیں۔

جہاں تک شادی کا تعلق ہے، یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جو انسان جوان ہونے کے بعد ہمیشہ کے لئے اٹھاتا ہے۔ میاں بیوی کا عمر بھر کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اس تعلق کو قائم کرنے کے لئے، یعنی شادی کرنے کے لئے ہر انسان کو اس مسئلہ میں اسلامی تعلیمات اور شریعت کے فرامین کو لازماً سامنے رکھنا چاہئے۔ نوجوانوں کے اکثر کام جذباتی ہوتے ہیں جن میں ایک محبت بھی ان جذبات سے جنم لیتی ہے۔

ابتدائی عمر کی لڑکیوں اور لڑکوں کا ذہن ناپختہ ہوتا ہے۔ ان میں میچورٹی نہیں ہوتی اور اس وقت انہیں صرف محبت ہی دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی خامیوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے مگر جب وہ اپنے والدین کو نظرانداز کر کے محبت کی شادی کر لیتے ہیں تو بعد میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہی محبت اب نفرت میں بدل جاتی ہے اور یوں رفتہ رفتہ محبت کی شادی نفرت میں بدلتی جاتی ہے۔ محبت کی شادی کے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ محبت کی شادی ایک جذباتی فیصلہ ہوتا ہے اور یہ دیرپا نہیں ہوتا۔

پھر سب سے بڑی بات کہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہمارا معاشرہ بھی اسے قبول نہیں کرتا اور ہر طرح سے اس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ محبت کی شادی کی ناکامی کے مذکورہ واقعات اس بات کا زندہ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

سلسلہ وار ناول

گیارہویں قسط

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت۔

درِ زنداں

رزاق شاہد کوہلر

اندر داخل ہوتے ہی سوزکی کار رک گئی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر صمد یار خان کے دونوں آدمی باہر آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ اس نے صرف ایک گن مین بھیجنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ میری نظریں عقبی نشست پر بیٹھے وجود پر گڑی تھیں...... عدنان نے جلدی سے آگے بڑھ کر عقبی نشست کا دروازہ کھولا...... وہ باہر آتے ہی اپنے بھائی سے لپٹ گئی...... عدنان نے جانے اس کے کان میں کیا کہا کہ ایک جھٹکے سے اس نے میری جانب دیکھا...... اس کی سیاہ غزالی آنکھیں شدت حیرت سے مزید پھیل گئی تھیں۔ میرا سارا جسم بھی جیسے شل ہو گیا تھا، میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ وہی تھی...... میرے سپنوں کی تعبیر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ عدنان اسے لے کر کمرے کی طرف بڑھا...... کمرے میں داخل ہونے تک اس کی نگاہیں مجھ پر گڑی رہیں، میری آنکھیں بھی اسی کے ملیح چہرے پر چپکی تھیں...... صمد یار خان کے آدمی کس وقت رخصت ہوئے مجھے علم نہیں تھا...... میں وہیں ہکا بکا کھڑا کمرے کے خالی دروازے کو تک رہا تھا جہاں سے گزر کر میری جانِ حیات اندر داخل ہوئی تھی۔

داؤد خان نے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کہاں کھو گئے ہو میاں؟''

''لالہ!...... وہ...... وہ...... وہی ہے۔'' میں گڑبڑا گیا تھا۔

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کون وہی ہے یارا......''

''سائرہ وہی ہے...... لالہ!...... میرے خوابوں میں آنے والی۔''

''اچھا!...... نئی بات بتائی ہے۔''

''سوری داؤد لالہ...... پر مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا...... آپ نہیں جانتے وہ میرے لیے کیا ہے؟'' میں جذباتی ہو گیا تھا۔

''شاید تم بھی نہیں جانتے کہ تم اس کے لئے کیا ہو؟...... لڑکی ہونے کے باوجود وہ اپنے حواس سے باہر ہو گئی ہے...... دیکھا نہیں کمرے تک جانے کے لیے اسے اپنے بھائی کا سہارا لینا پڑا۔''

''اندر جائیں لالہ!......؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں......''

اس نے کہا۔ ''ہاں چلو......'' اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا۔ اسی وقت اندرونی کمرے سے عدنان باہر نکلا۔

''شیر دل خان!...... جاؤ اس سے مل لو...... یوں بھی اب وہ تیری منگیتر ہے۔''

میں نے داؤد لالہ کی طرف دیکھا...... اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا......

''ہاں یار!...... اسے مل لو...... اب تم ایک دوسرے کے لیے غیر نہیں ہو کہ عدنان کو شرمندگی محسوس کرنے کی ضرورت پڑے۔''

میں من من وزنی قدموں سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھا...... دروازہ ہلکے سے ناک کرتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی...... اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ میرے قدم ایک بار پھر زمین میں گڑ گئے تھے...... خواب گاہ کی آف وائیٹ دیواریں مجھے پھولوں کے کنج کی طرح لگ رہی تھیں، شاید میں پھر خواب دیکھ رہا تھا، میرا حلق خشک تھا۔ جانے کتنی دیر میں دیدے پھاڑے اسے گھورتا رہا۔ اس کی سیاہ غزالی آنکھیں بھی میری جانب متوجہ تھیں۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے ہونٹوں کو حرکت دی...... ایک سرگوشی سی میرے ہونٹوں سے برآمد ہوئی، گہری خاموشی میں یہ سرگوشی بھی کسی چیخ کی مانند تھی۔ میں نے فقط اس کا نام پکارا تھا۔

''سس......سائرہ۔''اس ایک نام کی ادائی نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وہ سپنا نہیں تعبیر تھی۔

''جی......''اس کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا۔

میرے قدموں میں حرکت ہوئی اور میں اس کی جانب بڑھا......اس نے حیا سے سر کو نیچے جھکا لیا تھا، میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا اس نے غزالی آنکھوں کی جھالر اٹھائی مگر اس کا سر اسی طرح حیا کے بار سے جھکا رہا......وہ ایسا نظارہ تھا جو اس دن کے بعد کبھی بھی میری نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔

''کیا یہ حقیقت ہے؟''میں نے اس کا ملائم ہاتھ تھامتے ہوئے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''شاید۔''اس کی شہد بھری آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

''میرا نام شیر دل خان ہے۔''

''ہاں......بھیا نے بتا دیا تھا۔''اس کی آواز گویا کسی مدھر ساز کی مانند تھی۔

''قید میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں بس ڈری ہوئی تھی۔''

''اچھا بیٹھو......''بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کرسی سنبھال لی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا......آپ میرے سامنے ہیں۔''

''میں نے بھی تمھیں اتنی مرتبہ خواب میں دیکھا ہے کہ آج حقیقت بھی خواب محسوس ہو رہی ہے۔''

''بھیا بتا رہے تھے کہ انکل اور ابو جان نے ہم دونوں......''سوال پوچھتے پوچھتے وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

''ہاں یہ سچ ہے......کہ میں دنیا کا خوش ترین مرد ہوں۔''

''شاید!......مجھ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں آپ؟''وہ حیا سے بوجھل آواز میں بولی۔

''اچھا پتا ہے......؟ دن بھر میرے ساتھ جو واقعات بھی پیش آتے تھے، ان کا اثر سپنے میں بھی تمھارے چہرے پر نظر آتا تھا......میرے اچھے کام پر تم خوش نظر آتیں اور غلط کام پر خفا خفا سی لگتیں۔''

وہ حیرانی سے بولی۔''میرے ساتھ بھی بعینہ یہی ہوتا تھا......شاید قدرت نے ہمیں بنایا ہی ایک دوسرے کے لیے ہے؟''

''یقیناً!''میں چاہت بھرے لہجے میں بولا۔اور اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔

اس نے دلچسپی سے پوچھا۔''اچھا میں کس بات پر آپ سے خفا ہوتی تھی......؟''

''سائرہ!......اس کے لیے مجھے اپنی پوری زندگی سے پردہ اٹھانا ہوگا......کیا اتنا ٹائم ہوگا تمھارے پاس کہ میری بور کہانی سن سکو؟''

''آپ کی آواز سننا میرے لیے سپنے جیسا ہے......ایسا سپنا جو میں دیکھ دیکھ نہیں تھکتی۔''

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چند لمحوں میں وہ میرے اتنے قریب آ جائے گی، مجھے اتنی توجہ دینا شروع کر دے گی، مگر شاید میں غلط کہہ رہا ہوں یہ چند لمحوں کی بات نہیں بلکہ پچھلے کئی ماہ سے وہ میرے سپنوں کی زینت بنی ہوئی تھی......ہم بظاہر پہلی بار مل رہے تھے ورنہ حقیقت میں ہماری روحوں نے جانے کب سے ایک دوسرے کو چن لیا تھا۔

میں اسے اپنی کہانی سنانے لگا......وہ ہمہ تن گوش ہو گئی اور پھر میں بمشکل اپنی بات ختم کر پایا تھا کہ ملازمہ ڈنر کے لیے بلانے آ گئی۔کھانے کی ٹیبل پر عدنان اور داؤد لالہ ہمارے منتظر تھے۔سائرہ عدنان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ڈنر میں ہلکی پھلکی گپ شپ ہوتی رہی۔ڈنر کے بعد ہم کافی

دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے...... البتہ سائرہ چائے پی کر سونے چلی گئی تھی۔ ہم صمد یار خان کے خلاف حکمتِ عملی ترتیب دینے لگے

☆☆☆

اس رات بھی وہ میرے سپنے میں آئی مگر نہ تو چپ تھی اور نہ پریشان...... اپنے نقرئی قہقہوں کے نغمے میرے کانوں میں بکھیرتی وہ کوئل جیسی آواز کا جادو جگاتی رہی...... اور پھر پلک جھپکنے میں رات بیت گئی...... صبح اذان کے ساتھ میری آنکھ کھلی اور میں اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ لے کر میں نے نماز پڑھی اور ارشد کو کال کرنے لگا، کافی دنوں سے اس کے ساتھ بات نہیں ہوئی تھی۔ کافی دیر کوششوں کے بعد موبائل فون کے سپیکر سے اس کی نیند میں ڈوبی...... ''ہیلو'' برآمد ہوئی۔

میں نے اطمینان سے پوچھا۔ ''سو تو نہیں رہے تھے یار!......؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''نہیں...... لنچ کر رہا تھا۔'' اور مجھے ہنسی آگئی۔

وہ غصے سے دھاڑا۔ ''کم بخت پٹھان!...... میرے لیے یہ آدھی رات کا ٹائم ہے۔''

''تو ہو......؟ کال تو میں نے کی ہے؟ ...... اور میرے لیے یہ صبح کا سہانا ٹائم ہے۔''

''اچھا بکو! ...... تمھارے پیٹ میں درد کیوں ہو رہا ہے؟''

''سنو گے تو...... شاید خوشی سے جھوم اٹھو۔''

''بھئی! ...... فی الحال میرا ارادہ، چند گھنٹے مزید سونے کا ہے اس لیے تیری بکواس بعد میں سنوں گا تاکہ اطمینان سے ناچ سکوں۔''

''او کے! AS you wish...... ویسے اتنا بتادوں کہ مجھے اپنے سپنوں کی تعبیر مل گئی ہے۔''

''سپنوں کی تعبیر......؟ میں سمجھا نہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''مجھے میری سائرہ مل گئی ہے...... وہی جو ہمیشہ میرے خوابوں میں آیا کرتی تھی۔''

وہ ہکلایا۔ ''تت...... تم قسم کھاؤ کہ تُو نے نئی نئی چرس پینی شروع نہیں کی؟''

''یہ حقیقت ہے جناب!...... ساری کہانی میں تمھیں بتا چکا ہوں...... اس دن لالہ داؤد، عدنان حیدر اور اس کا والد صاحب، بابا جان سے ملنے آئے تھے۔ ہم سب نے مل کر صمد یار خان کے خلاف منصوبہ ترتیب دیا اور پھر یہاں پشاور آکر ہم نے سب سے پہلے صمد یار خان کا بیٹا اغوا کر لیا...... یہ وہی لڑکا ہے کہ جس سے وہ، میری سائرہ کی شادی کرنا چاہ رہا تھا...... بس بیٹے کے اغوا نے اس کی ساری اکڑفوں نکال دی اور وہ نہ صرف سائرہ کو واپس کرنے کے لیے تیار ہو گیا بلکہ اس نے میری واہیات وڈیو بھی ضائع کر دی۔ کل اس کے آدمی سائرہ کو واپس کر گئے تھے...... وہ بالکل وہی ہے یار!...... گو اس سے پہلے عدنان بھائی مجھے سب بتا چکا تھا، جو میں نے تجھے بھی تفصیل سے بتا دیا تھا، مگر اس کے باوجود اس بات پر میرا یقین ڈگمگا رہا تھا، یہاں تک کہ کل میں نے اسے بنفسِ نفیس دیکھ لیا...... وہ بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی تھی...... وہ بہت اچھی ہے یار!...... وہی سپنوں والی۔''

''اتنا کچھ ہو گیا اور تم مجھے اب بتلا رہے ہو......؟ کم از کم صمد یار کے خلاف کام کرنے کا موقع مجھے بھی دیا ہوتا۔''

''یار!...... اگر ضرورت ہوتی تو تمھیں ضرور زحمت دیتا۔''

''شیر دل!...... آئی نو...... کہ تمھیں میری ضرورت نہیں ہے، تمھارے ساتھ کافی مددگار جمع ہو گئے ہیں جو ہر لحاظ سے مجھ سے برتر ہیں، لیکن میری خواہش ہے کہ میں اپنے دوست کے کسی کام آؤں۔'' اس کے لہجے میں دکھ کی

آمیزش تھی۔

''یقیناً! ...... یہ مجھے شرمندہ کرنے کی کامیاب کوشش ہے...... مگر بخدا میں تمہیں ان کانٹوں میں گھسیٹنا نہیں چاہتا...... دشمنی پالنا ہم پٹھانوں کا دل پسند مشغلہ ہے، ہمارے مقابلے میں تمہاری قوم ذرا مہذب ہے، تم شاید ہر وقت کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر نہ گھوم سکو، مگر ہمارا کندھا اگر گن سے خالی ہو تو ہمیں بے چینی ہوتی ہے، ہماری قوم کا ہیرو وہی ہوتا ہے جو ہتھیار کا استعمال اچھا جانتا ہو...... نہ کہ وہ جو قلم کے استعمال کا ماہر ہو...... اس سے پہلے میں نے غلطی کی تھی کہ، صمد یار خان کے گھر تجھے اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ خدانخواستہ اگر اس دن تمہیں کچھ ہو گیا ہوتا تو میں انکل، آنٹی کو کیا منہ دکھاتا...... یہ ساری زندگی کا پچھتاوا تھا...... اللہ پاک کا شکر ہے کہ اس دن ایسا کچھ نہ ہوا......؟ اور آئندہ میں ایسا رسک نہیں لے سکوں گا۔''

''تم! ...... نے کبھی میرے قدموں کو ڈگمگاتے محسوس کیا؟''

''نہیں ...... لیکن اپنے دل کو لرزتے ضرور محسوس کیا ہے...... میں پہلے ہی تیرے اتنے احسان لے چکا ہوں جن کا بدلہ چکاتے شاید میری عمر بیت جائے......؟ سوری یار! ...... مزید بوجھ اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' اس نے موضوع بدلا۔

''لالہ داؤد کی کوٹھی پر ہوں۔''

''ذرا ایڈریس دہراؤ...... کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے؟...... تیرا تھوبڑا تو دیکھ لوں۔''

میں اسے ایڈریس بتانے لگا اسی وقت میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس......؟ آجائیں بھائی؟''

''کون ہے؟'' ارشد مستفسر ہوا۔

''شاید ملازمہ ہوگی، ضرور ناشتے کے لیے بلانے......''

دروازہ ہولے سے وا ہوا اور سائرہ نے اندر جھانکا، الفاظ میرے ہونٹوں میں پھنس گئے تھے۔

''تت...... تم!......؟'' میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔

کوئل کی چہکار میرے کانوں میں گونجی۔ ''اندر آ سکتی ہوں؟''

''خوش قسمتی ہوگی اس کمرے کی۔'' میں مسکرایا۔

وہ دھیرے قدموں اندر داخل ہوئی۔

''ارے بد بخت پٹھان! ...... کیا وہی آئی ہے۔'' موبائل فون کے ریسیور سے ارشد کی چیختی آواز برآمد ہوئی۔

''جی ہاں ...... اینڈ گڈ بائی۔'' میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کون تھا؟'' وہ بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ارشد! ...... دوست ہے میرا۔''

''ہاں ...... آپ پہلے ان کا ذکر کر چکے ہیں۔''

''ویسے ...... صبح صبح بخت کیسے مہربان ہو گیا کہ اتنی موہنی صورت کے درشن مل گئے؟''

''صبح کہاں ہے جناب! ...... ٹائم دیکھو آٹھ بجنے والے ہیں...... نماز پڑھ کر میں نے تھوڑی دیر تلاوت کی، پھر سوچا آپ سے گپ شپ کر لوں...... کیونکہ بھیا بتا رہے تھے آج مجھے گھر چھوڑنے جائیں گے۔''

''گھر......؟'' میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہاں، ہم اچھی طرح تمہارا خیال نہیں رکھ پائیں گے۔''

وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ میرا خیال نہیں رکھ پائیں گے تو پھر کون رکھے گا؟''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا جو تم بذات خود اخذ کر رہی ہو؟''

''آپ خود ہی وضاحت کر دیں؟''

''پاگل! ...... ابھی ہم نے صمد یار خان کے خلاف

میدان میں اترتا ہے...... یہ خبیث نہ صرف تمہاری نانی اور نانا کا قاتل ہے بلکہ یہ میرا اور داؤد لالہ کا بھی جانی دشمن ہے...... جب تک ہم دھرتی کو اس کے بوجھ سے چھٹکارا نہیں دلا دیتے ہمیں سکون نہیں آئے گا۔"

وہ مسکرائی۔ "تو کیا، صمد یار خان نے منع کیا ہے میرا خیال رکھنے سے؟"

"مذاق اڑا رہی ہو؟"

"نہیں......" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "مجھ سے زیادہ کسی بھی چیز کو اہمیت دو گے تو یقیناً میں برداشت نہیں کر پاؤں گی...... چاہے وہ دشمن کے خلاف لڑائی ہی کیوں نہ ہو؟"

"ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟...... تم سے زیادہ اہمیت میں اپنی زندگی کو بھی نہ دوں۔"

"پھر ایسا کیوں بولا......؟"

"سوری غلطی ہو گئی......؟" میں نے کہا اور اس کے نقرئی قہقہے سے کمرے کی فضا جھوم اٹھی۔

"ڈر گئے نا؟"

"ہاں...... یقیناً تمہاری خفگی سب بلاؤں سے بڑی بلا ہے۔"

"چلو اچھی بات ہے ٹائم سے پتا چل گیا...... کم از کم آپ کو بلیک میل کرنے کا گر تو ہاتھ لگ گیا؟"

میں مسکرایا۔ "چالاک بلی۔"

وہ معصومیت سے بولی۔ "ویسے مجھے بلیاں بہت پیاری لگتی ہیں؟"

"مگر مجھے صرف تم پیاری لگتی ہو......؟" میں نے کہا اور وہ شرما گئی۔

"اچھا میں آپ کے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "عدنان بھائی اور لالہ داؤد کہاں ہیں؟"

"وہ سب سوئے ہوئے ہیں...... عدنان بھائی تو دس گیارہ بجے اٹھتے ہیں...... اور ملازمہ بتا رہی تھی کہ لالہ داؤد بھی کافی لیٹ جاگتے ہیں۔"

"اگر اپنے ہاتھ سے میرے لیے ناشتا تیار کرو، تب تو ٹھیک ہے۔ اگر ملازمہ کے ہاتھوں کا تیار کیا ہوا ناشتا لینے جا رہی ہو تو رہنے دو۔"

وہ معصومیت سے بولی۔ "مم...... میں پراٹھا بنا تو لیتی ہوں، پر صحیح گول نہیں بنتا بلکہ روٹی بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ البتہ انڈا ہاف فرائی کر لیتی ہوں اور چائے بھی بنا لیتی ہوں، چاول بھی اور کیک بھی۔"

میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ "اچھا کیک بنانے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے...... دوپہر کے کھانے کے بعد ناشتا کریں گے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "نن...... نہیں...... ناشتے کے لیے تازہ کیک تو نہیں بنایا جا سکتا نا؟...... یہ تو میں نے آپ کو آگاہ کرنے کے لیے کہا ہے...... ابھی آپ ناشتے میں پراٹھا اور ہاف فرائی انڈہ لے لیں نا؟"

"ٹھیک ہے...... دے دو۔"

"اچھا میں بنا کر لے آتی ہوں...... لیکن ہنسنا نہیں ہاں......"

میں ہنسا...... "ناشتے سے پہلے تو ہنس سکتا ہوں نا؟"

اور وہ شرماتے ہوئے باہر نکل گئی...... اس کے آنے تک میں اسی کے خیالوں میں کھویا رہا...... وہ اتنی جلدی مجھے مل جائے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا...... اس کی ہر ادا، ہر انداز میں میرے لیے کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ناشتے کی ٹرے تھامے اندر آ گئی...... وہ ٹیڑھا میڑھا پراٹھا مجھے اتنا لذیذ لگا کہ بیان

سے باہر ہے۔ میرے ناشتا کرنے تک وہ سامنے بیٹھی پُر اشتیاق نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔

''آپ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کنٹرول کی ہو گی...... ہے ناں؟''

میں نے چائے کا کپ تھاما تو اس سے مزید صبر نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار مستفسر ہوئی۔

''سچ کہوں تو اتنا لذیذ اور پُر لطف ناشتا زندگی میں پہلی بار نصیب ہوا ہے۔''

''جھوٹ۔'' وہ ناز سے اٹھلائی۔

''اللہ پاک کی قسم سچ ہے۔'' میں نے اس کا گلابی ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اسی وقت دروازہ ہلکے سے ناک ہوا۔

''یس......؟'' اس کا ہاتھ چھوڑ کر میں ذرا پیچھے ہو گیا۔

''صاحب جی! ......کوئی ارشد صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں ......ایک خاتون بھی ان کے ہمراہ ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... آپ چائے لے آئیں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی میری تقلید میں کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کے دوست ہیں نا؟''

''صحیح پہچانا...... وہی ہیں...... اور ساتھ شاید حنا ہو گی۔'' میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''کون حنا؟'' اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مجھے اپنے قدم روکنے پڑے۔

''ارشد کی بہن اور زرغونہ کی دوست ہے، تمھارے بارے سب جانتی ہے...... اب جب اسے پتا چلا کہ میں نے تمھیں ڈھونڈ لیا ہے تو یقیناً تمھیں دیکھنے کا شوق اسے یہاں کھینچ لایا ہے۔''

''آپ یقیناً میرے استفسار سے خفا ہوئے ہیں؟'' اس دمکتا چہرہ ایک دم بجھ گیا تھا۔

''ایسا ہو سکتا ہے بھلا......'' میں اسے کندھوں سے تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔ ''سائرہ ایک بات یاد رکھنا...... میں صرف تمھارا ہوں...... صرف تمھارا۔''

وہ بے ساختہ بولی۔ ''اور میں صرف آپ کی ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''آئی نو۔'' کہہ کر میں ایک بار پھر باہر کی جانب بڑھ گیا...... میں جانتا تھا کہ حنا کے نام نے سائرہ کے اندر نسوانی حس کو چونکا دیا تھا، اگر میں فی الفور اس کے ذہن سے یہ غلط فہمی دور نہ کرتا تو بعد میں یہ غلط فہمی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی تھی...... یوں بھی میرے نزدیک حنا کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں اپنی سائرہ کو خفا کر دیتا...... وہ سائرہ جو میرے دل کی دھڑکن تھی۔ جس کے لیے میں نے اپنی فطرت کے خلاف چلنا شروع کر دیا تھا، اس سائرہ کے لیے، حنا کے اظہارِ محبت کو بھلا دینا اتنا مشکل نہیں تھا۔

دونوں بہن، بھائی شدت سے میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ارشد بازو پھیلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔

سائرہ نے بھی ''اسلام علیکم! ......'' کہہ کر حنا کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

حنا صحیح معنوں میں پنجابی کڑی تھی...... گوری، چٹی، اونچی لمبی اور صحت مند وہ کسی بھی مرد کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون اڑا سکتی تھی...... لیکن سائرہ دو دھاری تلوار تھی...... اس کا باپ پنجاب کا گھبرو تھا تو ماں خالص پٹھان، خود اس میں دونوں قوموں کی خصوصیات جمع تھیں، پنجابن کڑیوں کی طرح اونچی، گوری اور پٹھانیوں کی طرح سرخ لال،...... اس کی موجودی میں حنا کی ساری دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔

حنا نے سائرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا......
''تو آپ ہیں سائرہ چودھری؟''
''جی باجی!'' سائرہ کے لہجے میں خلوص کی مہک تھی۔
''کیسی ہو مس حنا؟'' ارشد سے علیحدہ ہو کر میں حنا سے مخاطب ہوا۔
''فائن۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔
''بیٹھیں۔'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
''تھینکس۔'' حنا بولی۔ جبکہ ارشد گہری نظروں سے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''شیر دل!...... ویسے اپنے یاسر نے بھابی کی تصویر تو ہو بہو بنائی تھی؟''
اس کی بات سن کر سائرہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔
''صحیح کہا یار!...... اور وہ تصویر میرے لیے نیک شگون بھی ثابت ہوئی کہ اس کے بعد اتنی جلدی مجھے اپنی سائرہ مل گئی۔''
''میرا خیال ہے...... ایک لڑکی نکاح کے بعد ہی کسی مرد کی ملکیت تصور کی جاتی ہے؟'' حنا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
''صحیح کہا باجی!......'' میں نے نہلے پہ دہلا مارا۔ ''لیکن ہمارے بزرگوں نے فیصلہ سنا دیا ہے اور بزرگوں کی منظوری نکاح ہی کے برابر ہوتی ہے۔''
حنا کو باجی کہنے پر سائرہ کا چہرہ کھل گیا تھا جبکہ حنا ہونٹ بھینچے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔
''انکل آنٹی کیسے ہیں؟'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے ارشد سے پوچھا۔
''ٹھیک ٹھاک ہیں...... تم سناؤ چچا داؤد کو اب تو کوئی گلہ باقی نہیں رہا ہوگا؟''
''ہاں یار!...... بہت خوش ہیں...... اصل میں وہ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن میری نرم دلی جسے آسانی سے بزدلی کہا جا سکتا ہے انھیں سخت ناپسند تھی۔''
''السلام علیکم!......'' لالہ داؤد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔
''وعلیکم اسلام!......'' کہہ کر میں اور ارشد اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔
''غالباً آپ شیر دل کے دوست ارشد ہیں؟''
میں نے کہا۔ ''صحیح پہچانا۔''
''اور یہ......؟'' اس نے حنا کے جھکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
''میری بہن ہے۔'' ارشد جلدی سے بولا۔
''بیٹھیں پلیز۔'' لالہ داؤد بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔
''کیسے تشریف آوری ہوئی جناب؟'' لالہ داؤد، ارشد سے مستفسر ہوئے۔
ارشد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''شیر دل کو مبارک باد دینی تھی۔''
''واقعی جناب!...... آپ کا دوست مبارک باد کے قابل ہے...... یہ سارا منصوبہ اسی کا تھا اور پھر خالی منصوبہ بنانے سے کچھ نہیں ہوتا اصل کام ہوتا ہے منصوبے پر عمل کرنا اور یقین کرو ساری کارروائی میں شیر دل کا کردار بہت نمایاں ہے۔ چلتی گاڑی سے متحرک ٹارگٹ کو نشانہ بنانا بہت مشکل کام ہے۔ شیر دل نے نہ صرف یہ کیا بلکہ اس تخم خنزیر کو بھی پکڑ کر اپنی کار میں ڈالا اور بڑی صفائی سے یہاں سے لے آیا۔''
''صحیح کہا داؤد صاحب!...... شیر دل، نام کا نہیں حقیقی شیر ہے۔'' ارشد کے لہجے میں فخر کی جھلک تھی۔
''گویا تم مجھے جانور سمجھتے ہو......؟'' میں نے ارشد کو گھورا۔
''ہا...... ہا...... ہا......'' لالہ داؤد کا قہقہہ سب سے بلند بانگ تھا۔ سائرہ کے چہرے پر بھی شوخ سی مسکراہٹ

ابھری تھی، جبکہ حنا ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
''میرے پاس جواب تو بہت اچھا ہے مگر افسوس یہاں اور پٹھان بھی موجود ہیں۔''
''یارا!...... چھوڑو پٹھانوں کو۔'' لالہ داؤد نے اسے تحریک دی۔
ارشد نے کہا۔ ''عقل بھی یہی کہتی ہے۔''
''کیا......؟'' لالہ داؤد نے بے ساختہ پوچھا۔
''یہی...... کہ چھوڑو پٹھانوں کو۔''
اس مرتبہ ہنسنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ اسی گپ شپ کے دوران عدنان حیدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ مہمانوں سے ملنے کے بعد وہ بھی ایک سائیڈ پر بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر اسی گپ شپ میں گزری، پھر لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ کھانے کے دوران عدنان حیدر نے کہا،
''لنچ کے بعد سائرہ کو گھر چھوڑنے جانا ہے۔''
''کیوں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''عدنان صحیح کہہ رہا ہے...... یہ وہاں محفوظ رہے گی۔'' لالہ داؤد نے تائید میں سر ہلایا۔
بات میری عقل میں بھی آ گئی تھی۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا...... ''جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔'' اور کولڈ ڈرنک کا گلاس بھر کر اٹھا لیا تاکہ انہیں محسوس نہ ہو۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے سرسری انداز میں سب کی طرف نگاہ دوڑائی، وہ سائرہ تھی اور آنکھ کے اشارے سے مجھے کھانے کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہونا پڑا...... کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس نے بھی کھانا نہیں کھانا تھا۔ حنا کے سوا کسی نے بھی یہ بات محسوس نہیں کی تھی۔ مگر وہ کنکھیوں سے ہم دونوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔
دوبارہ میں اس وقت تک پلیٹ سے جڑا رہا جب تک کہ سائرہ کھانے سے فارغ نہیں ہو گئی تھی۔

''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' میں ارشد سے مستفسر ہوا۔
وہ اطمینان سے بولا۔ ''حنا کو گھر چھوڑ کر آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔''
لالہ داؤد نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں فی الحال آپ آرام کریں...... کل ہماری واپسی ہو گی گجرات سے پھر یہیں آ جانا۔''
عدنان جلدی سے بولا۔ ''میرا تو خیال ہے آپ تمام کے آنے کی ضرورت نہیں ہے...... میں سائرہ کو چھوڑ آتا ہوں۔''
لالہ داؤد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''خیر آپ کا مشورہ تو بہت بوگس ہے...... ان حالات میں ہم میں سے کسی کا بھی اکیلے سفر کرنا جان گنوانے کے مترادف ہے، خاص کر جب ساتھ میں کوئی عورت ہو؟...... کہ اس کی موجودی مرد کو بے بس کر دیتی ہے۔ صمد یار خان کے آدمی ہماری تاک میں ہوں گے، اسے ہم نے جو چوٹ پہنچائی ہے وہ اتنی آسانی سے نہیں بھلا پائے گا۔''
ارشد نے کہا...... ''ٹھیک ہے جناب!...... آپ لوگ جانے کی ترتیب بنائیں اور ہمیں اجازت

دیں۔"اس کی بات سن کر حنا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

میں انھیں رخصت کرنے گیٹ تک آیا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے ارشد مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے بولا۔"خان صاحب!......اپنا خیال رکھنا......اور یاد رکھنا مبالغہ ہر حالت میں غلط ہوتا ہے......انسان کو معتدل رہنا چاہیے۔ پہلے تم حد درجہ امن پسند تھے......اتنے کہ بزدل کہلائے گئے...... اب یہ نہ ہو بہادری کے ہاتھوں بیوقوف بن جاؤ......احتیاط کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑنا۔"

میں مسکرایا۔"ٹھیک ہے انکل!......"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا، حنا نے دوسری طرف جا کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھنے سے پہلے بولی......"شیر دل!......آئی ایم سوری......شاید آپ کو میری بات بری لگی؟"

"ہاں بہت بری لگی......"میں نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے جواب دیا۔"سائرہ میری ہے اور میری رہے گی، چاہے دنیا کو اچھا لگے یا برا......اور جو کوئی بھی ایسی بات کرے گا جس سے ہم الگ الگ نظر آئیں مجھے برا لگے گا۔"

"اگین سوری شیر دل صاحب!......"حنا کی آنکھوں میں نمی جھلکی۔

"اٹس اوکے......"میں نے گہری سانس لی۔ "آپ میرے لیے اتنی محترم ہیں جتنی زرغونہ یا سائرہ ہے......"میں نے تھوڑا سا وقفہ لیا اور پھر کہا۔"کاش وہ سب ممکن ہوتا جو آپ چاہتی ہیں۔"یہ کہتے ہی میں اس کا جواب سنے بغیر پیچھے مڑ گیا۔ وہ بہت خوبصورت، بہت اچھی اور دلکش تھی......اس قابل تھی کہ اسے ہمیشہ کے لیے جیون ساتھی چنا جاتا، مگر میں مجبور تھا......سائرہ کے بغیر مجھے زندہ رہنا بھی دشوار لگتا تھا۔

وہ تمام میرا انتظار کر رہے تھے......"تو کیا فیصلہ ہوا ہے؟"میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

لالہ داؤد نے جواب دیا۔"ہم دس منٹ میں گجرات کے لیے نکلنے والے ہیں۔"

میں سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم راولپنڈی کی طرف رواں دواں تھے۔ ہم دو گاڑیوں میں سوار تھے۔ سب سے آگے میں عدنان، لالہ داؤد اور سائرہ تھے پچھلی گاڑی میں لالہ داؤد کے چار آدمی سوار تھے۔ محافظوں کی وجہ سے ہم نے اپنے پاس پسٹل رکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ میرے پاس اپنا ذاتی بریٹا پسٹل موجود تھا۔ عدنان حیدر کو بھی لالہ داؤد نے ایک تیس بور پسٹل دے دیا تھا جلد ہی ہم پشاور سے نکل آئے تھے اور پھر جیسے ہی ہم نے نوشہرہ کراس کر کے آگے بڑھے۔ میری سماعتوں میں ایک زور دار دھماکے کی آواز آئی۔ ڈرائیونگ عدنان کر رہا تھا، سائرہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی......اس نے بے اختیار بریک لگائی، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لالہ داؤد کے محافظوں کی جیپ قلابازیاں کھاتی ہوئی روڈ سے نیچے جا رہی تھی۔ میری نظر جیپ پر ہی تھی، ان آدمیوں کا بچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا، کار کا عقبی شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کار زن سے ہمارے قریب سے گزری اور آگے روڈ پر ترچھی کھڑی ہو گئی، یقیناً وہ ہمارا جانے کا رستا بند کر رہے تھے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے پیچھے بھی ان کی گاڑی موجود ہے اور انھوں نے ہمیں وہیں گھیرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ ہم تمام جیسے سن ہو گئے تھے۔

سامنے والی کار کی کھڑکی سے کلاشن کوف کی نال برآمد ہوئی اور گولیوں کا برسٹ ہماری کار پر فائر ہوا، نال کو دیکھتے ہی میں چیخا......

''سب نیچے جھک جاؤ......'' میرا بروقت چیخنا کام آ گیا تھا۔

کلاشن کوف کے برسٹ نے ونڈ سکرین کو کرچیوں میں بدل دیا تھا...... میرا ہاتھ جیب میں رینگا اور اگلے لمحے بریٹا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا...... میں نے ذرا سا سر اٹھا کر سامنے دیکھا ایک آدمی کار سے اتر کر دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا...... کلاشن کوف اس نے دونوں ہاتھوں میں تھامی تھی اور وہ فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔

اگر وہ قریب پہنچ جاتا تو ہمارا بچنا ناممکن تھا...... میں نے ایک دم پسٹل سیدھا کیا، اگلے لمحے۔ زوردار دھماکوں کی آواز سے کار کا ماحول گونج اٹھا تھا۔

دونوں گولیاں آنے والے حملہ آور کی چھاتی میں لگی تھیں۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا...... فائر کرتے ہی میں چیخا......

''عدنان گاڑی دائیں طرف نیچے اتار لو...... تیز......''

کار سٹارٹ تھی...... عدنان نے جلدی سے گیئر لگایا اور کار روڈ سے نیچے اتار لی...... آگے صاف میدان تھا۔

میں نے ہدایت جاری کی۔ ''ناک کی سیدھ میں چلتے رہو...... اپنے بائیں ہاتھ دیکھو تمھیں لنک روڈ نظر آ رہا ہوگا تھوڑا آگے جا کر اسی لنک روڈ پر چڑھ جانا ہے۔''

عدنان نے فقط اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اسی وقت مخالفین کی جانب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے ہماری کار کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

''سیدھے چلنے کے بجائے کار کو زگ زیگ (لہرا کر) چلاؤ۔'' عدنان کو کہہ کر میں پیچھے ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تین گاڑیوں میں سوار تھے۔ اور تینوں اس وقت ہمارے تعاقب میں مین روڈ چھوڑ کر نیچے اتر آئی تھیں، عدنان کار کو آندھی و طوفان کی طرح لنک روڈ کی طرف بھگائے جا رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا تاکہ انھیں نشانہ بنا سکوں، اسی وقت تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی ایک ساتھ تین گنوں سے فائر ہوا تھا۔ میں نے ایک دم سر اندر کھینچا اور نیچے جھک گیا۔ لالہ داؤد اور سائرہ بھی نیچے ہو گئے تھے۔ عدنان کو اسٹیرنگ پر جھکنا پڑا۔ عقبی شیشہ ایک چھنا کے سے ٹوٹ گیا اور کئی گولیاں کار کی ڈگی میں گھس گئی تھیں، خوش قسمتی سے ٹائر محفوظ رہے تھے...... لیکن کب تک؟ کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی ہماری کار کو لنگڑا کر سکتی تھی اور اس کے بعد پستولوں کے سہارے خود سے دگنی، تگنی تعداد میں کلاشنکوفوں سے مسلح افراد سے مقابلہ کرنا یقیناً ناممکن ہو جاتا۔

میں نے پیچھے مڑ کر ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا، ان کی دو گاڑیاں ہماری کار سے بیس پچیس قدم دور تھیں جبکہ تیسری گاڑی ان سے پیچھے تھی۔ میں نے ایک کار کے ٹائر کا نشانہ لینے کی کوشش کی مگر ہماری کار مسلسل لہرا کر چل رہی تھی ایسی صورت میں، دشمنوں کی کار کے ٹائر کو نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ ہتھیار کا تھا، پسٹل سے یوں بھی نشانہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چند گولیاں ٹائر پر ضائع کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ فقط گولیوں کا ضیاع ہے۔

''ٹرچ ٹرچ'' کی آواز نے مجھے میگزین کے خالی ہونے کی خبر دی۔ میگزین بدل کر میں ڈرائیور کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ قسمت نے ساتھ دیا اور تیسری گولی ڈرائیور کے سر میں پیوست ہو گئی۔ ان کی کار بری طرح لہراتے ہوئے دائیں مڑی اور پھر ایک پتھر سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتے ہوئے الٹ گئی۔ دوسری گاڑی والوں نے ڈر کر تھوڑا سا فاصلہ بڑھا دیا تھا۔

'شاباش شیر دل خانا!......'' لالہ داؤد نے تحسین آمیز نعرہ بلند کیا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھر بھی خوف نہیں

تھا۔

عدنان نے کار لنک روڈ پر چڑھائی اور سپیڈ بڑھا دی۔ چند لمحوں بعد دشمنوں کی دونوں کاریں بھی روڈ پر تھیں۔ لیکن اس وقت تک عدنان مزید فاصلہ بڑھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چند فرلانگ دور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی جس کے ساتھ ہو کر روڈ بائیں مڑ رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے فی الفور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اتنا ٹائم نہیں تھا کہ میں تمام سے مشورہ لے سکتا۔ ''عدنان! ...... سپیڈ تھوڑی اور بڑھاؤ ...... لیکن موڑ مڑتے ہی کار روڈ کے درمیان میں روک لینی ہے اور جتنی جلدی ہو سکے تمام نے اتر کر پتھروں کی آڑ لے لینی ہے۔''

''مگر ......؟'' لالہ داؤد نے اعتراض کرنا چاہا۔

''اگر مگر کا وقت نہیں ہے۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا اور لالہ داؤد نے چپ سادھ لی۔

عدنان نے فل ایکسی لیٹر دبا دیا۔ موڑ مڑنے سے پہلے اس نے ایک دم سپیڈ کم کی اور پھر موڑ مڑتے ہی اس نے کار روڈ کے درمیان کھڑی کی، روڈ اتنا کھلا نہیں تھا کہ اس کے دائیں سے کوئی دوسری گاڑی کراس کر سکتی۔ ہم سرعت سے باہر نکلے، خوش قسمتی سے قریب ہی دو تین بڑی بڑی پتھریلی چٹانیں نظر آئیں۔

میں چیخا ...... ''پتھروں کے پیچھے لیٹ جاؤ۔''

عدنان نے سائرہ کا بازو پکڑا ہوا تھا، دونوں بہن بھائی خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ ہم بمشکل پتھروں کے پیچھے لیٹ پائے تھے کہ دشمنوں کی پہلی کار نے زن سے موڑ کاٹا ...... موڑ کاٹتے وقت اس نے سپیڈ کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور وہی ہوا جیسا میں نے سوچا تھا ...... ڈرائیور نے آخری وقت میں سٹیئرنگ کاٹتے ہوئے بریک لگانے کی کوشش کی لیکن کار ایک دھماکے سے عدنان کی کار کی ڈگی کی دائیں سائیڈ سے ٹکرائی اور لڑھکنیاں کھاتی روڈ سے نیچے اتر گئی۔ دوسری کار والے نے ایک دم بریک لگا کر سٹیئرنگ کاٹا، کار کا رخ بائیں ہوا اور کار کی دائیں سائیڈ عدنان کی کار سے ٹکرائی، مگر کار الٹنے سے بچ گئی تھی۔ کار میں موجود آدمی جب تک سنبھلتے میں اور لالہ داؤد ان کے سر پر پہنچ گئے تھے ...... ہمارے پسٹل ایک ساتھ گرجے اور کار میں موجود تینوں آدمی خون میں نہلا گئے تھے۔ انھیں موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے ہمیں کوئی جھجک نہیں ہوئی تھی ...... وہ ہمیں قتل کرنے آئے تھے اس لیے ہمارے دلوں میں ان کے لیے ذرا بھر بھی ترس نہیں تھا۔

ان تینوں کی طرف سے بے فکر ہوتے ہی ہم نیچے الٹی کار کی طرف بڑھے ...... کار میں صرف دو آدمی تھے، ڈرائیور کی چھاتی اسٹیئرنگ کے دباؤ سے پچک گئی تھی ...... البتہ عقبی نشست پر موجود آدمی زندہ تھا۔ میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا مگر لالہ داؤد نے میرے پسٹل کی نال نیچے جھکاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا ......

''نہیں شیر دل! ...... اس سے تو کافی کچھ پوچھنا ہے۔''

ہم نے اسے کھینچ کر باہر نکالا ...... اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ گاڑی کے قلابازیاں کھانے سے دوران اس کی کلاشن کوف گاڑی باہر گر گئی تھی۔

''کیا نام ہے تمھارا ......؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

لالہ داؤد جلدی سے بولا۔ ''نہیں شیر دل! ...... یہاں نہیں ...... یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔''

''چلو پھر ......'' میں نے بغیر کوئی سوال کیے صمد یار خان کے آدمی کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے آگے کی طرف دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے چل پڑا۔ سائرہ اور عدنان پتھر

کے پیچھے سے نکل کر روڈ پر آ گئے تھے۔ سائرہ نے میری طرف دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں میری خیریت دریافت کی، اور میں نے مسکراتے ہوئے بالکل ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا۔اس کے چہرے پر سے خوف کے سائے چھٹ گئے تھے۔عدنان بھی مطمئن نظر آ رہا تھا

میں نے دشمنوں کی کار کا دروازہ کھول کر کار سٹارٹ کی اور روڈ سے نیچے اتار کر کھڑی کر دی۔عدنان کی کار کی ڈگی میں بہت بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا، مگر کار آسانی سے سٹارٹ ہو گئی تھی۔عدنان نے ایک مرتبہ پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، سائرہ بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی تھی......صمد یار کے آدمی کو درمیان میں بیٹھا کر ہم واپس روانہ ہوئے۔

''کہاں جائیں گے......؟''مین روڈ قریب آتے ہی عدنان نے پوچھا۔

لالہ داؤد نے کہا۔''واپس پشاور۔''اور عدنان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کار واپسی کی راہ پر ڈال دی۔

اچانک کار کی اندرونی فضا موبائل فون کی رنگنگ ٹون سے گونج اٹھی۔ قیدی کا موبائل فون بج رہا تھا۔

میں نے اسے ٹھوکا دیا۔''چیک کرو کس کا فون ہے؟''

وہ کراہتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالنے لگا۔

''خ......خان صاحب کا ہے؟''وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

خان صاحب سے اس کی مراد یقیناً صمد یار خان تھا۔

''کال اٹینڈ کرو...... اور اسے بتاؤ تو نے ہمیں گرفتار کر لیا ہے...... اسے اپنی تباہ ہونے والی دونوں کاروں کا بھی بتا دینا...... کہنا کہ صرف تمہاری کار بچی ہے۔اور خبردار اگر اسے اصل بات بتانے کی کوشش کی، یقین مانو ہمارا ساتھ دے کر ہی تم اپنی جان بچا سکتے ہو۔''

میرے یہ کہنے تک موبائل فون کی گھنٹی بند ہو چکی تھی...... اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔میں نے کہا......

''کال بیک کر لو۔''مگر اس سے پہلے ہی دوبارہ صمد یار خان کی کال آنے لگی۔

''جی خان جی......!''اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کال اٹینڈ کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کر دیا۔دوسری طرف سے صمد یار خان کی مکروہ آواز ہماری سماعتوں میں زہر گھولنے لگی......

''یامین خان!......کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے؟''

''خان جی! ......فائرنگ کے شور شرابے میں موبائل فون کی گھنٹی ہی سنائی نہیں دی۔''

''کیا ہوا ان خنزیر کے تخموں کا؟''

''خان جی! ......تمام کو پکڑ لیا ہے......البتہ ہماری دو کاریں تباہ ہو گئی ہیں اور ان میں موجود تمام آدمی مر گئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں...... زندگی، موت تو دشمنی کا ثمر ہے۔''صمد یار خان کے لہجے میں اپنے آدمیوں کی موت کے غم سے زیادہ دشمنوں کی گرفتاری کی خوشی کا عنصر پایا جاتا تھا۔''یہ بتاؤ کہ وہ تمام بچ گئے ہیں؟''

یامین نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے تین انگلیاں اٹھا دیں وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں خان جی! ......ان میں سے بھی تین بچ پائے ہیں۔''

''لڑکی زندہ ہے؟''

وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا...... میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں خان جی!......وہ ماری گئی ہے......''

''کوئی بات نہیں...... تم ان تینوں کو گاؤں والی حویلی میں پہنچا دو۔''

یامین نے کہا۔ ''ٹھیک ہے خان جی۔'' اور صمد یار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''تم نے خود کو زندہ رہنے کا حق دار ٹھہرا لیا ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' داؤد لالہ نے پوچھا۔ بغیر کسی مشورے کے سارے مجھے کمانڈر سمجھنے لگے تھے۔

''باباجان کے پاس چلتے ہیں...... سائرہ کو وہیں چھوڑیں گے، اور تیاری کر کے صمد یار خان کی حویلی پر ہلہ بولیں گے۔''

''مطلب میں اپنے آدمیوں کو وہیں بلالوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کتنے آدمی ہوں گے آپ کے پاس؟''

''چار تو آج چل بسے...... باقی دس ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے انھیں کال کر کے بتا دو......'' اور داؤد لالہ موبائل فون نکال کر اپنے آدمیوں کو کال کرنے لگا۔ عدنان نے پوچھا......

''میں بھی ابو جان کو کہہ کر اپنے آدمی بلوا لیتا ہوں؟''

میں نے جواباً کہا۔ ''نہیں...... وہ لیٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے...... داؤد لالہ کے دس آدمیوں کے علاوہ تین آدمی ہم خود ہیں...... مہردل خان بھی ہے اور ضرورت پڑی تو چند آدمی گاؤں سے لے لیں گے؟''

داؤد لالہ کال منقطع کرتے ہوئے بولا۔ ''گیارہ آدمی رستے میں ہمارے منتظر ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''کافی ہیں......''

پشاور کراس کرتے ہی عدنان نے کار ہمارے گاؤں کے رستے پر ڈال دی...... پشاور کی حدود سے نکلنے سے پہلے داؤد کے آدمیوں نے ہمیں جوائن کر لیا تھا۔ قیدی کو اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے وہ دوبارہ میرے پاس آ بیٹھا۔ رات کے نو بج رہے تھے جب ہم گھر پہنچے۔ مہمانوں کو حجرے میں بٹھا کر میں عدنان اور سائرہ کو لے کر گھر کی طرف بڑھا، اباجان نماز پڑھ کر سونے کی تیاری کر رہے تھے، مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے۔

''شیر دل خانا!...... تم کس وقت پہنچے؟''

''ابھی، بابا جان!...... میرے ساتھ مہمان بھی ہیں۔'' میں نے عدنان اور سائرہ کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

''عدنان بیٹا!......'' باباجان عدنان کو آواز دے رہے تھے کہ ان کی نظر سائرہ پر پڑی۔

''ادا مارا بیٹی آیا ہے!......'' باباجان فرطِ مسرت سے اٹھ کر سائرہ کی طرف بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشانی کو چوم لیا۔

''کیسا ہے امارا بٹیا......؟''

''باباجان!...... زہ پختو کے خبرے کولے شم۔'' (باباجان میں پشتو میں بات کر سکتی ہوں)

اس کی پشتو اتنی صاف اور شگفتہ تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ باباجان بھی دنگ رہ گئے تھے۔

''آخر بیٹی کس کی ہے۔'' باباجان فخر سے بولے۔

اسی وقت زرغونہ اور مہرجان باباجان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور باباجان فخر سے سائرہ کا تعارف کرانے لگے۔ پھر اماجان بھی وہیں پہنچ گئی تھیں۔ عورتوں کو آپس میں گفتگو کرتا چھوڑ کر میں نے باباجان اور مہردل کو کہا......

''حجرے میں اور مہمان بھی بیٹھے ہیں۔''

باباجان نے کہا۔ ''چلو انھی کے پاس چلتے ہیں۔ اور مہردل خان تم جلدی سے مرغی ذبح کرو مہمانوں نے کھانا بھی کھانا ہوگا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک مرغی سے کام نہیں چلے گا بابا جان۔''

''تین، چار مرغیاں ذبح کرلے یار!...... مرغیوں کی کوئی کمی ہے؟''

''قریباً پندرہ آدمی ہوں گے۔'' میں نے مہردل خان کو مہمانوں کی تعداد بتائی اور بابا جان کے ہمراہ حجرے کی طرف بڑھ گیا...... عدنان بھی ہمارے ساتھ تھا۔

تمام سے مصافحہ کر کے بابا جان بیٹھ گئے۔ لالہ داؤد نے بابا جان کو ساری بات تفصیل سے بتائی، میرے کارنامے سن کر بابا جان کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا تھا...... وہ یقیناً اول دن سے مجھے ایسا ہی دیکھنے کے خواہشمند تھے۔

''تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' لالہ داؤد کی بات ختم ہوتے ہی بابا جان مستفسر ہوئے۔

اس نے جواب دیا۔ ''شیر دل کا کہنا ہے کہ صمد یار خان کو مزید مہلت نہ دی جائے، ورنہ اس کی جارحیت جاری رہے گی اور کسی بھی وقت وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوسکتا ہے؟''

''گویا یہ آدمی اسی مقصد کے لئے ساتھ لائے ہیں؟''

''جی چچا جان۔'' لالہ داؤد مختصراً بولا۔

بابا جان نے پوچھا۔ ''یہ بات کنفرم ہے کہ وہ اپنی گاؤں والی حویلی میں ہے؟''

''جی ہاں!...... اس کی اپنے آدمی سے اسی موضوع پر بات ہو چکی ہے۔'' لالہ داؤد نے قیدی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ لالہ داؤد کے آدمیوں نے قیدی کے مضروب بازو سے کپڑا لپیٹ کر اس کی گردن سے لٹکا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے کس وقت اس کی طرف جانا ہے؟ ...... مہردل خان اور میں بھی ساتھ چلیں گے۔''

''چچا جان!...... آپ کی تو بالکل ضرورت نہیں البتہ مہردل خان کو ضرور ساتھ لے جائیں گے۔''

بابا جان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''صحیح کہتے ہوئے یار!...... ایسے موقع پر تو ہم بوڑھے بوجھ ہی بن جاتے ہیں؟''

داؤد لالہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔ ''نہیں چچا جان!...... گھر کی دیکھ بھال کے لیے بھی تو کوئی موجود ہونا چاہیے۔''

''یہ بھی خوب کہی۔'' بابا جان بچے تو نہیں تھے کہ لالہ داؤد کی تسلی کو نہ سمجھ پاتے۔

''شیر دل خانا!...... کھانے کا پتا کرو مزید کتنی دیر لگے گی۔''

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ حجرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ یامین کا موبائل بجنے لگا، صمد یار خان کی کال تھی۔ میں جلدی سے واپس مڑا اور یامین کو کہا۔

''صمد یار کی کال ہے...... وہ دیر ہونے کا پوچھے تو بتا دینا کار خراب تھی۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل فون اس کی جانب بڑھایا۔ موبائل فون کی گھنٹی بجنا بند ہو گئی تھی، مگر مجھے معلوم تھا کہ صمد یار خان نے دوبارہ کال کرنی تھی، اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا، موبائل فون دوبارہ بجنے لگا۔

''جی خان جی!......؟'' یامین نے کال اٹینڈ کرتے ہی خود بخود سپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

''یامین خان!...... تم ابھی تک نہیں پہنچے؟''

''خان صاحب!...... میں دشمنوں کی کار ہی میں انھیں لا رہا ہوں، لیکن کار کی حالت کوئی اتنی بہتر نہیں ہے کہ میں رفتار بڑھا سکوں۔''

''تمھاری اپنی گاڑیاں کہاں ہیں؟'' صمد یار خان نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

''ہماری دو کاریں تو الٹ گئی تھیں اور ان میں موجود کوئی بھی آدمی نہیں بچا...... غصے میں آکر میں نے اپنی کار

دشمنوں کی کار سے ٹکرادی تھی۔ گو اس طرح میری کار بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی مگر اسی وجہ سے انھیں پکڑنے میں کامیاب ہوا ہوں...... ان کی کار کا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے انھی کی کار استعمال کرنی پڑی۔"

"مجھے پہلے یہ مسئلہ بتا دیتے...... میں دوسری کار بھیج دیتا۔"

"اس وقت تو ٹھیک چل رہی تھی...... پشاور عبور کرنے کے بعد مسئلہ دینے لگی...... میں نے سوچا کہ چھوٹا موٹا مسئلہ ہے پہنچ ہی جائیں گے...... اس وجہ سے آپ کو زحمت نہیں دی۔"

"اچھا اب کہاں پہنچ گئے ہو؟"

میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میرے گاؤں کا نام بتا دے۔

اس نے جلدی سے کہا۔ "اس وقت ہم ولاور خان کلے پہنچنے والے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے آدھے گھنٹے تک پہنچ جاؤ گے؟"

"جی خان جی!......" یامین نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" کہہ کر صمد یار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"میں مہر دل خان کو بلا لوں...... کھانا بشرط زندگی واپسی پر کھانا کھائیں گے۔" میں حجرے سے نکل کر گھر کی طرف بڑھا۔

"بس دس منٹ تک کھانا لا رہا ہوں۔" مجھے دیکھتے ہی مہر دل خان بولا۔

"کھانے کا ٹائم نہیں ہے، واپسی پر کھانا کھائیں گے...... فی الحال تم اپنی گن اٹھاؤ کہیں جانا ہے۔" اسے کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"بھیا! ...... کہاں جا رہے ہیں؟" زرغونہ نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں نہیں ...... تم اپنا کام کرو۔" اسے جھڑکتا ہوا میں کمرے میں گھس گیا، کلاشن کوف سنبھال کر میں باہر نکلا تو وہ منہ بنائے باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

میں نے قریب جا کر اس کی ناک کی پھننگ مروڑی اور ہنستے ہوئے بولا۔ "گڑیا! ...... ہم بس تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ تم اپنی بھابی کا خیال رکھنا۔"

"نہیں ہوں تمھاری گڑیا۔" وہ واپس باورچی خانے میں گھس گئی اور میں ہنستا ہوا امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سائرہ اور امی جان گپ شپ میں مصروف تھیں۔

"امی جان! ...... ہم ذرا کام کے لیے جا رہے ہیں...... کھانا واپسی پر کھائیں گے۔"

امی جان معنی خیز مسکراہٹ سے بولیں۔ "پہلے کبھی ایسی بات بتانے کے لیے تم میرے کمرے میں نہیں آئے؟"

"وہ میں...... بس یونہی چلا آیا۔" سائرہ کو مسکراتا دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔

"اچھا تم فکر نہ کرو...... میں بہو کا خیال رکھوں گی۔" امی جان نے کہا اور سائرہ حیا سے لال ہو گئی، جبکہ میں بھی جلدی سے باہر آگیا ورنہ امی جان کے حملے جاری رہتے۔

مہر دل خان مجھ سے پہلے حجرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں حجرے میں داخل ہوا تمام جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

صمد یار خان کوئی تر لقمہ نہیں تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لئے ہمیں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا تھا اور ہم اس کے لئے تیار تھے۔

(اگلے ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

سلسلہ وار آپ بیتی

آکاس بیل

قسط: 8 ☆ محمد رضوان قیوم

نوتن کی حالت ہر آنے والے دن کے ساتھ بگڑتی جارہی تھی اور میرے دِل پر بوجھ سا آپڑا تھا۔

ایک دن میں نے کلدیپ سے ملاقات کے دوران کہا کہ تم نوتن کی گرتی جسمانی صحت اور ذہنی کیفیت پر خصوصی توجہ دے کر کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھلاؤ۔

"یار ستار! دھونند اور مریال دونوں کا علم کہتا ہے کہ اس کے وجود پر لکھو نامی کسی گندی مخلوق کا غلبہ ہے"۔ کلدیپ نے کہا۔ "اور یہ غلبہ اس پر آئندہ چھ ماہ تک اثر انداز رہے گا۔ دھونند اس کا اپنے عملیات سے توڑ کر رہا ہے"۔ پھر اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ "بس یار! تُو نوتن سے چند لمحے باتیں کر کے اس کا من بہلا دیا کر۔ یہ بات بے شک ایک بھائی ہونے کے ناطے ڈوب مرنے کے برابر ہے لیکن میں مجبوراً یہ سب کچھ اس کی خوشی اور صحت کے لئے کہہ رہا ہوں اور اس کے لئے مجھے اپنی غیرت کو کچلنا پڑتا ہے"۔

"ہمیں اسے دھونند اور مریال کے علاوہ کسی قابل ڈاکٹر کو بھی دکھلانا چاہئے"۔ دیپا نے کلدیپ کو مشورہ دیا۔

"ہاں، تُو صحیح کہتی ہے۔ میں آج ہی اسے مشہور ڈاکٹر پرتھوج کے پاس لے کر جاؤں گا"۔ کلدیپ نے دیپا سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"دیپا بھابی! آپ اس کا خاص خیال رکھا کریں"۔ میں نے اس سے کہا۔

"ارے میں ہی اس حویلی میں اس کی دوا دارو کا خیال رکھتی ہوں"۔ دیپا نے تیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ ہماری ساس ماں کو تو بلیوں کی طرح سات گھر پھرنے اور ہم غریبوں کا مذاق اڑانے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں ہے"۔

"دیپا یہ تُو کیا بکواس ہانک رہی ہے؟" کلدیپ نے سرخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خبردار میرے سامنے میری ماتا کے لئے کوئی گستاخی کا لفظ منہ سے نکالا تو مجھ سے کوئی برا نہ ہوگا"۔

دیپا سہم گئی۔

"ارے بے وقوف اپنی گھر والی کے ساتھ ایسا سخت برتاؤ نہیں کرنا چاہئے"۔ میں نے اسے سمجھایا۔

اسی دوران حویلی کے اندر کئی عجیب وغریب ناقابل یقین پُراسرار مافوق الفطرت واقعات رُونما ہونے لگے تھے۔ ایک دن صبح کے وقت حویلی کی چھت پر خون کے بڑے بڑے چھینٹے نظر آئے جو منٹوں میں غائب ہو گئے اور پھر شام کے وقت ان ہی چھینٹوں کی جگہ آگ کے شعلے ابھرے اور وہ بھی بڑی جلدی تحلیل ہو گئے۔ ماتا نے بتایا کہ اس نے چھت پر ایک چھوٹے قد والی ایسی بڑھیا کو دیکھا تھا جو اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن سنتو تائی نے بازار سے کشمیری سرخ سیب منگوا کے الماری میں رکھے اور جب الماری کو کھولا تو اس میں سے صرف دو امرود نکلے۔ حویلی کے تمام باسی یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

دھونند اور مریال نے لالہ جی کو بتلایا کہ یہ سب کچھ رسوئی میں موجود پُراسرار بچہ کر رہا ہے۔ بقول اُن کے یہ بڑی ڈھیٹ قسم کی مخلوق ہے جو کہ ان کے عمل سے چند لمحوں کے لئے غائب ہو جاتی ہے اور جب ان کے عمل کی طاقت میں ذرا سی کمی آتی ہے تو وہ موقع پا کر دوبارہ آجاتا ہے۔

اُدھر نوتن کی طبیعت جب دن بدن گرنے لگی اور وہ کافی نڈھال ہو گئی تو میں اور کلدیپ اسے شہر کے مشہور ڈاکٹر پرتھوی پال کے پاس لے گئے۔

وہاں ڈاکٹر نے اس کے چند ضروری لیبارٹری ٹیسٹ کئے۔ ان ٹیسٹوں کی روشنی میں ڈاکٹر پرتھوی نے نوتن کے دماغ کے سکین کی تشخیص کی۔ اسی نے بتلایا کہ مریضہ کے دماغ میں کچھ ایسے جراثیم وارد ہو چکے ہیں جو اس کے دماغ کے خلیوں پر حملہ آور ہو کر مفلوج کر رہے ہیں۔ نیز اس نے نوتن کے پھیپھڑوں میں انفیکشن کی بھی تشخیص کی۔ تاہم اس نے نوتن کی چند دوائیاں تبدیل کرتے ہوئے یہ بات زور دے کر کہی کہ مریضہ کو زیادہ

سے زیادہ تفریح فراہم کریں اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کی جائے۔

کلدیپ ڈاکٹر کی یہ پریشان کن تشخیص سن کر رونے لگا۔ اس نے وہیں پر روتے ہوئے مجھے کہا۔ ''یار باسو! بھگوان کے واسطے میری دوستی کا حق ادا کر دے۔ میری مرتی بہن کو چند لمحے کی ایک خوشی دے دیا کر''۔

''میں نوتن کو اپنی محبت اور خلوص کا یقین دلاتا تو رہتا ہوں''۔ میں نے کلدیپ سے کہا۔ ''میرے ماں باپ نے نوتن کے سامنے میرے لئے اس کا رشتہ بھی مانگا تھا تاکہ اسے یقین ہو جائے۔ اب تم ہی کہو اور اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں''۔

''یار! تم نے اتنا کچھ کر کے ہمارے پریوار پر احسان کیا ہے''۔ کلدیپ نے کہا۔ ''تم میرے صرف بچپن کے دوست ہی نہیں ہو بلکہ ہمارے پُرکھوں سے یہ دوستی چلتی آ رہی ہے اور دوسرے پڑوسی کی حیثیت سے بھی ہمارا بڑا حق ہے۔ تم سے میری یہ استدعا ہے کہ تم مزید قریب ہو جاؤ کہ تمہاری اس سے شادی ہو چکی ہے، اس پر یہ ظاہر کرو...... میرا نہیں خیال کہ اس نے مزید جینا ہے''۔

''کلدیپ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟'' میں نے جلتے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو شک ہے نوتن کے سکڑتے دماغ کی طرح تیرا دماغ بھی مفلوج ہونے لگا ہے۔ تُو نے اتنی بڑی بات اس طرح آرام سے کہہ دی جیسے تم کہو کہ آؤ فالودہ کھانے چلیں''۔ میں نے خود پر قابو پا کر تحمل سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یار! میرے کندھوں پر اپنی دوستی کے مان کا اتنا بوجھ ڈالو جتنا کہ میں سہہ سکوں۔ میرا خیال ہے اس سلسلہ کو اسی حد تک محدود رکھیں تو یہی ہم سب کے لئے بہتر ہے''۔

ہم نوتن کو حویلی لے آئے۔

لالہ جی نے ابا کو جب حویلی کی دکانوں کے سودے کا ذکر کیا تو ابا نے سر پیٹ لیا۔

''ارے کمبخت عقل سے پیدل بزدل انسان یہ تُو نے اپنے پیروں میں کس کے کہنے پر اور کیوں کلہاڑی مار لی ہے؟'' ابا نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یار! میری حیثیت اب ایک چوہے کی مانند ہو گئی ہے''۔ لالہ کیدار ناتھ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ''اور اس چوہے کو کئی مارنے والوں نے گھیر کر ایک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ تجھے پتا نہیں ہے کیا۔ مجھے اگلے چند دنوں میں کسی لمحے بھی نہ صرف جیل کی سلاخوں میں بھیجا جا سکتا ہے بلکہ مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہائی کورٹ میری حویلی کی زمین میرے پیروں تلے سے کھینچ لے گی اور یہی مشکلات میری راہ میں حائل نہیں ہیں۔ یہ حویلی میں جو آج کل چل رہا ہے وہ تیرے سامنے ہی ہے۔ ایک طرف نوتن موت کی طرف تیزی سے گامزن ہو رہی ہے اور ایک بڑا عذاب حویلی کے اندر پُراسرار مخلوق کا ہے جس نے میرے پریوار کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے...... اب تُو ہی بتلا میں ان گھمبیر حالات میں مرتا، ڈرتا چوہا نہیں ہوں اور اپنی ان کمزوریوں کا ذکر صرف تجھ سے ہی کر رہا ہوں''۔

''ہمت اور صبر سے کام لے یار!'' ابا نے جذبات میں اس کو گلے لگا کر کہا۔ ''لالہ! تُو اپنی بے وقوفی اور گھبراہٹ میں اتنا کام خراب کر چکا ہے کہ اب اس کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔ تم نے اپنے ہاتھوں اپنے آگے گڑھے کھود لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تُو چارپائی سے لگ جائے اس طرح تیرے ساتھ تیرا سارا پریوار بھی مرے گا۔ تجھے صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے تھا ہو سکتا تھا کہ تیرے ساتھ کچھ اچھا ہی ہو جاتا۔ یہ مکیش اور مولدر سنگھ نے تیرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے دوستی، رشتہ داری کی آڑ میں تیری پشت پر خنجر مارا ہے۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ انہوں نے تو تجھے کنویں میں دھکا دے دیا ہے''۔

''نہیں عظیم! وہ دونوں بیچارے اس سودے کے ذمہ دار نہیں ہیں''۔ لالہ نے ابا سے کہا۔ ''مجھے مکیش نے منع

بھی کیا تھا کہ میں اپنے فیصلے پر ایک بار نظر ثانی کروں لیکن میں اس کے منع کرنے کے باوجود اسے نکتھال کے پاس لے کر گیا تھا"۔

دو روز بعد نکتھال نے لالہ کو سودے کے بقایا روپے دیئے اور اس سے رجسٹری آفس میں جا کر دکانوں کی خرید و فروخت کے تمام قانونی لوازمات پورے کروا دیئے۔ اس سارے کام میں مولدر سنگھ اور ایک اور بندہ لالہ کے ساتھ رہا تاہم مکیش اس کے ساتھ نہ گیا۔

نکتھال سے ڈیل کے مطابق اسے حویلی کے پچھواڑے سے رہائش کا راستہ دیا جائے گا۔

اب حویلی کا ایک بازو کٹ چکا تھا۔ یعنی نچلی دکانوں کا مالک نکتھال اور اوپری رہائش کا مالک لالہ کیدار ناتھ۔

ابا نے لالہ جی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اگر حویلی کی تمام دکانیں فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہی ہے تو اُسے حفظِ ماتقدم کے تحت کم از کم چار فرنٹ والی دکانیں کلدیپ اور مانا کے کاروبار کے لئے روک لینی چاہئے لیکن لالہ کو یقین تھا کہ اس کی دسترس سے تمام دکانیں مع حویلی کی اوپری رہائش نکل جائے گی۔ لہٰذا اس نے ابا کی اس تجویز کو نظر انداز کر دیا تھا۔

دُکانوں کی رجسٹری کروا کے تیسرے روز نکتھال اپنے ساتھ 5 جیپوں میں سوار کم از کم 50 کے قریب اپنے ڈنڈے، بندوق بردار غنڈوں کو لے کر آیا۔ غنڈوں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی زبانوں والے ہانپتے خونخوار کتوں کی رسیاں تھامی ہوئی تھیں۔ ان بدمعاشوں کے ہجوم کو دیکھ کر سارے گاہک، دکاندار دکانوں سے باہر نکل کر دیکھنے لگے۔

نکتھال حویلی کی ہر دکان میں باری باری گیا اور سب دکانداروں کو بتلایا کہ میں نے یہ تمام دکانیں لالہ جی سے خرید لی ہیں اب ان کا واحد مالک ہوں۔ لہٰذا تم سب اگلے چند روز میں یہ دکانیں خالی کر دو ورنہ تمہارے ماس کو اپنے کتوں کا نوالہ بنا دوں گا۔

"یہ سراسر بدمعاشی ہے"۔ سب دکانداروں میں سے حجام نے ہمت کر کے صدائے احتجاج کی تو نکتھال نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارا اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دکان سے نکال کر زمین پر گرایا اور پھر ایک بدمعاش کے ہاتھ میں تھمے کتے کو چنکی بجا شُشکارا۔ بدمعاش نے کتے کی رسّی کو ڈھیل دی۔ کتا بجلی کی رفتار کی مانند زمین پر گرے حجام کے پاس پہنچا اس نے اس غریب کی دائیں ٹانگ کو اپنے نوکیلے خونخوار دانتوں سے پکڑ کر بھنبھوڑ ڈالا۔

نکتھال نے چند ڈنڈا بردار بدمعاشوں کو حکم دیا کہ اس گستاخ کے دونوں ہاتھوں کو اتنا نکارہ کر دو کہ یہ اپنے گاہکوں کی شیو، حجامت کرنے کے قابل نہ رہے۔ الغرض نکتھال کے غنڈوں نے حجام کی لاٹھیوں، ڈنڈوں، لاتوں سے اتنی درگت کی کہ وہ بیچارہ نیم مرا ہو گیا۔ اس کے بعد نکتھال حویلی کے تمام کرایہ داروں پر چلاتے ہوئے دھاڑا۔

"تم میں سے اور کسی کو اعتراض ہے؟" نکتھال نے گرج دار آواز میں تمام دکانداروں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ کوئی نہ بولا تو اس نے کہا۔ "تم لوگوں نے اگر میری بات نہ مانی تو یاد رکھو تمہارا اس سے بھی برا حال کروں گا اور تم نے جہاں مرضی تھانے، کچہری جانا ہے چلے جاؤ لیکن تمہیں ہر قیمت پر جو وقت میں نے دیا ہے، اس وقت میں یہ دکانیں خالی کرنی ہوں گی"۔

"لیکن ان کا مالک تو لالہ جی ہے"۔ ایک دکاندار نے جذبات میں آگے بڑھ کر کہا تو نکتھال نے اسے اپنے قریب بلا کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

"آنکھیں کھول کر اس کاغذ کو دیکھ لو"۔ نکتھال نے دکانوں کی خرید کا اشٹامپ پیپر دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے لالہ جی سے یہ دکانیں خرید لی ہیں اور اب میں ان کا مالک ہوں"۔

اس کے بعد کسی کو بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ نکتھال

دہشت پھیلا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حویلی کے تمام کرایہ دار اور ان کے ساتھ اردگرد کے چند ہمدرد کاروباری لوگ اکٹھے ہو کر شور شرابہ کرتے ہوئے لالہ جی کے پاس پہنچے انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس نے واقعی حویلی کی تمام دکانیں نکتھال کے ہاتھوں فروخت کر دی ہیں تو لالہ جی نے ان کے اس سوال کی تصدیق کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں''۔

''پر کیوں؟'' تین چار کرایہ داروں نے بیک آواز پوچھا۔

''وہ اس لئے کہ تم لوگ مجھے کرایہ دینے میں انتہائی کمینے پن کا مظاہرہ کرتے تھے''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''میری تم سے کرایہ لینے کے معاملہ میں جوتیاں چٹخ جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں ان دکانوں کا مالک تھا۔ میں چاہے انہیں فروخت کروں یا بھاڑ میں جھونکوں تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟''

''لیکن ان دکانوں کے مالک تو شنکر دیال اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والے بھی ہیں''۔ ایک دکاندار نے یہ بات کی۔ لالہ جی نے جواباً انہیں کہا کہ ابھی ان کی ملکیت کے دعویٰ کا کیس ہائی کورٹ میں لٹک رہا ہے فی الحال مالک میں تھا۔

''لالہ اگر تُو نے یہ دکانیں فروخت کرنی ہی تھیں تو ان پر خریداری کا سب سے پہلا حق ہمارا تھا''۔ ایک دل جلے دکاندار نے کہا۔ ''یہ تُو نے ہم پر انتہائی ظلم کیا ہے۔ بھگوان تو تجھے سمجھے گا لیکن اس سے پہلے ہم تجھے سکون سے اس حویلی کی دکانوں کی فروختگی سے حاصل شدہ رقم کو ہضم نہیں کرنے دیں گے''۔

اتنے میں مکیش اپنے دونوں جوان بیٹوں کے ساتھ آ گیا۔ انہوں نے ہاتھوں میں لڑائی والے سپیشل کوکے لگے ڈنڈے تھام رکھے تھے۔

''چلو اوئے سارے لوگ اپنی شکلیں اس حویلی سے گم کرو''۔ جونا نے انتہائی بدمعاشی سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ان دکانوں کے معاملہ میں جو سوالات پوچھنے ہیں وہ تم نکتھال سے پوچھو۔ وہ تمہاری دکانوں کا نیا مالک ہے''۔

''ہم سب وفد کی صورت میں کورٹ جائیں گے''۔ دکانداروں نے کہا۔

''اچھا تو جاؤ تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کرنے کے ساتھ ہمارا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو''۔ بونم نے ڈنڈا لہرا کر کہا۔

سنتو تائی کمرے میں شور شرابہ سن کر وہاں آ گئی تھی اور ساری باتیں سن رہی تھی۔

''ہائے رام میں یہ کیا سن رہی ہوں''۔ تائی نے سینہ کوبی کرتے ہوئے کہا۔ ''لالہ تم نے تمام دکانوں کا سودا کسی غنڈے کے ہاتھوں کر دیا۔ یہ تُو نے اتنا بڑا انیائے کیوں کیا؟'' پھر اس نے مکیش کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ یہ اس نامراد مکیش کا کیا دھرا ہوگا''۔

''سدھن جی میرا ان دکانوں کی فروختگی میں کوئی لینا دینا نہیں ہے''۔ مکیش نے وضاحت کی۔ ''آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہی ہیں''۔

''اپنی بکواس بند کر خبیث گھٹیا انسان!'' تائی سنتو نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

''تُو اندر جا''۔ لالہ جی نے اسے جھاڑا لیکن وہ مسلسل مکیش اور لالہ جی کو کوسنے دیتی رہی۔

حویلی کی نچلی منزل کا آنگن دکانداروں کی بک بک اور سنتو تائی کے واویلا سے مچھلی منڈی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

بالآخر لالہ شدید غصے میں اپنی کرسی سے اٹھ کر سنتو کو زبردستی دھکیل کر اندر کمرے میں لے گیا۔ جبکہ جونا، بونم نے تمام دکانداروں کو ڈرا دھمکا کر وہاں سے بھگا دیا۔

اسی دوران کلدیپ بھی سنتو تائی کی آواز میں ہم آواز ہوکر بڑے گستاخی والے انداز میں لالہ جی سے حویلی کی دکانوں کی فروختگی کے بارے میں لڑنے لگا۔

''پتاجی آپ نے میرے اور مانا کے مستقبل پر لات ماردی ہے''۔اس نے باپ سے کہا۔''آپ کو کم از کم حویلی کی آدھی دکانیں اپنے پاس رکھنی چاہئیں تھیں''۔

لالہ جی نے اسے کئی بار خاموش رہنے کی تنبیہ کی مگر وہ جب زیادہ ہی چلانے اور گستاخی کرنے لگا تو لالہ نے جھنجلا کر ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔دیپا روتے ہوئے باپ بیٹے کے درمیان آئی اور اس نے کلدیپ کو جھنجوڑتے، گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ''۔

''پتاجی نے ہم دونوں بھائیوں کے مستقبل پر لات ماردی ہے''۔کلدیپ نے چلاتے ہوئے کہا۔''یہ باپ ہے یا دشمن؟'' دیپا اسے بڑی مشکل سے گھسیٹ کر کمرے میں لے گئی۔

''کلمنو!تم میری نگاہوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ''۔سنتو تائی نے مکیش اور اس کے دونوں بیٹوں پر چلاتے ہوئے کہا۔''تم بھی اس حویلی کی بربادی میں برابر کے شریک ہو''۔

''سمدھن جی!آپ اپنے دماغ کو ٹھنڈا کریں''۔ مکیش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔''ہمیں کیوں اس حویلی کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں۔دکانیں لالہ جی نے اپنی مرضی سے فروخت کی ہیں''۔

''نہ جانے ہمارے کہاں سے نصیب پھوٹ گئے''۔اب تائی سنتو نے توپوں کا رخ دیپا کی طرف کرتے ہوئے کہا۔''یہ کمبخت گوری چمڑی والی نحوست ماری ہمارے متھے کہاں سے لگ گئی''۔

''معاف کرنا سمدھن جی!'' مکیش نے کڑوا جواب دیتے ہوئے کہا۔''ہم آپ کے متھے نہیں لگے تھے۔وہ آپ کا برخوردار کلدیپ ہی ہماری بیٹی کے عشق میں گھلے جارہا تھا اور آپ لوگ ہی دیپا سے اس کا ہاتھ مانگنے آئے تھے''۔

مکیش کی یہ سچی بات سن کر تائی سنتو اور بھڑک اٹھی اور اول فول بکنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ابا اور اماں شور شرابہ سن کر حویلی پہنچے تو سنتو تائی نے انہیں بھی آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے دشنام انگیزی کرنی شروع کردی۔

''لگتا ہے لالہ کو عظیم بھائی نے بھی حویلی کی دکانیں فروخت کرنے کے لئے اکسایا ہوگا''۔تائی سنتو نے ان کو بھی لپیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے سنتو!تیرا دماغ چل گیا ہے''۔اماں نے بھنا کر کہا۔''ہم تو تیرے خیر خواہ ہیں اور ہمدردی رکھنے والے پڑوسی ہیں''۔

''بھاوجیہ!اپنی فضول زبان کو لگام دے''۔ابا اپنے غصہ پر قابو نہ پاسکے اور پھر لالہ جی کو مخاطب کرکے کہنے لگے۔''لالہ تیری حویلی میں ایک چڑیل موجود نہیں ہے بلکہ دو چڑیلیں ہیں''۔

''ہاں عظیم تو صحیح کہتا ہے''۔لالہ نے ابا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔''اس کمینی کی زبان درازی اور چیخ و پکار نے میری پریشانیوں میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے''۔

''لالہ یہ تو نے اپنی راہ میں اور مصیبتوں کے پتھر اکٹھے کرلئے ہیں''۔ابا نے لالہ جی سے کہا۔

''نہیں عظیم!میرا خیال ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے مجھے وہی کچھ کرنا چاہئے تھا''۔لالہ جی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بے وقوف!تجھے عدالتی فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے تھا''۔ابا نے غصے میں جلتے ہوئے لالہ جی سے کہا۔''ہوسکتا ہے تیری اس معاملہ میں کوئی معجزاتی بچت ہو جاتی''۔

ابھی لالہ جی اور ابا کے درمیان یہ باتیں جاری تھیں کہ اسی دوران حویلی کے اندر سے سنتو تائی کی ایک بار پھر چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

''نکل یہاں سے دفع ہو''۔ تائی سنتو دیپا پر چلا رہی تھی۔ ''یہ سب کچھ تیرے باپ کی وجہ سے ہوا ہے''۔

''ماں جی! میرا آپ کی دکانیں بکنے میں کیا دوش ہے؟'' دیپا نے کہا۔ ''مجھے کلدیپ گھر سے قدم نکالنے کو کہے گا تو میں جاؤں گی۔ بھگوان کے واسطے اس حویلی کی بدسکونی میں اس طرح اضافہ نہ کریں''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماتا جی!'' کلدیپ نے ماں کے آگے کھڑا ہو کر کہا۔ ''نہیں ماتا جی! دیپا میری پتنی ہے میں کسی قیمت پر اس کو حویلی سے باہر رلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا''۔

''میرے منہ لگتا ہے ناخلف!'' تائی سنتو نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''تو اپنے پتا کا بھی گستاخ ہے اور میرا بھی۔ میں اس کلموہی آسیب زدہ جادوگرنی کی شکل اپنے گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی''۔

''نہیں نہیں دیپا بھابی کسی صورت میں اس حویلی سے نہیں جائیں گی''۔ کلدیپ سے چھوٹا مانا بھی بول اٹھا۔ ''ماتا جی! آپ ان کو خواہ مخواہ اس حویلی کی دکانوں کی فروختگی کا دوشی ٹھہرا رہی ہیں''۔

''تو بھی اپنی کلموہی بھابی کے گیت گا رہا ہے''۔

''دیپا بھابی کلموہی نہیں''۔ مانا نے کہا۔ اس حویلی کی رونق اور خوبصورتی ہیں''۔

سنتو تائی نے اپنے پیر سے جوتی اتاری اور اسے مانا کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ''اپنی بھابی کے سگے سوتڑے دفع ہو جا یہاں سے''۔

''ماتا جی! سچی بات ہے آپ نے ماتا ہونے کے ناطہ مجھے نوتن اور کلدیپ کو اتنا پیار نہیں دیا جتنا دیپا بھابی نے ہم سب کو دیا ہے''۔ مانا کہنے سے باز نہ آیا۔

اسی دوران نوتن بھی غنودگی کے عالم میں وہاں آ گئی۔

''ماتا جی! مانا صحیح کہتا ہے''۔ اس نے سنتو تائی کو مخاطب ہو کر کہا۔ ''دیپا بھابی ہماری حویلی کی رونق ہیں۔ انہوں نے اس حویلی کی تمام نحوست اور پریشانیوں کو اپنے سینے میں سمو کر اس کو ہر ممکن سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ میری نظر میں دیپا بھابی پوجنے کے قابل ایک دیوی کی طرح ہیں''۔

''تو بھی اپنے بھائی کی طرح اپنی بھابی کے گن گا رہی ہے''۔ تائی سنتو نے جل کر کہا۔ ''ارے یہ بہت بڑی ڈرامہ باز اور چنٹ ہے''۔

''ماتا جی! اپنی زبان کو حد میں رکھو''۔ کلدیپ سے نہ رہا گیا اور بولا۔ ''آپ نے تو ہم بہن بھائیوں کو جننے کی رسم ادا کی ہے۔ آپ خواہ مخواہ بیچاری بے ضرر دیپا کو طعنے مارتی رہتی ہیں''۔

''بھاوجہ! تو اب حد سے زیادہ دیپا بیٹی کو طعنے تشنے دینے لگی ہے''۔ ابا نے کہا پھر اپنے یار لالہ جی کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ۔ تُو اس پاگل کے ساتھ کس طرح رہ رہا ہے؟"

"عظیم! اس جاہل کے ساتھ رہنا میری مجبوری ہے"۔ لالہ جی نے کہا۔ "ورنہ بھگوان قسم میں کب کا اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا"۔

"تُو بھی بکیش کے ساتھ برابر ملا ہوا ہے"۔ سنتو تائی نے ابا کو بھی لپیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری اتنی شاندار دکانوں کی فروختگی میں تُو بھی شامل ہے۔ مجھے معلوم ہے ستار کی ماں اور تم لوگ ہم سے جلتے تھے۔ ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے کلیجے میں"۔

"اری پاگل بھاوج!" ابا نے تائی سنتو سے کہا۔ "میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ حویلی کی تمام دکانوں کی فروختگی کا سو فیصد فیصلہ یہ ہمارے عقلمند لالہ جی کا تھا۔ جسے ڈر تھا کہ وہ اس حویلی کی ملکیت بمعہ دکانوں کے ہار جائے گا"۔

"مجھے لگتا ہے یہ اب نہ صرف حویلی کی ملکیت کا کیس بھی ہار جائے گا بلکہ کل کا مرتا آج مرے گا"۔ تائی سنتو نے رندھی آواز میں کہا۔

❖❖❖
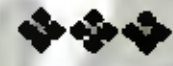
چار روز بعد نکتھال اپنے ساتھ تقریباً بیس پچیس لٹھ، بندوق بردار بدمعاشوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس کے بدمعاشوں نے آتے ساتھ ہی حویلی کے دکانداروں کا سامان بری طرح توڑ پھوڑ کر دکانوں سے اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ جس جس نے مزاحمت کی ان دکانداروں کو ان کی دکانوں سے گھسیٹ کر پہلے ان کو زدوکوب کیا اور پھر ان زخمیوں کو حویلی کے سامنے بہتے گندے نالہ میں پھینک دیا۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ خوف و ہراس کا ماحول طاری ہو گیا۔ چند شریف دکانداروں نے اپنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے خود ہی دکانیں خالی کر دیں۔ کچھ دکانداروں نے وقتی طور پر زبانی کلامی مزاحمت کی ان میں سے چند تھانے مدد کے لئے گئے لیکن وہاں نکتھال نے پہلے ہی چڑھاوا چڑھایا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے ان کی تسلی کے لئے ایک کچا پرچہ کاٹ کر ان کے ساتھ تین سپاہی بھیج دیئے۔ جن میں سے دو اتنے زیادہ بدمعاشوں کو دیکھ کر آدھے رستے سے ہی بھاگ گئے جو آخری بڈھا پولیس والا بچا تھا اس کو نکتھال نے للکار کر کہا کہ تُو یہاں کس قانون کے ساتھ آیا ہے۔ یہ حویلی میں نے قانونی طور پر قانونی مالک سے اچھا مول دے کر خریدی ہے۔ وہ بڈھا سپاہی بھی وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔

جبکہ حویلی کی کھڑکی سے سنتو تائی نکتھال کو چیخ چیخ کر کوستے دیتی رہی۔ کلدیپ جوش میں نکتھال کے پاس گیا اس نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ مارنا چاہا تو بدمعاشوں نے اسے گلے سے تھام کر نکتھال کے پاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کا حکم ہو تو اسے یہیں فارغ کر دیں"۔

نکتھال بڑے اطمینان سے اس کے قریب آیا اور اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"ابے چوہے لگتا ہے بڑی گرمی ہے تیرے خون میں"۔ اس نے چمکارتے ہوئے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جا میرے بچے اپنی ماتا کی گود میں بیٹھ کر کھلونوں سے کھیل۔ یہ میرے ظرف کے خلاف ہے کہ میں کسی معصوم بچے سے بھڑوں"۔

"نکتھال! تُو نے میرے پتا کو ڈرا، ورغلا کر حویلی کی دکانوں کا مردہ بھاؤ سودا کیا ہے"۔ کلدیپ نے کہا۔ "یہ اچھا نہیں کیا تُو نے"۔

"ابے تیرا باوا اتنا بدھو بھی نہیں ہے"۔ نکتھال نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "جس نے اس حویلی کی جھگڑے والی دکانوں کی اتنی کم قیمت لی ہو گی۔ وہ گانٹھ کا پورا ہے"۔

وینا بڑی تیزی سے حویلی کی اوپری سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی بغیر دوپٹہ اوڑھے ان بدمعاشوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ نکتھال کے چہرے پر مارا

اور کلدیپ کو جھٹکے سے اس کے چنگل سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔
''خبردار! تم نے اگر میرے پتی کو ذرا سا بھی نقصان پہنچایا''۔
نکتھال نے منہ پر تھپڑ کھا کر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا بلکہ دیپا کو دیکھ کر کہنے لگا۔''ارے یہ تو بڑی خوبصورت بہادر شیرنی ہے۔ کاش! یہ میرے کن ٹٹوں کے ٹولہ میں ہوتی۔ بھگوان قسم میں اسے اپنے ڈیرے کے بدمعاشوں کا نیتا بناتا''۔
''بکواس بند کر اگر تُو نے ایک لفظ بھی میری پتنی کے بارے میں غلط کہا تو تیری میں زبان کھینچ لوں گا''۔ کلدیپ نے غیرت کے جوش میں گرج کر کہا۔
''چلو اوئے، میری نگاہ سے تم دونوں پتی پتنی دور ہو جاؤ''۔ نکتھال نے انہیں پچکارتے ہوئے کہا۔''میں کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ میں ایسا کرنا اپنے رتبہ اور شان کے خلاف تصور کرتا ہوں''۔
مکیش کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ بھی بھاگتا ہوا آیا۔ اس کی شکل دیکھ کر نکتھال نے کہا۔
''ابے ان سب لوگوں کو بتلا کہ لالہ کیدار ناتھ نے میرے ہاتھوں اس حویلی کی دکانیں فروخت کی ہیں کہ نہیں''۔
''آپ اس بات کی تصدیق مجھ سے کیوں کروانا چاہتے ہیں؟'' مکیش نے ہانپتے ہوئے کہا۔
''تیری تصدیق ان لوگوں کے سامنے اچھی ہے''۔ نکتھال نے رعونت سے کہا۔
''چلو بیٹی! تم حویلی کے اندر جاؤ''۔ مکیش نے دیپا سے کہا۔
''نہیں میں کلدیپ کو لئے بغیر حویلی کے اندر نہیں جاؤں گی''۔ دیپا مسلسل چلائے جا رہی تھی۔ مکیش انتہائی حد تلک گھبرایا بھنایا ہوا تھا۔

''ہاں بھئی تُو بتلا میں نے اچھا مول دے کر لالہ جی سے یہ دکانیں خریدی ہیں کہ نہیں؟'' نکتھال نے مکیش سے پوچھا۔
''جی ہاں، لالہ جی نے خود اپنی مرضی سے یہ دکانیں نکتھال جی کو فروخت کی ہیں''۔ مکیش نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔''اور ان کی باقاعدہ رجسٹری آفس میں ہوئی ہے''۔
مکیش یکدم نکتھال کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولا۔
''میں نے تو آپ کی دکانوں کی خریداری کی تصدیق کر دی ہے لیکن میری آپ سے ایک بنتی ہے''۔
''سیدھے سیدھے بتا کیا بات ہے''۔ نکتھال نے کہا۔''ہاتھ کیوں جوڑتا ہے؟''
''نکتھال جی! آپ بھی اس مجمع بالخصوص میری بیٹی کی ساس کے سامنے بھگوان کی قسم کھا کر یہ گواہی دیں کہ میرا ان دکانوں کی فروخت میں کوئی کردار یا ہاتھ نہیں ہے''۔
''ابے تجھ کو کون پوچھتا ہے۔ کہاں تُو اور کہاں لالہ جی''۔ نکتھال نے بلند آواز میں کہا۔''سن لو بے سارے، مکیش نے تو لالہ جی کے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ وہ ان دکانوں کا سودا میرے ہاتھ نہ کرے لیکن اس نے نہ جانے کس وجہ سے ان دکانوں کو میرے آگے فروخت کیا''۔
مکیش نے حویلی کے اوپر کی طرف اپنا منہ کیا اور چلاتے ہوئے کہا۔''سمدھن جی! سن لی آپ نے نکتھال جی کی بات۔ میرا اس سودے سے دور دور تلک کوئی لینا دینا نہیں تھا اور نہ ہے''۔
''تُو بکواس کرتا ہے''۔ تائی سنتو نے چیخ کر کہا۔ ''میری اطلاع کے مطابق اس سودے میں عظیم اور تُو بھی آگے آگے تھے''۔
کافی دیر بعد جب نکتھال کے غنڈوں نے تمام دکانوں سے مال و اسباب اٹھا کر باہر پھینک دیا تو نکتھال

نے پُرسکون لہجے میں وہاں کھڑے اجڑے بے دخل دکانداروں کو مخاطب کر کے کہا۔

''تم میں سے جو جو دکاندار مجھ سے تین سو روپے لینا چاہتا ہے وہ لے لے اور جس نے میرے خلاف تھانے کچہری جانا ہے وہ بے شک جائے اور یہاں سے ٹھنڈا ٹھنڈا غائب ہو جائے۔

چند دکانداروں نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے نکتھال سے تین سو روپے کی رقم لینے میں مصلحت سمجھی انہوں نے یہ رقم پکڑ لی جبکہ دو چار اکڑ گئے کہ نہیں ہم اس کے خلاف کورٹ جائیں گے لیکن ان دکانداروں میں سے ایک آدھ ہی آگے گیا بھی تو انہیں نکتھال نے راستہ میں ہی مار پیٹ، دھونس، روپے کے زور پر پانی کی جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔

❖❖❖

اُدھر سنتو تائی دیپا کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی تھی۔حویلی میں عجیب وغریب تناؤ کا ماحول چھایا ہوا تھا۔

نوتن کی طبیعت بھی انتہائی تیزی سے زوال کی جانب جا رہی تھی۔ وہ بستر سے لگ گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے تقریباً جواب دے دیا تھا۔ دھونند مریال تسلسل کے ساتھ اس کی چارپائی کے قریب بیٹھ کر رنگ برنگی جڑی بوٹیوں اور عملیات سے شیطانی اثرات کو بھگانے کی کوشش میں سرگرداں تھے تو دوسری جانب لالہ جی یکے بعد دیگرے اس کے علاج کے لئے حکیم، ایلو اور ہومیو پیتھک ڈاکٹرز لاتا رہا۔نوتن کی حالت جب قریب المرگ ہو گئی تو اس نے مجھ سے علیحدہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

لالہ کی فیملی نے مجھے اس کے پاس اکیلے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔نوتن کی آنکھوں کے ڈیلے گڑھے کی صورت میں اندر کو گھس چکے تھے اور اس کا چہرہ کسی کملائے ہوئے گلاب کی مانند جبڑوں میں گھسا پڑا تھا۔ میں نے اپنے دل پر جبر کر کے اسے اس حالت میں دیکھا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ یہ اب اس کا آخری وقت ہے۔ وہ جان کنی کے عالم میں مجھے بڑی حسرت سے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔

''کچھ تو بولو''۔ میں نے اس کی نظروں سے گھبرا کر کہا تو اس نے ٹوٹے لفظوں میں مجھے کہا۔

''ستار! میری آتما کو حسرت ہی رہے گی کہ میری مانگ میں تمہارے نام کا سیندور نہیں لگا''۔

میں اس کی اس بات پر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''تو ایسی باتیں نہ کر نوتن!'' میں نے بھیگی آواز میں کہا۔'' میں ابھی تمہاری مانگ میں سیندور اور ماتھے پر بندیا لگاتا ہوں''۔

''جلدی کرو ستار میری زندگی کی ڈور ٹوٹنے والی ہے''۔نوتن نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔ میں نے دیپا کو کہا کہ جلدی سے سیندور اور تلک لاؤ۔ میرا اور نوتن کا پورا پریوار اس کے اردگرد کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر بندیا اور مانگ میں سیندور لگایا۔ پھر اس کے بعد اس نے مجھے کہا کہ میرا ماتھا چومو۔

مجھ شرم آئی میں نے ایسا نہیں کیا تو اماں نے میری کمر پر ٹھونگا مارتے ہوئے کہا۔''ستار! تم نوتن کی یہ خواہش پوری کرو''۔

میں نے اس کے ماتھے پر ہلکا سا بوسہ دیا تو اس نے خوش ہو کر کہا۔''آج میں بن بیاہی نہیں بلکہ سہاگن کی حیثیت سے چتا میں جلوں گی''۔

ایک بار اس نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ میرے دل میں دو لوگ بستے ہیں۔ایک اس نے میرا نام لیا اور دوسرا اس نے دیپا کے بارے میں کہا کہ بھابی سے مجھے بہت محبت ہے۔اس نے بڑے جی جان سے میری ہر لحاظ سے بہت خدمت کی ہے۔

اس کے بعد اس نے اکھڑتے سانسوں کے ساتھ

بڑے ٹوٹے الفاظ میں اپنے تمام پریوار کو اپنے پاس بلوایا اور اس نے اپنی ماتا (سنتو تائی) کو خصوصی طور پر وصیت کی کہ آپ دیپا بھابی کو اس حویلی کی نحوست، پریشانیوں اور دکانوں کی فروختگی کا دوشی نہ سمجھیں اور نہ ہی ان کی غربت کا مذاق اڑائیں۔ یہ میری بہنوں کی طرح ہے کاش دیپا جیسی بہن سب کو ملے''۔ اتنا کہہ کر اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔

نوتن کے دم توڑتے ہی پوری حویلی میں آہ و فغاں شروع ہو گئی۔ سنتو تائی نے رو رو کر پوری حویلی سر پر اٹھا لی۔ لالہ جی نے شدت غم سے اپنا دل پکڑ لیا جبکہ دیپا نے اپنا سر مردہ نوتن کی چارپائی سے اتنے زور زور سے مارا کہ وہ نہ صرف لہولہان ہو گئی بلکہ اسے غشی کا دورہ پڑ گیا۔

نوتن کی آخری رسومات میں شنکر دیال کی پوری فیملی آئی تو سنتو تائی نے سینہ کوبی کرتے ہوئے ان سب کو خوب لتاڑا۔ حسبِ روایت کوسنے دیئے لیکن اس کے باوجود شنکر دیال اور اس کے خاندان نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا۔

نوتن کے مرنے کے بارہ روز بعد ہائی کورٹ نے لالہ جی کو اسپیشل پینل کورٹ کے بینچ کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا۔ پینل کورٹ سے مراد ایسی عدالت جو دیوانی طرز کے فیصلے سنانے کے علاوہ جیل کی سزا جرمانہ کا اختیار بھی رکھتی تھی۔

لالہ یہ نوٹس لے کر جب وکیل نوشہ کمل کے پاس پہنچا تو اس نے تذبذب سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ متعلقہ محکمے نے تیرے خلاف کوئی ایسی رپورٹ لکھ دی ہے جس کی بنا پر حویلی کا کیس پینل بینچ کے سامنے رکھا گیا ہے۔

''یہ میرے لئے بڑی تشویش کی بات ہے''۔ نوشہ کمل نے لالہ جی سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے اس پیشی میں آپ کو فراڈ کیس میں سزا ہو سکتی ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی پوری حویلی سے ہاتھ دھو بیٹھیں''۔

''تو وکیل صاحب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' لالہ جی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''میں کورٹ جاؤں یا نہیں؟''

''ابھی میں نے آپ کو آنے والے دنوں کی ہلکی سی ممکنہ جھلک دکھا دی ہے''۔ وکیل نے کہا۔ ''کہ یہ ہو سکتا ہے اور اگر کوئی معجزہ ہو بھی جائے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں آپ کا کیس دل و جان سے لڑوں گا۔ یہ اب آپ کی مرضی ہے کہ کورٹ جائیں یا نہ جائیں لیکن کورٹ جو فیصلہ کرے گی تو اس کے آگے ہمیں اپنا سر خم کرنا ہی پڑے گا''۔

وکیل نوشہ کمل سے ملاقات کے بعد لالہ جی نے بڑے سوچ بچار اور کئی لوگوں سے مشورہ کے بعد کورٹ میں پیش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہائی کورٹ کے پینل بینچ کے جسٹس نے ملکیتی دستاویزات اور دیگر شہادتوں کی روشنی میں ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا ملکیتی دعویٰ کو مسترد کر دیا۔ جبکہ لالہ کو عدالت میں P.C.N.O.C کا جعلی اجازت نامہ پیش کرنے کے جرم میں 5 سال قید اور 5000 روپے جرمانہ عائد کرنے کے ساتھ متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کو حکم دیا کہ وہ حویلی کے نیچے کھلی دکانوں کی کمرشل فیس بمعہ جرمانہ موجودہ ریٹ کے مطابق وصول کریں۔

ابھی لالہ جی کے پاس اپیل کا حق تھا۔

عدالتی فیصلہ کے دس روز کے اندر اپیل کی جا سکتی اپیل کو سپریم کورٹ سنتی تھی۔ لالہ کو عدالت کے کمرے کے اندر ہی ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ وہاں شنکر دیال اور اس کے دونوں بیٹے بھی آتے تھے۔ انہوں نے ہتھکڑی لگے تایا کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''تایا! ابھی ہم نے تیری اور تباہی دیکھنی ہے''۔

حویلی میں جب لالہ کو عدالت سے دی گئی سزا اور جرمانہ کی اطلاع ملی تو سنتو تائی نے مکیش، مولدر سنگھ اور ا[illegible] کو جھولی پھیلا کر جو کوسنے اور بددعائیں دیں ان کا لفظوں

میں بیان کرنا انتہائی مشکل ہے۔

''بھگوان کرے تم لوگوں کی اس طرح جانی مالی ذہنی تباہی ہو جس طرح ہمارے ساتھ ہو رہی ہے۔ اے بھگوان تُو ان سب لوگوں کو عبرت کا نشان بنا جنہوں نے ہمارے گھر کا سکون چھینا ہے''۔ اس قسم کے کوسنوں سے حویلی گونجتی رہی۔

اسی یوم کو کلدیپ، سنتو تائی اور مانا سب اکٹھے ہمارے گھر میں آ کر خواہ مخواہ ہم پر الزامات کی بارش کرنے لگے۔ ابا نے سنتو تائی کو کہا کہ بھاوجیہ آپ کو میرے بارے میں کسی نے یہ غلط بتلا دیا ہے کہ میں نے لالہ جی کو حویلی کی دکانیں ننکھپال کے ہاتھوں فروخت کرنے کو کہا تھا لیکن ان پر ابا کی کسی دلیل، قسموں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے کلدیپ کو ایک طرف لے جا کر اسے اپنی دوستی کا واسطہ اور قسم دے کر کہا۔ یار تم لوگ اپنے دلوں میں ہماری جانب سے بدگمانی نہ لاؤ اور اس حقیقت کو سمجھو کہ تمہارے پتا نے اپنی حویلی کی ملکیت کے چھن جانے اور اپنی متوقع سزا کے خوف سے دکانیں فروخت کی تھیں۔ اس نے بھی میری بات کا یقین نہ کیا بلکہ الٹا مجھ سے زندگی میں پہلی بار بڑے بُرے لہجے اور بدتمیزی والی زبان سے بولنے لگا۔ اسی دوران مانا نے غصہ، جذبات میں آ کر بڑے جنونی انداز میں ہمارے گھر میں پڑے قیمتی سامان کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس نے استری اٹھا کر ریڈیو پر بڑے زور سے ماری۔ ابا کی سائیکل کو تین چار بار اٹھا کر کچن میں پھینکا جس کی وجہ سے کچن میں پڑے تمام چینی اور شیشے کے برتن ٹوٹ گئے۔

الغرض ان پاگلوں نے ہمارا پورا گھر منٹوں میں تہس نہس کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ کلدیپ نے مجھے گریبان سے پکڑا اور میرے گالوں پر تین چار تھپڑ مارتے ہوئے مانا کو کہا کہ رسوئی سے چھری اٹھا کر لا اور اس کے گلے میں پھیر۔ مانا ہمارے باورچی خانے میں جا گھسا اور وہاں سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا لایا۔

اماں نے جب مانا کے ہاتھوں میں چھری دیکھی تو وہ چیختی چلاتی ہوئی محلہ میں لوگوں سے مدد مانگنے گئی۔ اماں کے واویلا کو سن کر چند اہل محلہ مجھے بچانے آ گئے۔ میں نے بھی اپنے بچاؤ، مزاحمت کے لئے ایک بڑا ڈنڈا اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اس سے پہلے وہ مجھ پر چھری کا وار کرتا میں نے ڈنڈے کی ایک زوردار ضرب اس کے چھری پکڑے ہاتھوں میں ماری لیکن میرا وار خطا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ڈنڈے کی ضرب تو لگی مگر اس کے ہاتھوں میں چھری کی پکڑ قائم رہی۔ اس نے ایک وار میری گردن پر کرنا چاہا میں قصداً پیچھے ہونے کے لئے جھکا تو معجزاتی طور پر چھری کا وار کلدیپ کی پشت پر جا لگا۔ اسی دوران محلہ والے بھی پہنچ گئے انہوں نے مانا کے عتاب سے مجھے چھڑوایا جبکہ ابا اور چند محلے والے زخمی کلدیپ کو سرکاری ہسپتال میں لے کر گئے۔

سنتو تائی اور اماں کے درمیان زبانی سخت باتوں اور تلخ جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا لیکن یہ سلسلہ شکر ہے چند منٹوں میں ختم ہو گیا۔ ہسپتال سے کلدیپ کے بارے میں یہ خبر آئی کہ اس کی کمر کے اوپری حصہ میں مانا کے وار کا زیادہ کاری زخم نہیں آیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی مرہم پٹی کر کے اسے فارغ کر دیا ہے۔ وہ واپس حویلی آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس مجھے اور مانا کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ وہاں تھانیدار نے میرا اور مانا کا تھپڑوں، گالیوں سے خوب سواگت کرنے کے بعد مختلف دفعات کے تحت پرچہ کاٹنے کی دھمکی دی۔ ادھر ابا اور محلہ کے چند بزرگ لوگ کلدیپ کے پاس حویلی گئے اور اسے سمجھایا کہ وہ اگر تھانے میں ستار اور مانا کے خلاف پرچہ نہ کٹوانے کی سفارش کرے تو ہو سکتا ہے پولیس اس کی یہ بات مان لے۔

بہرحال کلدیپ نے ابا اور دیگر بزرگوں کی بات کا

پاس رکھا وہ ان لوگوں کے ساتھ بذات خود تھانہ آیا اس نے تھانیدار سے وہی درخواست کی جس کا اسے محلہ کے بزرگوں نے سمجھایا تھا۔ تھانیدار ہم دونوں کے خلاف پرچہ نہ کاٹنے پر مان گیا۔ اس نے اس مہربانی کے عوض ابا سے سو روپے رشوت وصول کی اور ہم دونوں کو چھوڑ دیا لیکن اس کے باوجود ماتا جو ابا کی گود میں کھیلا اور ان سے ٹافیاں لے کر کھایا کرتا تھا، اس نے ابا کو اپنی زبان سے نہ صرف ذلیل کیا بلکہ مجھے دھمکی دی کہ جس دن میرا تجھ پر دوبارہ صحیح طریقہ سے ہاتھ پڑا میں تجھے اتنا ماروں گا کہ تو اپنے منہ سے موت مانگے گا۔ اس نے تھانہ میں ہی طوفان بدتمیزی اٹھالیا تھا۔ تھانیدار نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا تو اس کی زبان خاموش ہوئی اور غصہ میں ٹھنڈ پڑی۔

ان حالات میں ہمارے خاندان کا حویلی میں جانا بند ہو چکا تھا۔ صرف دیپا چپکے سے اور وہ بھی جب کلدیپ اور ماتا باہر نکلے ہوتے چند منٹوں کے لئے ہمارے گھر آتی اور حویلی کے اندر پیدا شدہ پریشانیوں کا ذکر کیا کرتی تھی۔ اس نے اماں، ابا کو بتایا تھا کہ ادھر کلدیپ زخمی ہے، سسر جی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔ ان کی ساس (سنتو تائی) اسے مختلف طریقوں سے کچھ زیادہ ہی تنگ کر رہی ہے۔ بقول اس کے انہوں نے حویلی کی فروخت شدہ دکانوں سے حاصل شدہ تمام رقم لالہ جی سے لے کر اپنے قبضہ میں لے لی ہے اور وہ کلدیپ کو حویلی کے روزمرہ کے ضروری خرچوں کے لئے مناسب پیسے بھی نہیں دے رہی ہیں۔

"بیٹی! تجھے معلوم ہے کہ ہمارے آج کل سوائے لالہ جی کے باقی تمام حویلی والوں کے ساتھ تعلقات انتہائی حد تک خراب ہیں"۔ ابا نے اسے صبر کی تلقین کے ساتھ کہا۔ "لیکن میں جیل جا کر اشارتاً لالہ جی سے بات کروں گا"۔

سنتو تائی نے مکیش، دھونڈ اور مریال کے حویلی کے اندر داخلے پر سختی سے پابندی لگا دی تھی۔

کلدیپ کی کمر اور کندھے کے درمیان جو چھری لگنے کا زخم آیا تھا وہ اگرچہ دیکھنے میں معمولی طرز کا تھا لیکن اس کے زخم کئی مہنگی دوائیوں کے لگانے کے باوجود مندمل ہونے کا نام نہ لے رہے تھے۔ اس کے زخموں سے ہر وقت گندا بدبودار مواد پیپ کی صورت میں رستا رہتا تھا۔

دھونڈ اور مریال نے ننکھیال سے حویلی کی ایک دکان اچھے کرایہ پر لے لی۔ یہ دونوں وہاں عملیات، جن بھوت بھگانے کا کام کرنے لگے تھے۔ ان کی دکان پر ہر وقت ان کے گاہکوں کا رش رہا کرتا تھا۔

ادھر ابا، مکیش اور مولدر سنگھ، لالہ جی کی سزا کے خلاف اپیل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ مولدر سنگھ نے ابا کو مشورہ دیا کہ لالہ کی سزا کے خلاف اپیل دائر کرنے کے لئے نوشہ کمل وکیل کی جگہ راٹھور بہادر بیرسٹر کو لیا جائے۔ (یہ 50ء کی دہائی میں ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا)۔

راٹھور بہادر نے ایک بھاری فیس لے کر لالہ جی کی سزا کے خلاف نظر ثانی کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر کی۔

وکیل کی بھاری فیس ابا نے اماں کا زیور فروخت کر کے بھری تھی جس کا انہوں نے لالہ جی سے ذکر نہیں کیا تھا۔

بیرسٹر راٹھور بہادر نے اپنی تحریر کردہ 22 صفحات کی اپیل میں اوّل یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ میرے کلائنٹ نے متعلقہ محکمے سے P.C.N.O.C سرٹیفکیٹ فلاں وکیل کی وساطت سے حاصل کیا تھا اور اسی نے اس سرٹیفکیٹ کے حصول کے بعد مطلوبہ دستاویزات تیار کی تھیں اور وہ ہی اتھارٹی لیٹر لے کر آیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے میرے کلائنٹ کو یہ جعلی دستاویزات بنوا کر اس سے دغا کی ہو۔ دوسرے اس نے ایک قانونی ترمیم کا یہ حوالہ بھی دیا کہ مذکورہ جائیداد کا باقاعدہ پچھلے دس سال سے تجارتی ٹیکس دیا جا رہا ہے اور متعلقہ محکمہ اس قسم کا ٹیکس لے کر اس کی تجارتی حیثیت کو تسلیم کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اور بہت

سے لالہ جی کی فیور میں پوائنٹ لکھے۔ بیرسٹر راٹھور بہادر نے ہائی کورٹ کے بینچ کو اپنے دلائل سے لالہ کو بری کرنے پر بالآخر قائل کر ہی لیا۔

ہائی کورٹ نے لالہ جی کو باعزت طور پر بری کر دیا۔

لالہ جی کی جب ہائی کورٹ کے حکم کے تحت بری ہونے پر ہتھکڑیاں کھل گئیں تو وہ خوش ہونے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

''لالہ یہ تُو کیا پاگلوں کی حرکتیں کر رہا ہے؟'' ابا نے لالہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اس خوشی کے موقع پر تجھے مندر میں پرارتھنا کرنی چاہئے تھی اور تُو الٹا دیوانوں کی مانند اپنا ماتھا پیٹ کر دنیا کے سامنے اپنا تماشہ بنوا رہا ہے''۔

''یار عظیم! میں نے اپنی زندگی کی کتنی بڑی اور بھیانک غلطی کر دی ہے''۔ لالہ کیدار ناتھ نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عدالت سے سزا اور اس پوری حویلی کے کیس کے ہارنے کے خوف کی وجہ سے ٹکھیال کے ہاتھوں اپنی حویلی کی پوری کی پوری گیارہ دکانیں فروخت کر دی ہیں اور دوسرے خلاف توقع عدالت نے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا کیس بھی میرے حق میں خارج کر دیا ہے''۔

ہاں یہ تُو نے واقعی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے''۔ ابا نے کہا۔ ''یاد ہے میں نے تجھے ہاتھ جوڑ اور تیری ٹھوڑی پکڑ کر منتیں کی تھیں کہ تُو حویلی کی دکانوں کو کوڑے کے مول فروخت کر کے اپنے بے روزگار بیٹوں کا مستقبل تاریک نہ کر''۔

''یار عظیم! میں دراصل چاہتا تھا کہ حویلی اپنے ہاتھوں سے مکمل نکلتے نکلتے میں اس سے کچھ رقم حاصل کر لوں اور اس رقم سے میں اپنے دونوں بیٹوں کو کوئی نیا کاروبار کرا دوں''۔ لالہ نے جھنجلا کر کہا۔ ''بس یار! میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے''۔

''اچھا اب جو ہو گیا سو ہو گیا''۔ مولدر سنگھ نے کہا۔ ''جانے والے اچھے برے لمحے واپس نہیں آتے لیکن اپنے پیچھے کئی نسلوں کو بھگتنے کے لئے اثرات ضرور چھوڑ جاتے ہیں''۔

''مولدر سنگھ اپنی بات کی تھوڑی سی ذرا وضاحت اور کر''۔ ابا نے مولدر سنگھ سے کہا۔

''بھئی سچی بات یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی میں کوئی بھی اچھا یا برا فیصلہ کریں گے تو اس کا اچھا یا برا اثر آپ کو یا آپ کی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا''۔ مولدر سنگھ نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''لہٰذا میرے خیال میں انسان کو جب کبھی بھی اپنا یا اپنے بچوں، بچیوں کا رشتہ ناطہ کرنا پڑے یا کوئی کام کرنا پڑے تو یکدم گھبراہٹ یا باہمی مشورہ کے بغیر اس کا فیصلہ نہیں کر دینا چاہئے بلکہ کسی بھی فیصلہ کو کرنے سے پہلے اس کے آئندہ آنے والے اثرات و ثمرات کا ادراک کرنا چاہئے۔ ویسے یہ خوبی گوروں میں موجود ہے۔ وہ اپنی زندگی میں کوئی بھی اپنا انفرادی یا اجتماعی فیصلہ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتے ہیں کہ اس کے آئندہ ان پر ان کی قوم کو کیا ثمرات، نقصانات ملیں گے لیکن افسوس یہ بات ہم ہندوستانیوں میں نہیں ہے۔ معاف کرنا ہم لوگ لکیر کے فقیر اور کنویں کے مینڈک ہیں''۔

لالہ جی کو رہائی کے بعد کوئی سکھ نہ ملا۔ وہ الٹا نئے عذابوں کے شکنجے میں آ گیا۔ رہائی کے بعد اس کو اس کے تمام خاندان والوں نے کوئی خاص اہمیت نہ دی بلکہ کوئی خاص خوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔

ایک طرف ماتا کے بار میں خبریں آ رہی تھیں کہ وہ اپنے آوارہ، بدقماش دوستوں کی صحبت میں رہ کر چرس اور شراب کا نشئی ہو چکا ہے اور دوسرے کلدیپ نے لالہ سے فروخت شدہ دکانوں کی رقم میں سے نصف کا کاروباری غرض کے لئے تقاضا کر دیا۔ لالہ جی اور اس کے درمیان ایک سرد جنگ سی شروع ہو گئی تھی۔

(ہر پل رنگ بدلتی یہ ہنگامہ خیز کہانی جاری ہے)

غزل

دستگیر شہزاد

کون ہے یہ ہر سُو دِل میں
پھیلی ہے خوشبو دِل میں
میں پہلے بت خانہ تھا
اب ہے تُو ہی تُو دِل میں
جگمگ جگمگ کرتا ہے
کب سے اک جگنو دِل میں
اُس سے مل کر مدت تک
رہتی ہے خوشبو دِل میں
اُس کی یادیں آتے ہی
بجتے ہیں گھنگھرو دِل میں
اِک کوئل جانے کب سے
کرتی ہے کوکو دِل میں
اُس نے یہ گھر چھوڑ دیا
چلنے لگی جب لو دِل میں

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہواؤں کے رخ بدل جاتے ہیں اور اونچی فضاؤں میں اڑان بھرنے والے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ یہی نظامِ قدرت ہے۔

مایا جال

مکافاتِ عمل

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

زندگی میں بعض ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا ہے جو ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں، چاہو بھی تو بھلا نہیں سکتے۔ میں یہ واقعہ کبھی نہیں بھول سکا۔

انارکلی بازار کی ایک سٹیشنری شاپ پر مجھے قلم خریدنا تھا جس میں انتخاب کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ میں اس شغل میں محو تھا کہ قریب ہی کہیں کربناک صدائیں ابھرنا شروع ہو گئیں۔ نگاہیں اٹھائیں تو مصروف سڑک کے کنارے ایک معذور شخص غم میں چلا رہا تھا۔ اس کا کرب اتنا گہرا دکھتا تھا کہ اس کی آواز جذبوں کے بوجھ تلے دب گئی تھی اور بے ہنگم بھی تھی۔ یہ کیفیت اس وقت جنم لیتی ہے جب اندوہ رونے اور بین کرنے کی حدوں سے بڑھ جاتا ہے۔

معذور شخص ٹانگوں سے محروم تو تھا ہی، صلاحیتِ کلام سے بھی عاری لگتا تھا۔ اس دم اس کا رواں رواں صدمے سے گھائل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مدد سے بے چینی میں اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

''شاید کوئی اس سے پیسوں والی تھیلی چھین کر رفو چکر ہو گیا ہے''۔ سٹیشنری شاپ کے مالک نے چلا کر کہا۔ ''یہ تھوڑی دیر پہلے یہیں بیٹھا نقدی گن رہا تھا''۔ اس نے بات مکمل کی۔ اب وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ کئی لوگ افسردہ تھے کہ کسی ظالم نے ایک معذور بھکاری کو اس کی عمر بھر کی کمائی سے محروم کر دیا تھا اور اس شخص کی پونجی پر ڈاکہ ڈالا تھا جس کی لاچار زندگی پہلے ہی

روگ بن گئی تھی۔

٭٭٭

یہ واردات قلی خان نے کی تھی، جسے ان دنوں بھاری رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اپنی شادی کر رہا تھا اور بعد میں اسے ماہِ عسل کے لئے مری بھی جانا تھا۔ اس نے شادی بڑے اہتمام سے کی اور بیوی کو سونے سے لاد دیا۔ اس کا یہ کارنامہ احباب کے لئے اچنبھے کا باعث بن گیا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک واجبی تعلیم یافتہ شخص ایسی شاندار تقریب منعقد کر سکتا تھا، خصوصاً جب کہ اس کے پاس ذرائع بھی ناپید تھے۔

قلی خان کا تعلق انڈر گراؤنڈ مافیا سے تھا۔ وہ کوئی ڈان نہیں تھا بلکہ کسی بدمعاش کے کارندوں کا کارندہ تھا۔ کبھی کبھار اس کی خدمات حاصل کر لی جاتی تھیں، بصورتِ دیگر وہ بے روزگار ہی رہتا تھا۔ جائز طور پر روزی کمانا یا اچھے انسانوں کی طرح گزر کرنا اسے برا لگتا تھا۔ شخصیت پر بدقماشی کی چھاپ اسے جچتی تھی بلکہ اس ڈھب کی مسکراہٹ اس کی سرشت کا حصہ دکھتی تھی۔ پیٹ میں نوالہ جائے نہ جائے لباس وہ اس سلیقے سے پہنتا کہ نو دولتیوں کو مات دیتا تھا۔

سیما اس پر مرمٹی تھی، شاید اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو چالاک سمجھتی تھی اور کسی شہزادے کے ذریعے اپنی موروثی غربت سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی لیکن شادی کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ آسمان سے گری تو کھجور میں اٹک چکی تھی اور پہلے سے بھی زیادہ لاچار ہو گئی تھی کیونکہ اس نے شادی گھر سے فرار ہو کر کی تھی اور اپنی تباہ حالی کے علاوہ معاشرے سے بھی ٹکر لے چکی تھی۔

اسے اپنے گھر کی بے سروسامانی اور طرزِ رہن سہن پر شدید اعتراض تھا۔ قلی خان کے دکھائے ہوئے خواب اسے راہِ زندگی میں سراب دکھتے تھے۔ اپنی بدنصیبی پر بھی وہ گھبرا بھی جاتی تھی۔ ایسے میں خاوند سے لڑ پڑتی۔ شادی کے آغاز پر ہی دونوں کے بیچ بدمزگیاں بڑھ گئی تھیں۔

سیما نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرح مجبور ہو جائے اور اپنا گھر چلانے کے لئے اسے دوسروں کے ہاں محنت مزدوری کرنا پڑے مگر تقدیر کا لکھا کون ٹال سکا ہے۔ جلد ہی سیما کو بھی ماں کی ڈگر پر چلنا پڑا۔ وہ ایسا نہ کرتی تو فاقوں سے مر جاتی کیونکہ قلی خان جیب تراشی کے جرم میں جیل جا چکا تھا۔

''میں شام تمہارے لئے سالگرہ کا تحفہ لے کر آؤں گا''۔ اس نے صبح گھر سے نکلتے ہوئے بیوی سے کہا تھا مگر کئی روز تک گھر واپس نہ آیا۔

سیما اپنے خاوند کے ذرائع معاش پر بہت دکھی رہتی تھی۔ غربت تو اس نے والدین کے ہاں بھی دیکھی تھی مگر وہاں رزقِ حلال پر فخر کیا جاتا تھا مگر اب اس کے اپنے گھر نہ تو رزق تھا اور نہ ہی فخر۔

انسان جب مل کر رہتے ہیں تو باہم ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ نیکی کو بدی پر غالب آنا چاہئے لیکن کبھی نیکوکاروں کا کردار بھی مضبوط نہیں ہوتا، ایسے میں خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اور گھرانہ بحیثیت مجموعی منفی رویوں کو اپنا لیتا ہے۔ سیما قلی خان کے رنگ میں رنگی جا چکی تھی اور اب دونوں میاں بیوی معاشرے کے کمزور طبقوں کو کچل کر راہیں بنانا چاہتے تھے۔ قلی خان جیل سے پختہ کار مجرم کا روپ پا کر باہر نکلا تھا۔

سیما جس گھر میں کام کاج کرتی تھی وہاں صرف دو بہن بھائی رہتے تھے جو نوعمر تھے اور حصولِ تعلیم کے لئے شہر میں مقیم تھے۔ والدین نے انہیں کرائے پر رہائش گاہ لے کر دے رکھی تھی جو گھریلو ساز و سامان سے آراستہ کر دی گئی تھی۔ قلی خان اور سیما نے اس گھر میں نقب زنی کا منصوبہ بنایا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق سیما نے اپنے موبائل

فون سے اس تالے کی تصاویر اتار لیں جو بہن بھائی استعمال کرتے تھے۔ قلی خان نے اس سے ملتا جلتا ایک دوسرا تالہ تلاش کیا جسے اصل تالے کی جگہ رکھ دیا گیا۔ سیما نے کمال ہوشیاری سے بہن بھائی کے کی رنگ میں چابیاں بھی تبدیل کر دیں۔ اس طرح تیسری چابی سیما اور قلی خان کے پاس آ گئی۔ منصوبے کے اس مرحلے پر سیما نے اپنی ملازمت ترک کر دی اور گھر بیٹھ گئی۔

عید کی چھٹیوں میں بہن بھائی اپنے گاؤں چلے گئے۔ ایک رات پچھلے پہر قلی خان ٹرک لے کر ان کے بدقسمت گھر پہنچ گیا اور ساتھیوں کے ہمرکاب وہاں خوب لوٹ مار کی۔ عمارت کو ساز و سامان سے تقریباً خالی کر دیا۔ اس طرح یہ مسروقہ سامان اس کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ سیما کے ہاتھ زیورات بھی لگے۔

اس واقعے میں کامیابی کے بعد سیما اور قلی خان کا اعتماد بڑھ گیا۔ ان کے ذہن میں اختراع ابھری کہ جرائم کی دنیا پیسے سے مالا مال ہے اور اس پہلو کج روی میں چالاکی شامل کر دی جائے تو مایا کی آسان فراوانی ممکن بنائی جا سکتی ہے۔

اب ان کی سوچ بچار جرائم کا تانا بانا بُننے میں صرف ہونے لگی تھی۔ اس ضمن میں وہ مناسب منصوبہ بندی کی افادیت سمجھ چکے تھے۔ مجرم کے لئے بے غیرتی کس قدر اہم ہوتی ہے، یہ پہلو بھی وہ جانتے تھے اور اپنی شخصیات پر فخر کرتے تھے۔

سیما نے ایک معروف سٹور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے وہاں سیلز گرل کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ سیما کو یہ شغل بھلا دکھائی دیا تھا بلکہ وہ اس کام کو اپنی سرشت کے قریب تر پاتی تھی۔ اس سٹور پر اس کی اپنی کائنات بھی برائے فروخت بجھائی دیتی تھی۔ مال کے ساتھ وہ اپنی مسکراہٹیں بھی بیچا کرتی تھی۔ کبھی سامان کے ساتھ اسے اپنی ادائیں بھی بیچنا پڑتیں۔ کئی صاحبانِ نظر اس کے اسیرانِ زلف بھی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے ہاتھوں اتنا کچھ خرید چکے تھے کہ اب جام نہیں، حُسنِ ساقی ان کے مدِنظر رہتا تھا۔

قلی خان نے زندگی میں بے شمار گُر سیکھے تھے، کئی اس نے دوسروں کو بھی سکھائے مگر اہم ترین یہ تھا کہ دام مناسب لگ جائیں تو ملکیت میں آئی ہوئی ہر چیز بک سکتی ہے۔

''کون کہتا ہے کہ میں تمہاری ملک ہوں؟'' سیما نے شیریں لہجے میں خاوند سے احتجاج کیا، پھر لجائی اور مسکرانے لگی۔ ''لگتا ہے کہ میں تمہاری زندگی میں عاریتاً آئی تھی''۔ اس نے بات مکمل کی۔

''ہاں، شادی کے روز کپڑے بھی میں نے ادھار مانگ کر پہنے تھے''۔ قلی خان نے جواب دیا۔

چند روز میں سٹور کے مالک مسٹر نیاز کی کئی قابلِ اعتراض تصویریں قلی خان کے ہاتھ لگ گئیں۔ اس کے ہمراہ بیوی کی تصویریں بھی اسے نازیبا نہ لگیں۔

''ان رویوں کو بڑے نفسیاتی عارضوں میں گردانا جاتا ہے''۔ سیما نے اپنی حرکات کو جائز شمار کر لیا۔ اسے اپنی سمت خاوند کی کشش بڑھتی ہوئی دکھائی دی، خصوصاً تصاویر دیکھنے کے بعد۔

''ہم دونوں ہی مجرمانہ ذہن رکھتے ہیں''۔ قلی خان نے ایک روز معاملہ واضح کر دیا۔

''عورت کے لئے دولت کے انبار لگانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو سکتا ہے''۔

سیما اندازہ کر چکی تھی۔ اس نے اپنے خیالات کا اعادہ خاوند کے سامنے کر دیا۔

''تمہاری یہ سوچیں پروان چڑھیں تو میں تمہارے بندھن سے اسی طرح بے دخل ہو جاؤں گا، جیسے جیب سے ادھار کھاتے کی رقم''۔ قلی خان ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا۔

''رقم میری ہو گی مگر تمہاری جیب میں محفوظ رہے گی''۔ سیما نے فوراً وضاحت کردی۔

مسٹر نثار نے تصاویر میں اپنے کرتوت دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔

''اگر یہ ذخیرہ آپ کی معزز اہلیہ کو مل گیا تو آپ کے کنبے کا کیا حشر ہو سکتا ہے؟ سوچیں! آپ اپنی اولاد کو کیا منہ دکھائیں گے جو آپ کو اپنا رول ماڈل سمجھتی ہے؟'' قلی خان نے پستول جیب میں سرکاتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی قیمت کی بات کرو''۔ مسٹر نثار نے تھوک نگلتے ہوئے اس سے کہا۔

''ظاہر ہے کہ میں آپ کے سٹور کی ملکیت نہیں مانگوں گا''۔ قلی خان نے بھاری پتھر دے مارا۔

''اگر یہی تقاضا کر لیا تو؟'' مسٹر نثار نے اوسان بحال رکھتے ہوئے پوچھا۔

''پھر میں اپنی پری چہرہ سیما آپ کو سونپ دوں گا''۔ قلی خان نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''معاملہ اس کی خدمات کے عوضانے تک محدود رکھو''۔ نثار نے کہا۔

قلی خان نے بھاری رقم کا مطالبہ کر دیا۔

''میرے پاس قارون کا خزانہ نہیں ہے''۔ نثار نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

اگلے روز سیما مسٹر نثار سے ملی اور معاملہ طے کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ رقم حاصل کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی سیر کے لئے بنکاک چلے گئے۔

پردیس میں بھی سیما کے اطوار نہ بدل سکے۔

کہتے ہیں کہ حیا عورت کا زیور ہوتا ہے۔ اسی زیور کے باعث وہ معاشرے میں معتبر ٹھہرتی ہے اور اگر وہ اپنی یہ کایا پلٹنا بیٹھے تو ہر اس دل کی رانی بن جاتی ہے جو اسے غلط انداز نظروں سے متوجہ کرتا ہے۔ اسے رنگ و نسل کی پروا بھی نہیں رہتی۔ سیما نے کئی پردیسی کھانوں کا لطف اجانب کے ساتھ اٹھایا اور اپنا غیر ملکی دورہ یادگار بنا لیا۔ واپسی پر اتنی خریداری کی کہ احباب میں دھوم مچا دی۔ قلی خان کا بس ایک ہی تقاضا ہوا کرتا تھا کہ ''مجھے تمہاری اجنبی دوستوں کے ہمراہ ایسی اچھوتی تصویریں چاہئیں جو میرے من میں تمہاری تمنا کے بھانبڑ جلا دیں''۔

وطن واپس آئی سیما کو مختلف طرز کے جرم کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک خوش باش جوڑے کی ننھی کلی اغوا کر لی۔

ماں امریکہ سے آئی تھی، کسی تقریب میں شرکت کرنے۔ اس کی گود میں ننھی بچی تھی، خوبصورت سی، عمر کوئی دس ماہ ہو گی۔ سیما نے امریکن خاتون سے دوستی کر لی۔ بعدازاں بچی سے کھیلنے لگی۔ اسے اِدھر اُدھر گھماتی رہی۔ بچی کی ماں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ وہ بچی کو سیما کے پاس چھوڑ کر خود کھانا لینے چلی گئی۔ اس کی یہی کوتاہی ممتا کے لئے روگ بن گئی۔ سیما موقع پا کر بچی سمیت تقریب سے کھسک گئی۔ معصوم روح ماں سے جدا کرتے وقت اس کا دل ذرا نہ پسیجا۔

شام کے وقت اس نے بچی کو نشہ آور ادویہ دے دیں۔ اسی رات اس نے یہ بچی اپنی ایک بے اولاد مہربان کو سونپ دی اور اس کے عوض ڈھیر ساری رقم وصول کر لی۔ اپنی مہربان کے ساتھ بھی اس نے جھوٹ بولا۔ اسے یقین دلایا کہ بچی ایک کثیر الاولاد جوڑے نے اس کی خصوصی درخواست پر جنم دی تھی اور اس کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔

سیما نے تو بھاری رقم اینٹھ لی مگر بچی کے والدین پر قیامت گزر گئی۔ سیما اور قلی خان کو کڑے جرائم کے پے در پے ارتکاب نے پتھر دل بنا دیا تھا۔ وہ جس قدر انسانیت سوز جرم کرتے، اتنا ہی اسے پُرلذت پاتے اور اپنی کارگزاری پر فخر محسوس کیا کرتے۔ انہیں معاشرے کے وہ افراد بُرے دکھائی دیتے جنہیں وہ حفاظت کے حصاروں

میں پاتے۔

❖❖❖

سیما اس گروہ کے ساتھ ناطہ استوار کر چکی تھی جو معاشرے کے بااثر افراد کو کمفرٹ گرلز بہم پہنچایا کرتا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی لڑکیوں کی فہرست میں شامل کروا رکھا تھا۔ وہ کوئی نوخیز کلی نہیں تھی پھر بھی انتخاب کے مراحل میں دیگر کو مات دے جاتی تھی۔

''یہ دودھ اور مکھن کی بنی ہوئی دکھتی ہے''۔ ایک پرانے ریٹائرڈ بیوروکریٹ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ اس کے بدن کی رنگت واقعی کمیاب تھی، کسی حد تک لاثانی بھی۔ کھلتی ہوئی سفیدی پر مکھن کی سی چکناہٹ جو دکھائی دیتی تھی مگر موجود نہیں تھی۔

انٹرنیٹ پر بھی سٹی گرلز کی فہرست میں اس کا تعارف نمایاں دکھائی دیتا تھا جہاں وہ اپنی عامیانہ تصاویر صبح شام بدل دیا کرتی تھی۔ اس کے مخصوص سیل نمبر کے ریٹ تیزی سے بڑھ گئے تھے۔

سیما نے معروف مقامات اور کئی شہرہ آفاق ہوٹلوں کی سیر کر لی تھی، مختلف نسلی انواع کے دوست بنا چکی تھی اور نسلوں کے اطوار بخوبی جان چکی تھی۔ اسے سنگھار میں سجنا اور اداؤں میں جچنا پوری طرح آ گیا تھا۔ اتنا کہ وہ ہر صاحب آرزو کے رنگ میں رچ جایا کرتی تھی۔

ازدواجی زندگی میں قلی خان محض اس کا معاون بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی آرزوئے جان اب کئی دوسروں کی جان آرزو تھی۔ وہ حکم کے تحت بناؤ سنگھار میں اس کی مدد کیا کرتا تھا اور پھر گاڑی پر اسے کوچہ رقیباں چھوڑ آتا۔ خود شب بھر انگاروں پر لوٹتا رہتا۔ مگر وہ بے بس تھا، سیما کے رحم و کرم پر۔ تعلق اگر چلنا تھا تو بس یونہی، ورنہ گھروندا ختم ہو جاتا۔ سیما منہ زور ہو چکی تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ قلی خان جونک کی طرح اس کی کمائی پر پل رہا تھا اور پرتعیش زندگی بسر کر رہا تھا۔

وہ سیما سے بحث بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ صبح دم وہ گھر لوٹتی تو بری طرح تھک چکی ہوتی۔ اس کے جوتے بھی قلی خان ہی کو اتارنا پڑتے۔ کبھی مہربان ہوتی تو اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی لیتی ورنہ گھر کی بنی ہوئی ہنڈیا سے اسے ابکائیاں آنے لگتیں۔ اپنا بنایا ہوا کھاجا صرف قلی خان ہی زہر مار کر سکتا تھا۔

کبھی غور کرتا تو اسے احساس ہوتا کہ جرائم کی دنیا میں بھی درجہ بندی موجود ہے۔ ہر جرائم پیشہ دوسرے کو کچل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ لالچ کی کوئی انتہا نہیں۔ دوست کم بنتے ہیں اور دشمن زیادہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

قلی خان کو بھلائی کا رستہ کبھی بہتر دکھنے لگتا۔ پروردہ حسرتیں اسے سمجھاتیں کہ کنبے میں پیار رچا بسا ہو تو غربت کے دن بھی بھلے گزر جاتے ہیں۔ اس جیون کا کیا فائدہ جس میں ہر دم جان کے لالے پڑے ہوں؟ وہ سوچتا۔ دکھ اسے ان محرومیوں پر بھی ہوتا تھا جو سیما نے اس کی زندگی میں بھر دی تھیں۔ وہ کیسی عورت تھی جو بچوں کا وجود اپنے روزمرہ پر بار خیال کرتی تھی اور کنبہ پروری سے نفرت کرنے لگی تھی۔

''کسی شب میں بھی تمہیں اپنے پہلو میں سجاؤں گا''۔ ایک شام قلی خان نے اسے کہا۔ ''منہ مانگی مایا دے کر''۔ مگر سیما ہنس کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خاوند اس کا طلسم تصور کرتا رہ گیا۔

اب قلی خان اتنا سرمایہ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ سیما کو کئی روز تک اپنا بنا کر رکھ سکے۔ اس سے باتیں کرے اور اسے اپنا ہم نوا بنا سکے۔ اسے سمجھائے کہ جن راہوں پر وہ دوڑ پڑی تھی، وہ بالآخر اسے تباہ کر دیں گی۔ مزید براں وہ اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا، اس کے ساتھ بیٹھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا چاہتا تھا اور اسے کنبہ پروان چڑھانے کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

مسٹر ڈار بڑے بیوروکریٹ تھے۔ اپنے والد کی خدمت جی جان سے کرتے تھے۔ ان کے والد فالج زدہ تھے۔ مسٹر ڈار روزانہ صبح انہیں گاڑی پر اپنے ساتھ پارک لاتے اور ورزش کراتے۔ تھوڑی دیر ورزش کرانے کے بعد وہ انہیں ایک بینچ پر بٹھا دیتے اور خود جاگنگ کرنے میں مشغول ہو جاتے، دور تک نکل جاتے۔ مسٹر ڈار کے والد اس دوران نفل پڑھا کرتے، کبھی تسبیح کے دانے ان کی انگلیوں میں متحرک ہو جاتے۔

قلی خان کئی روز سے باپ بیٹے کے معمولات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا ایک دوست، احسان بھی اس کے ساتھ مل کر اغوا برائے تاوان کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بالآخر دونوں نے اپنے انتظامات مکمل کر لئے اور سرما کی ایک صبح منصوبے کی تکمیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اغوا کی یہ بڑی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ حکومتی ادارے حرکت میں آ گئے۔

ٹیلی فون پر معاملہ احسان نے طے کیا۔ مسٹر ڈار تاوان کی رقم ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ والد کی صحت کے بارے میں بے حد پریشان تھے۔ بدقسمتی سے مغوی ابتر حالات کا بوجھ نہ برداشت کر سکے۔ ان کی روزانہ دواؤں کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا تھا۔ اغوا کا دورانیہ طویل ہوا تو وہ انتقال کر گئے۔ قلی خان کو لاپرواہی کا احساس سانحہ ہونے کے بعد ہوا۔ اسے معاملے کی نزاکت کا ادراک ہو چکا تھا مگر اس کے سامنے راستے اب مسدود تھے۔ وہ چند روز مسٹر ڈار کو اِدھر اُدھر بھگاتا رہا بالآخر احسان کے ذریعے ان سے رقم وصول کر لی۔

تاوان بھرنے کے بعد مسٹر ڈار والد کا انتظار کرتے رہے مگر اغوا کاروں کی طرف سے رابطے مفقود ہو چکے تھے۔ مسٹر ڈار کئی جگہوں پر مارے مارے پھرے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دگرگوں حالات کے باعث ان پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

پولیس بھی اپنے تئیں کارروائیاں کر رہی تھی مگر معاملہ الجھتا چلا گیا تھا۔ چند روز بعد مسٹر ڈار کے والد کی تباہ حال لاش شہر کے ایک پارک سے مل گئی۔

پولیس نے چند اچھے اور قابل افسروں کا انتخاب کیا اور مسٹر ڈار کے ساتھ مل کر سانحے کی چھان بین شروع کر دی۔ فون کالز کے مختلف ڈیٹا نے مدد دی۔ چند ہی روز میں احسان کو گرفتار کر لیا گیا جس نے تفتیش کے دوران تمام حقائق اگل دیئے۔ اگلے روز قلی خان بھی گرفتار ہو گیا۔ اسے روپوش ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

لوگ یہ بھی کہتے رہے کہ سیما نے اس کی روپوشی پولیس پر ظاہر کر دی تھی کیونکہ اب وہ اسے اپنے اوپر بوجھ خیال کرتی تھی اور اسے کسی طرح اپنے راستوں سے ہٹانا چاہتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے غصے میں آ کر پولیس سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ کاش اس کا خاوند کسی مزاحمتی مقابلے میں مارا جائے۔

سیما ایک بھرپور سوسائٹی گرل کا روپ دھار چکی تھی اور اس طرح معاشرے کے مختلف طبقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا چکی تھی۔

''عورت اگر حیا بیچ ڈالے تو دھرتی کے ہر کونے میں بارسوخ ہو سکتی ہے''۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی اور اس پر اترایا کرتی تھی۔

''دنیا میں زیادہ تجارت ستر پوشی اور لباس کے زمرے میں ہوتی ہے یا عریانی کے؟'' وہ عموماً سوچا کرتی۔

خاوند کے جیل جانے پر سیما کی آزادی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنا گھر خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر لیا اور اپنے مشاغل کو ہمہ رنگی سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے ہاں شباب اور شراب کی محفلیں بڑھتی گئیں۔ اپنے معیوب دھندوں پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اشتہاری فلموں میں بھی کام کرنے لگی۔ اسی دور میں اس نے اپنے

خاوند سے طلاق حاصل کر لی، جس پر قتل کا مقدمہ بن چکا تھا اور اس کا بچ نکلنا محال دکھائی دینے لگا تھا۔

سیما کی ترقی اپنی راہوں پر جاری رہی۔ مایا کو کھینچ مایا، کر کر لمبے ہاتھ، سیما اسی مفروضے پر آگے بڑھتی رہی۔

آرتھر سے اس کی ملاقات دبئی میں ہوئی تھی، جہاں دونوں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ان کے کمرے ہمسائیگی میں واقع تھے۔ سیما کو آرتھر کی جیب بھاری دکھائی دی تھی جبکہ آرتھر سیما کے حُسن پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ جلد ہی دونوں نے کاروباری اشتراک کا فیصلہ بھی کر لیا۔ انڈر ورلڈ اور منفی بزنس میں آرتھر کے ہاتھ لمبے تھے۔ وہ ایک بین الاقوامی گروہ کا سرغنہ تھا جو نشہ آور ادویہ سمگل کیا کرتا تھا۔ اس کے روابط کئی ممالک میں استوار تھے۔ سیما کی وجہ سے اسے کاروبار میں خاطر خواہ آسانیاں میسر آ گئیں۔

''دنیا کے کسی کونے میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو منہ کھولے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کے ہنر پر منحصر ہے کہ اپنا کام ایک بوتل شراب سے نکلوا لیں یا اس زمرے میں زرِ کثیر صرف کر دیں۔ مناسب مہرے کی تلاش اصل امتحان ہوتا ہے۔ عورت یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتی ہے''۔ سیما اپنا تجزیہ بیان کیا کرتی تھی۔

❖❖❖

چند ہی سالوں میں اس نے شہر کے بہترین علاقے میں چار کنال رقبے پر مشتمل کوٹھی تعمیر کر لی۔ اس میں اس نے تمام حسرتیں پوری کر لی تھیں۔ اس کوٹھی کو ہر لحاظ سے عالیشان تعمیر کہا جا سکتا تھا۔ رہائش گاہ کے لئے زیادہ تر فرنیچر بیرونی ممالک سے درآمد کیا گیا تھا۔ قالین خصوصی طور پر بنوائے گئے تھے۔ لان کے لئے گھاس فرانس سے منگوائی گئی تھی۔ انمول پرندے لان کی پچھلی طرف پنجروں میں پھدکا کرتے تھے۔ کوٹھی میں سوئمنگ پول دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں سنہری رنگ کی ٹائلیں استعمال کی گئی تھیں۔ رات جب پول کے کنارے روشنیاں جگمگاتیں تو لگتا جیسے شوقین مزاج سونے کے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے ہوں۔

سیما کو سنہرے پانیوں میں تیرنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ تیراکی کرنے والوں کو کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی تھی۔ وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے اور پانیوں میں اٹکھیلیاں کرنے کی مشاق ہو چکی تھی۔ غیر ممالک سے آنے والے کئی مسافر سیما کی کوٹھی استعمال کیا کرتے تھے، خصوصاً وہ جنہیں سیما کی میزبانی پسند آتی تھی۔

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہواؤں کے رخ بدل جاتے ہیں اور اونچی فضاؤں میں اڑان بھرنے والے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ یہی نظامِ قدرت ہے۔

بعض اوقات یہ تبدیلی اچانک وارد ہوتی ہے۔ سیما کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ سیما اور آرتھر کی ڈرگ مافیا قانون کی نظر میں آ چکی تھی۔ سراغ رساں ادارے ان دونوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ پہلے آرتھر دبئی میں گرفتار ہوا، پھر اگلے دن سیما لندن میں پکڑی گئی۔ ان سے منسلک افراد بھی پکڑے گئے۔ مقدمہ لندن کی عدالت میں چلا۔ سیما کو اکیس سال قید سنا دی گئی۔

جیل میں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ دنیا میں کس قدر اکیلی تھی۔ وہاں اسے بے شمار چاہنے والے یاد آئے جو گزرتے لمحوں کی طرح اس سے بچھڑ گئے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ مایا اصل میں انسانی حب و پیار کا دوسرا نام ہے تو وہ لمحوں کو لاحاصل بتا دینے پر رونے لگی۔ اب یہی زنداں اس کا ٹھکانا تھا۔ تمکنت اس سے روٹھ چکی تھی جبکہ اس کی سلطنت ویران ہو چکی تھی۔ دولت جو اس نے کمائی، اب اس کے لئے بے کار تھی۔ بھری دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو زنداں میں اس کی خیریت پوچھ لیتا۔

یہ مکافاتِ عمل کا دور تھا۔

◆▲◆

اندھیرے سے اجالے تک

کشکول

بس بات اتنی سی ہے کہ دکھاوا چھوڑ دو غرور کم ہونے لگ جائے گا اور شکر کرنے لگ جاؤ عاجزی اور سکون کے فرشتے بھی تم پر نازل ہو جائیں گے اور تمہارا کشکول مکمل ہونے لگ جائے گا۔

☆ رمیز احمد 0331-5178929

انسان کا ہر مغرور عمل اس کے کسی نہ کسی احساسِ کمتری کی ترجمانی ضرور کرتا ہے کیونکہ کاملیت کو دکھاوے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ دکھاوا تو ہمیشہ کمی کو ہی پورا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ پھر اس دکھاوے، اس نمائش کی کوکھ سے غرور کا سانپ جنم لیتا ہے جسے کچھ خوشامدی بڑے شوق سے پالتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے جب یہ اژدھا بن جاتا ہے اور خاندان کے خاندان نگل جاتا ہے۔

ہم کئی بار اپنے اوپر ہوئے احسان کو بھی اپنا حق سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہاں سے ہی تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر ہم کسی کے فرض کو بھی اپنے اوپر قرض سمجھیں تو احساسِ ذمہ داری بڑھے گا اور ذمہ دار لوگ ہی اصل بڑے لوگ ہوتے ہیں۔

تم خوبصورت ہو تو اس میں تمہارا کیا کمال، تمہیں مادی دولت دی گئی تو اس میں تمہاری کیا ذہانت، تم سے زیادہ ذہین لوگ بیٹھے ہیں نوالوں کو ترستے ہوئے۔ تم کو صاحب قلم بنا دیا گیا ہے تو اس میں اترانے والی کون سی بات ہے کہ غور کرو جب تم قلم چلاتے ہو تو خیال کہاں سے نازل ہوتا ہے۔ کیا تم خیال کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتے ہو؟ یہ تو کہیں غیب سے ہی آ رہا ہے نا جو کسی وقت بھی چھینا جا سکتا ہے۔ تمہیں تو زیادہ عاجز ہونا چاہئے۔

تم سوچتے تو ضرور ہو گے کہ یہ کمی کیوں ہے جس کو مجھے نمائش سے بھرنا پڑتا ہے۔ اگر تمہیں جواب نہیں ملتا تو اپنے کشکول کا حجم (Size) دیکھو کہ اگر یہ چھوٹا ہوتا تو اب تک مکمل بھر چکا ہوتا اور کاملیت کو دکھاوے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم آغاز کو انجام کے حوالے سے پہچان جاؤ تو

کبھی اتنا چیخ چلا کر محرومیاں نہیں گنواؤ گے کہ جو محروم ہے وہ حساب سے بھی تو آزاد ہے اور حساب دینا ہی تو مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آگے بھی۔

ہر انسان اس منصف کی نظر میں ایک جیسا ہے اور اس کے امتحان میں جس کو اس نے مشکل پیپر دیا ہے اس کی مارکنگ آسان کرے گا اور جس کو پیپر آسان دیا اس کی مارکنگ یعنی حساب سخت کرے گا۔ اس نے جس کو ایک کروڑ روپیہ دیا اس کا ایک لاکھ صدقہ کرنا اور جس کو سو روپیہ دیا ہے اس کا ایک روپیہ صدقہ کرنا برابر رکھا ہو گا اور بات پھر غرور پر آ جائے گی کہ شاید جو ایک لاکھ دے رہا ہے وہ دیتے ہوئے مغرور ہو جائے اور پچھلے اعمال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور دوسرے کا ایک روپیہ قبولیت کے مدارج طے کرتا ہوا اس کو ارفع کر دے۔

بس بات اتنی سی ہے کہ دکھاوا چھوڑ دو غرور کم ہونے لگ جائے گا اور شکر کرنے لگ جاؤ عاجزی اور سکون کے فرشتے بھی تم پر نازل ہو جائیں گے اور تمہارا کشکول مکمل ہونے لگ جائے گا اور اس کے مکمل ہونے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو کشکول چھوٹا ہو جائے یا عطا زیادہ ہو جائے۔

کشکول چھوٹا ہونے کا مطلب ہے خواہشات کم ہو جانا اور ان دونوں صورتوں میں فائدہ تمہارا ہی ہے۔

تم بس طلب کی سمت درست کر لو کیونکہ اگر تلاش کی تکمیل پر طلب کی قیمت ختم ہی ہو جاتی ہے تو صاف ظاہر ہے وہ قیمتی تھی ہی نہیں فقط سراب تھا۔

تو آخر ہم خواہش ترک کیوں نہیں کر دیتے؟

بات تو صاف ظاہر ہے تو ظاہر کو ظاہر پر چھوڑ کر باطن کی طرف کیوں نہیں جاتے۔ جہاں سکون بھی ہے سفر بھی ہے اور قسمت ہو تو منزل بھی جو پیاس بھی بجھاتی ہے اور ہوس بھی ختم کرتی ہے۔

❋✳❋

جُرم چُھپتا نہیں

جب سیٹھ نے بنارس میں بذریعہ ڈاک خانہ وہ لفافہ وصول کیا اور کھولا تو اس میں سے بجائے نوٹوں کے پوسٹل گائیڈ (کتاب) کے بے ترتیب پھاڑے ہوئے صفحے ٹھیک نوٹوں کے وزن کے برآمد ہوئے۔

☆ حبیب اشرف صبوحی

گزشتہ ماہ میں نے محترم نقی محمد خاں خورجوی کی کتاب "عمرِ رفتہ" سے کچھ دلچسپ واقعات پیش کئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ بھی یہ دلچسپ واقعات قارئین کی نذر کرتا رہوں گا۔ موصوف کا تعلق چونکہ پولیس سے رہا ہے اس لئے جرم و سزا سے متعلقہ دو واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔

1916ء میں علاوہ خفیہ کام کے مجھے ایسی الجھی ہوئی تفتیشیں اہم اور پرانے مقدمات کی دی گئیں کہ جن کو ضلع پولیس اور سینٹرل سی آئی ڈی کامیاب نہ بنا سکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کامیاب تفتیش کنندہ وہ افسران ہوتے ہیں جو جلد باز نہ ہوں۔ تفتیش ختم کرنے سے پہلے کوئی رائے نہ قائم کریں۔ ہر بیان کی تصدیق کریں، پیچیدگی سے گھبرا نہ جائیں اور سراغ رسی مقدمہ کے وقت اپنے آپ کو بجائے تفتیش کنندہ کے مجرم سمجھ کر نوعیت جرم کے امکانات پر غور کریں اور یہ باتیں صرف وہی کر سکتے ہیں جو بجائے فرض منصبی خیال کرنے کے ایک آرٹ یا ہنر سمجھ کر اس کی جستجو میں منہمک رہتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے، چند مقدمات کا مختصر حال لکھتا ہوں۔

بنارس میں خان بہادر مولوی مقبول عالم صاحب، کراچی میں منصور عالم صاحب کے والد بڑے معزز اور قابل وکیلوں میں تھے۔ میرے بھی ان سے کافی مراسم تھے۔ دو سال پیشتر ان کے یہاں ایک ملازم کسی غیر جگہ کا آن کر رہا۔ دو چار ماہ میں جب اُن کے گھر کے حالات سے باخبر ہو گیا تو ان کے سیف کی کنجی کسی ترکیب سے حاصل کر لی اور موقع پا کر تمام زیور، نقد اور جواہرات جن کی مالیت ایک لاکھ سے زائد تھی نکال کر چلتا بنا۔ تھانے میں رپورٹ ہوئی، کئی ماہ تک کئی افسروں نے تفتیش کی، پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد سی آئی ڈی الہ آباد سے افسران بلائے گئے، وہ بھی ناکامیاب رہے لیکن مولوی صاحب گورنر یوپی کو برابر لکھتے رہے اور اس لکھنے پر کوئی نہ کوئی افسر مامور کر دیا جاتا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ جب گورنر یوپی بنارس آئے تو مولوی صاحب خود ان سے ملے اور انہوں نے خاص طور پر آئی جی یوپی کو لکھا اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کو لکھا۔ قصہ مختصر یہ کہ تفتیش میرے سپرد ہوئی۔

مولوی صاحب یہ چاہتے تھے کہ چاہے مال ملے نہ ملے لیکن مقدمہ کامیاب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد مال ملنے کی امید بھی کیا ہو سکتی تھی۔ مولوی صاحب کے بیان اور حالات سے یہ گمان تھا کہ ملزم بمبئی کا رہنے والا تھا کیونکہ اس کے پاس اکثر بمبئی ہی سے خطوط آیا کرتے تھے۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر کئی تفتیش کنندہ بمبئی جا چکے تھے لیکن بمبئی میں جہاں لاکھوں کی آبادی ہے کسی ایک نامعلوم الاسم کا پتہ چلانا کوہ کندن و کوہ برآوردن کے مصداق تھا۔ میں بھی اس کا حلیہ وغیرہ لے کر بمبئی پہنچ گیا۔

بمبئی میرے واسطے نئی جگہ تھی۔ ایک کشمیری ہوٹل میں جو اوسط درجے کا تھا، مقیم ہوا۔ صبح سے شام تک ادھر اُدھر گھومتا اور اس حلیے کے آدمی کو تلاش کرتا۔ رات کو تھک کر سو جاتا۔ یہی حال میرے ساتھ جو سپاہی تھا اس کا تھا۔ اسی سلسلہ میں اکثر وہاں کے تھانہ جات میں جا کر اور افسران سے بھی مشکل کر بات چیت کی۔ وہاں رہ کر ایک ہفتے میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بمبئی شہر کا انتظام پولیس کے لحاظ سے چار حصوں میں یعنی سیکشن اے، بی، سی، ڈی میں تقسیم ہے۔ ہر سیکشن میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس، انگریز انچارج ہے جو تھانے ہی کے ایک کمرے میں کام کرتا ہے۔

رشوت کا یہ عالم کہ چور خواہ بمبئی میں چوری کرتا یا باہر کسی شہر سے مال چرا کر لاتا، چور بازار میں جا کر اس قسم کے دلالوں سے ملتا۔ دلال ہی کے ذریعے سے خواہ زیور ہو یا جواہرات یا کپڑا ہو، مال فروخت ہوتا۔ پولیس کے تھانے میں دلال فہرست پیش کر کے یقین دلا دیتا کہ فلاں قسم کا مال فلاں کو اس قیمت میں فروخت ہوا ہے۔ سب

گئے جسے مقرر تھے۔ پولیس اور دلال نے اپنے حصے لئے
اور مجرم اپنا حصہ لے کر رفو چکر ہو گیا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا گروہ بھی چوروں کا
بمبئی میں موجود ہے جس کے ممبران ہندوستان کے مختلف
صوبوں میں جا کر خدمت گاری یا کھانا پکانے کی ملازمتیں
کرتے ہیں اور وہاں سے بڑی بڑی چوریاں کر کے بمبئی
میں مال فروخت کرتے ہیں۔

ایک روز بازار میں فٹ پاتھ پر میں کھڑا ہوا تھا۔
ایک شخص سماوار چائے کا ہاتھ میں لٹکائے چائے پلاتا ہوا
آیا۔ اس کے چہرے پر جو نظر گئی تو اس چور سے جس کی
مجھے تلاش تھی، بہت کچھ شباہت ملتی تھی۔ میں نے آواز
دے کر اس کو اپنے پاس بلایا اور چائے لے کر کھڑے
کھڑے پینے لگا۔

میں نے اُس سے نام پوچھا۔ اس نے غلام سرور
بتلایا۔

وطن پوچھا تو کہا کہ مرزا پور کا رہنے والا ہوں (جو
بنارس سے ملحق ضلع ہے)۔

جب میں نے ولدیت پوچھی تو وہ گھبرایا اور پیالی
چھوڑ کر اور سماوار لے کر تیزی سے چل دیا۔

جب میرے روکنے سے نہ رکا تو میں نے ایک
پولیس کے سپاہی سے جو بالکل قریب کھڑا تھا کہا کہ میں سی
آئی ڈی آفیسر ہوں اور یہ ملزم ہے اس کو روکو۔

میں سادہ لباس میں تھا، اس نے بلا تامل مجھ سے
کہا۔ ''مجھے بخشش کیا دو گے؟''

مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔

''تیرا نمبر نوٹ کرتا ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''سامنے
جو کمشنر پولیس کا دفتر ہے وہاں جا کر اُن کے سامنے تجھے
بخشش دوں گا''۔

تب وہ دوڑ کر گیا اور اس کو پکڑ کر لے آیا۔

میں سپاہی کو ساتھ لے کر سیکشن سی کے تھانے میں جو
قریب ہی تھا، گیا اور اس کو حوالات میں بند کر دیا۔ دو روز
تک اس سے سراغ رسی کرتا رہا۔ یہ وہ ملزم تو نہ نکلا جس کی
مجھے تلاش تھی لیکن ضلع مرزا پور میں وہ کسی اور جرم میں
مطلوب اور مفرور تھا، جو بمبئی میں رہنے والا تھا۔ چنانچہ
مرزا پور پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔

کامیابی اور ناکامی میں دونوں حالتوں میں قدرت
کی طرف سے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کو
اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ وہ اسی گھمنڈ اور غرور میں رہتا ہے
کہ یہ سب کچھ میری ہی عقل و دانش کا نتیجہ ہے لیکن میں
اپنی کامیابیوں پر ہمیشہ یہی سمجھا کرتا تھا کہ جب تک خدا کی
مدد شامل حال نہ ہو انسان کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔

جس تھانے میں مَیں اس مرزا پور والے ملزم سے
حوالات کے باہر ایک بڑے لکڑی کے صندوق پر (جس
میں ملزمان کے کپڑے وغیرہ رکھے جاتے ہیں) بیٹھ کر
بات چیت کر رہا تھا ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی پہرے پر کھڑا
تھا۔ وہ میری اور ملزم کی گفتگو سن رہا تھا۔ جب گفتگو ختم ہوئی
تو اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

میں نے بتلایا۔ ''خورجہ کا''۔

یہ سن کر خوش ہوا اور کہنے لگا۔ ''میں ضلع میرٹھ کا
رہنے والا ہوں۔ اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ میری گفتگو
کسی پر ظاہر نہ ہو گی تو میں شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں''۔

میں نے وعدہ کیا۔

''یہ ملزم آپ کے مقدمے کا نہیں ہے''۔ تب اس
نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا۔ ''اس ملزم کو جو بنارس سے
مال لایا تھا میں نے دیکھا ہے بلکہ چند گھنٹے اسی حوالات
میں وہ بھی بند رہا ہے''۔

یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے کہا کہ اس کے
تفصیلی حالات مجھے بتلاؤ۔

اس نے کہا۔ ''ڈیوٹی ختم کر کے تھانہ کے باہر آپ

سے بات چیت کروں گا''۔
ڈیوٹی ختم ہوئی اور میں اس کو ایک قریب کے ہوٹل میں لے گیا۔ پیشگی دس روپے کا نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

اس نے اس مقدمے کے حالات یہ بتلائے کہ بہت عرصہ ہوا، مال اور ملزم کو لے کر ایک پارسی بوڑھا شرابی دلال تھانے میں آیا تھا۔ چونکہ یہ اطمینان نہ تھا کہ اس نے کل مال صحیح طور پر بتلا دیا ہے، دھمکانے کے لئے اس کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس جو انگریز تھا، نے اس کا بیان بھی فرضی طور پر لکھا اور اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا۔ جو رقم پولیس کے حصے میں آئی تھی اس میں حسب معمول انسپکٹر، سب انسپکٹر اور ملازمانِ تھانہ سب شریک تھے۔ سنا ہے کہ اور افسران اتر پردیش بھی اس مقدمے کے سلسلے میں مختلف تھانوں میں آتے رہے۔ ڈیڑھ سال کے بعد ملزم یا مال ملنا تو قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ ملزم نے اپنا نام مقبول عالم بتلایا تھا اور آپ کہتے ہیں کہ مقبول عالم مدعی کا نام ہے۔ اسی طرح اس نے اپنی ولدیت، قومیت، سکونت سب ہی غلط بتلائی ہوگی اور اس کا کیا یقین ہے کہ وہ بمبئی کا رہنے والا ہے۔ ممکن ہے کہ بمبئی میں کچھ مدت رہا ہو اور یہاں کے کسی گروہ سے اس کا تعلق ہو۔

''شرابی دلال کہاں پر رہتا ہے؟'' میں نے سپاہی سے پوچھا۔

اس نے وہ جگہ لے جا کر بتلا دی، اس فلیٹ کے لوگوں سے نام بھی معلوم کر لیا اور چلا گیا۔ دلال کہیں باہر گیا ہوا تھا، میں اس کا منتظر رہا۔ چار بجے شام کے قریب وہ آیا میں نے اس سے ملاقات کی۔ یہ شخص پارسی تھا (نام یاد نہیں ہے) عمر اندازاً پچاس ساٹھ سال کے درمیان ہوگی لیکن شراب نے اس کی صحت کو خراب کر دیا تھا۔ مونچھیں بڑی اور بالوں کی سفیدی کو کثرت سگریٹ نوشی نے سرخی مائل کر دیا تھا۔ لاغر اندام سی کمر قدرے جھکی ہوئی، پتلون کے پائینچے اتنے نیچے تھے کہ جوتے کی ایڑھی سے لٹ گئے تھے۔

میں اُس سے اسی مقدمے کے سلسلے میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اپنے ساتھ اپالو بندر لے گیا۔ کچھ روپے شراب پینے کے واسطے دیئے۔ جب اس کی طبیعت پر رنگ چڑھا تو اس نے سوچ سوچ کر حالات بتلائے جو سپاہی کے بیان کے مطابق تھے۔

''میں نہ ملزم کو جانتا ہوں اور نہ یہ بتلا سکتا ہوں کہ زیور اور جواہرات کس کو فروخت کئے تھے''۔ اس نے کہا۔ ''البتہ ملزم کے پاس کچھ پرامیسری نوٹ تھے جن پر اس نے اپنا نام لکھ کر ایک سیٹھ کو مقبول عالم کے نام سے چوتھائی قیمت پر فروخت کر دیئے تھے''۔

میں نے کہا۔ ''سیٹھ کو بتلاؤ''۔

وہ مجھے اس کے مکان پر لے گیا۔

یہ شخص لاکھوں روپے کی تجارت کرتا تھا، میں نے خیال کیا کہ میں تو از رُوئے قاعدہ تلاشی لے بھی نہیں سکتا۔ اگر بمبئی پولیس کی مدد لوں تو یہاں رشوت کا بازار گرم ہے۔ یہ مالدار آدمی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ کمشنر پولیس سے مل کر جملہ واقعات ان کو بتلا کر مشورہ لوں۔

میں اپنے ہوٹل کو واپس آ گیا۔

دوسرے روز دس بجے ان کے دفتر میں پہنچا۔ وہ عمارت ایسی شاندار تھی کہ گویا کسی گورنر کا دفتر ہے۔

میں نے کارڈ بھیجا، طلبی ہوئی۔

پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

میں نے ازابتدا تا انتہا چوری اور سابقہ تفتیشوں کے حالات نیز سپاہی اور دلال کی اطلاعات سب بیان کئے اور یہ درخواست کی کہ سپاہی چونکہ مخبر ہے اس کا نام ظاہر نہ کیا جائے جس کا انہوں نے وعدہ کیا۔

پولیس کمشنر کم عمر اور ولایت کے معزز خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔ ذہین اس بلا کا کہ بات شروع کی اور اس کی

تہہ کو پہنچ گیا۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ غصہ ور بھی ہے اور منصف مزاج بھی۔ انگریز اور ہندوستانی میں انصاف کے وقت کوئی فرق نہیں کرتا۔

''بمبئی میں کیا کیا دیکھا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''جہاز یا کشتی میں سوار ہو کر سمندر کی سیر کی؟''

میں انگریزوں کی خو بو سے واقف تھا اور یہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اس کی اس گفتگو کے صرف یہی معنی ہیں کہ وہ اس دوران گفتگو میں یہ سوچ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

وہ کرسی پر سے کھڑا ہو گیا، مجھے اپنے ساتھ لیا اور کار میں سوار ہو کر پہلے سیکشن سی تھانے میں پہنچا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے جو انگریز تھا، پوچھا کہ مقبول عالم کی چوری کے مقدمے کے بارے میں تمہیں کچھ علم ہے؟

اس نے انکار کیا۔

تب اس کی میز کی دراز کھینچ کر باہر نکالی۔ اس میں پنسل سے لکھے ہوئے بہت سے سفید کاغذ بطور ردی پڑے ہوئے تھے۔ بیٹھ کر ایک ایک کو پڑھ کر زمین پر ڈالتا گیا۔ یہ سب سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ پر مقبول عالم کا نام دیکھا، وہ صرف آدھا صفحہ لکھا ہوا تھا اور آدھا سادہ تھا۔

''یہ شخص کس مقدمے سے تعلق رکھتا ہے؟'' اس نے ایس پی سے پوچھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ ''عرصے کا معاملہ ہے مجھے یاد نہیں''۔

تب اس نے تھانے والوں سے کہا۔ ''تم رجسٹر دیکھ کر بتلاؤ کہ اس نام کا کبھی کوئی شخص آیا تھا اور وہ کس سلسلے سے متعلق تھا؟''

انہوں نے اِدھر اُدھر رجسٹروں کی ورق گردانی کر کے نفی میں جواب دے دیا۔

چہرہ اس کا غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس کاغذ کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھا اور مجھے ساتھ لے کر سپرنٹنڈنٹ بی سیکشن کے تھانے میں گیا جو ایک غیر علاقہ تھا اور سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ آپ خود جا کر اس افسر کی نشاندہی پر سیٹھ کی تلاشی لیں اور اگر کوئی چیز مل جائے تو اس کو گرفتار کر کے بجائے اس حلقے کے جس میں سیٹھ کا مکان ہے اپنے تھانے میں حراست میں رکھیں اور مال کو احتیاط سے سربمہر کر کے سیف میں مقفل کیا جائے جس کی چابی کسی دوسرے کو نہ دی جائے۔

پھر مسکرا کر مجھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے نا؟''

میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ چلا گیا۔

ہم لوگ سیٹھ کے مکان پر پہنچے۔ تلاشی میں دو عدد پرامیسری نوٹ برآمد ہو گئے جن پر مولوی مقبول عالم صاحب وکیل بنارس کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں مال اور ملزم بمبئی پولیس کے سپرد کر کے اور رسید لے کر بنارس پہنچ گیا۔ مقبول عالم صاحب اور حکامِ ضلع بہت خوش ہوئے۔

مقدمہ زیر دفعہ 411 تعزیرات ہند (داشتن مال مسروقہ) دونوں مقام پر ہو سکتا ہے۔ بمبئی کے سالیسٹروں اور بیرسٹروں نے بہت زور لگایا کہ مقدمہ بمبئی میں ہو لیکن گورنمنٹ نہ مانی اور ملزم بنارس بھیج دیا گیا جہاں عدالتی تحقیقات ہو کر دو سال کی سزا ہو گئی۔

کچھ عرصے کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس بمبئی سیکشن سی بھی برخاست کر دیا گیا۔

انارکسٹوں نے گمنام خطوط اور دیگر ذرائع سے مجھے اکثر مار ڈالنے کی دھمکیاں دیں لیکن میں نے اس طرف توجہ نہ کی اور سی آئی ڈی کے کام میں مشغول رہا۔

◆◆◆

مجھے ایک اور دلچسپ مقدمہ دیا گیا جس کی تفتیش میں بنارس، الہ آباد اور کلکتہ کی پولیس ناکام رہی تھی۔ وہ جرم یہ تھا کہ بنارس کے ایک سیٹھ کے نام مرکنٹائل بنک کلکتہ سے رجسٹرڈ انشورڈ لفافے میں ایک ہزار روپے کے نوٹ روانہ کئے گئے۔ جب سیٹھ نے بنارس میں بذریعہ

ڈاک خانہ وہ لفافہ وصول کیا اور کھولا تو اس میں سے بجائے نوٹوں کے پوسٹل گائیڈ (کتاب) کے بے ترتیب پھاڑے ہوئے صفحے ٹھیک نوٹوں کے وزن کے برآمد ہوئے۔

تجارتی لوگ اس قسم کے لفافوں کو کھولنے میں احتیاط کرتے ہیں، بجائے کاغذت پھاڑنے کے قینچی سے لاکھ کی مہر پر لگا ہوا ڈورا کاٹ دیتے ہیں جس سے نوٹ اور لفافہ نتھی ہوتے ہیں اور چوڑائی لفافہ کے ایک طرف کے حصے کو قینچی سے باریک کاٹ کر نکال لیتے ہیں۔ اس ترتیب سے لفافے کی مہریں جو لاکھ سے تین مقامات پر لگائی جاتی ہیں خراب نہیں ہوتیں چنانچہ یہ احتیاط اس تفتیش میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

بنارس پولیس تفتیش سے اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ سیٹھ کی شرارت ہے اور دعویٰ جھوٹا ہے۔ کلکتہ سی آئی ڈی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ جرم ریلوے میل سروس میں کسی سائنٹفک ترکیب سے لفافے کو کھول کر کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں قرین قیاس نہ تھیں۔ اس طرح دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوگئی۔

لفافے پر جو دستخط تھے وہ انگریز اسسٹنٹ منیجر کے تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ لفافے میں اسی نے نوٹ رکھے۔ اسی نے تول کر لفافے پر وزن لکھا اور اسی نے اپنی موجودگی اور نگرانی میں لاکھ کی مہریں لگوائیں جو بدستور موجود تھیں۔ کوئی مہر کسی مقام سے ٹوٹی پھوٹی نہ تھی اور نہ لفافہ کسی دوسرے مقام یا دوسری ترکیب سے کھولا گیا تھا۔

میں لفافے کو لے کر مرکنٹائل بنک کلکتہ پہنچا اور انگریز اسسٹنٹ منیجر کا بیان لیا۔ اس نے وہی بیان دیا جو اس سے قبل سی آئی ڈی کلکتہ کے انگریز افسر اور بنارس کے پولیس افسر کو دے چکا تھا جس میں اپنے دستخطوں اور لفافے کو معہ نوٹوں کے بند کرنے، وزن کرنے سب کو تسلیم کیا تھا۔ پولیس کے تفتیش کنندہ بجائے معاملے کی تہہ میں پہنچنے کے ایک بڑے انگریز افسر کے بیان کو تسلیم کر کے

تفتیش کو قیاس آرائیوں پر ختم کر دیتے تھے۔

تمام دنیا کے مجرمان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تک وہ قائل اور لاجواب نہیں ہو جاتے جرم سے انکار ہی کرتے رہتے ہیں۔ ملزم کے ساتھ سختی کرنا یا اس کو زدوکوب کرنا میرے اصول کے خلاف تھا۔ میں نے اس کی میز پر سے بنک کی مہر اٹھا کر اور سادہ کاغذ پر لاکھ سے کئی جگہ لگا کر لفافے کی مہر کو میگنی فائنگ گلاس سے اس طرح بغور میلان کیا جس طرح نشان انگشت میلان کئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لفافے کی مہروں کے حروف اور مہر کی گولائی تقریباً یکساں تھی لیکن لفافے والی مہر کے Bank کے حروف میں حرف N میں فرق تھا۔ مہر کا N ایک طرف سے سیدھا تھا اور لفافے کا N ایک طرف سے قدرے ٹیڑھا تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ لفافے کی مہر کوئی دوسری تھی۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ لفافہ راستے میں تبدیل کیا گیا تو اس انگریز کے دستخط کیسے بنا لئے گئے اور ڈاک خانے اور ریلوے میل سروس والوں کو اتنا وقت کیسے مل گیا۔ کیونکہ بنک سے لفافہ ڈاک خانے میں گیا۔ پہلی ڈاک سے ریلوے میل سروس میں تھیلے کو سربمہر کر کے دیا گیا۔ تھیلا بنارس کے ڈاک خانے میں صحیح حالت پہنچا اور بلاکسی قسم کے توقف کے پوسٹ مین کے حوالے کر دیا گیا جس نے وقت کے اندر اس کو سیٹھ کے حوالے کر دیا۔

جب اس معاملے کو میں نے اسسٹنٹ منیجر کو سمجھا کر اس کی رائے پوچھی تو اس نے اپنے دونوں شانے اچکا کر (جیسا انگریزوں کا قاعدہ ہے) کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ترکیب سے کسی چور نے لفافے سے نوٹ نکال کر مہر کو گرمی پہنچا کر اپنی بنائی ہوئی مہر اس پر لگا دی ہے جس کا نہ میں ذمہ دار ہوں اور نہ بنک ذمہ دار ہے۔

میں نے ہنس کر کہا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کام کسی شاطر اور دلیر چور ہی کا ہے لیکن یہ امکانات جو آپ نے بتلائے ہیں ان پر طبیعت نہیں جمتی۔ اس نے یہ سن کر پھر مونڈھے اچھالے۔

میں نے بنک منیجر (انگریز) کے کمرے میں جا کر ٹیلی فون کیا اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی سے ایک یورپین افسر کی درخواست کی اور وہ آ گیا۔

اس کے بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر کے کمرے کی تلاشی لی۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ یعنی لفافے والی مہر جس کا N ٹیڑھا تھا، وہ اسی کی میز کی ایک دوسری دراز میں سے برآمد ہو گئی۔ یہ اس بنک کی ایک پرانی لکڑی کا دستہ ٹوٹی ہوئی بے کار مہر تھی جس کو وہ پولیس کو دھوکہ دینے کے واسطے اس کام میں لایا کرتا تھا اور ایک بڑے لکڑی کے بکس میں جہاں ردی چیزیں ڈال دی جایا کرتی تھیں کتاب پوسٹل گائیڈ برآمد ہوئی جس میں وہی صفحات غائب تھے جو لفافے میں سے برآمد ہوئے تھے۔ معاملہ صاف تھا۔

میں نے منیجر بنک کو جو معمر آدمی تھا بلا کر یہ سب باتیں بتلائیں اور انگریز سی آئی ڈی آفیسر کو تحریر لکھ دی کہ اسسٹنٹ منیجر کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ حراست میں لے لیا گیا۔

اس کے بعد میں نے چپڑاسی کو بلایا اور علیحدہ لے جا کر بات چیت کی۔ اس نے صاحب کا نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھنا اور کتاب کے کاغذوں کا وزن کر کے لفافے میں بند کرنا، اس رازداری کے سلسلے میں صاحب کا اس کو انعام دینا، صاحب کا ایک مس صاحبہ کو بڑے دن کے زمانے میں سمندر پر لے جا کر گل چھرے اڑانا، بلاکم و کاست سب ظاہر کر دیا۔

دوسرے روز صاحب نے جرم کا اقبال کر لیا اور میں تیسرے روز بنارس واپس آ گیا۔ بعدازاں سنا تھا کہ اس کو سزا ہو گئی تھی۔

***

یگانہ بیگانہ

ہندوستان کی جدید کہانیوں میں سے ایک اچھوتی اور حساس کہانی

☆ رسیک مہتا/علی حیدر ملک

آسمان بادلوں سے گھر گیا تھا۔ برسات کا موسم تو کب کا شروع ہو چکا تھا لیکن ہمارے ہاں بارش دیر سے شروع ہوتی ہے، تقریباً جولائی کے وسط میں، وہ دن بھی آ گئے ہیں، آج صبح سے گرمی کی کوئی حد نہیں ہے اور اس پر بادلوں سے گھرا آسمان، میری طرح چھپرا کو بھی یہ اندیشہ ہوا کہ یقیناً ابھی بارش شروع ہو جائے گی، اسی لئے آواز دے کر اس نے کہا۔ ''کھانا کھا کر جلدی آفس پہنچ جایئے، بارش ہو گئی تو بھیگتے ہوئے جانا پڑے گا۔''

میں دو لقمے جیسے تیسے کھا کر جلدی سے زینے اتر گیا لیکن دروازے کے پاس آتے ہی میری رفتار رک گئی۔ گھر کے چبوترے کے پاس لوگوں کا ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سبھی گھیرا ڈال کر کھڑے تھے، میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا ہے؟''

چوٹی کی گرہ باندھتے اور بار بار سنبھالتے ہوئے شیو شنکر نے جواب دیا۔ ''اور کیا ہوگا آج کے زمانے میں؟''

''لیکن ہے کیا؟''

''کوئی اپنا پاپ چھوڑ گئی ہے چبوترے پر''۔ پھر وہ فوراً بھیڑ میں اپنا سر لے جاتے ہوئے بولا۔ ''ہرے ہرے ہرے ہرے، سچ مچ کل جگ آ گیا ہے''۔

جیسے کل جگ چھوڑ کر اور کسی زمانے میں حرامی بچے پیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ آفس جانے کی جلدی بھول کر میں نے بھی گردن اوپر کی، دیکھا تو چبوترے پر بیچوں بیچ سفید پوٹلی کی طرح کچھ پڑا ہوا ہے، قریب کھڑی ہوئی منو نے جگہ بنا دی تاکہ میں گھیرے میں جا سکوں، اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ ''دیکھو تو سہی تارک بھائی کیسا اچھا ہے، ہے نا؟''

بچہ اسے نہ جانے کیوں اچھا لگا حالانکہ نومولود خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے میں رانی ماں نے گہری نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد اپنے تجربے کا ثبوت فراہم کیا۔ ''ابھی کا نہیں ہے۔ کوئی بیس پچیس دنوں کا لگتا ہے بلکہ ایک ماہ کا بھی ہو سکتا ہے۔'' مجمع میں سے کسی نے رانی ماں کے قیاس پر چٹکی لی۔

''رانی ماں! تم اکیلی ہو، لے جاؤ نا اس بچے کو......''

''نہیں رے بھیا! پرایا پاپ سنبھال کر میں جھمیلے میں کیوں پڑوں؟'' وہ اس ڈر سے پیچھے ہٹ گئی کہ شاید سچ مچ اس پر بچہ سنبھالنے کا بوجھ آ پڑے۔

''لیکن پھر اب اس کا کیا کیا جائے؟''

پھر سے چوٹی سنوارتے ہوئے شیو شنکر بولا۔ ''ابھی پولیس آئے گی اور اسے لے جا کر کسی یتیم خانے میں چھوڑ دے گی۔ ہمیں کیا؟''

''لیکن پولیس کو کوئی خبر تو کرے، آج بادل بھی کیسے گھرے ہوئے ہیں، اگر بارش آ دھمکی تو...... بیچارا!''

''ہاں بیچارا......؟'' اور میری نظریں بھی ایک ٹک اسی بیچارے پر ٹھہر گئی تھیں۔

بھورے بھورے نرم بالوں والا چھوٹا سا سر، گندھے ہوئے کچے میدے کی طرح نرم، اور ٹمٹماتی ہوئی دو گول آنکھیں۔

جھک جھک کر دیکھتے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا سایہ ان آنکھوں پر پڑتا تو دونوں آنکھیں کھل جاتیں لیکن سایہ ہٹ جانے پر آسمان کی روشنی برداشت نہ ہو سکنے کے باعث فوراً مند جاتیں۔ میں نے بھی ایک آدھ بار جھک کر اسے ٹھیک سے دیکھ لیا۔ سفید چادر کی ایک مضبوط گٹھڑی تھی، منہ چھوڑ کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو تین موٹے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ کر اسے رکھا گیا ہے اور حیرت تو اس بات پر تھی کہ بچہ روتا بھی نہیں۔

اوپری منزل سے آئی ہوئی رتن کاکی نے بھی اس کے چھوٹے سے منہ پر جھک جھک کر ناک نقشے کا تجزیہ کرنے کے بعد اظہار خیال کیا۔ "معلوم ہوتا ہے، ماں نے خوب دودھ پلا کر رکھا ہے، دیکھو نا! کب سے پڑا ہے لیکن کہیں رونے کا نام لیتا ہے؟" پھر لوٹتے ہوئے اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ "میں دودھ میں روئی بھگو کر لے آؤں، منہ میں رکھے تو سہی، بیچارا بھوکا ہوگا"۔

وہ اوپر چلی گئی۔ میری نگاہ بھی اوپر گئی۔ چھپرا ہاتھ پر ٹھوڑی ٹیکے کھڑکی میں کھڑی تھی۔

اتنی اونچائی سے بھی، اس کی پیاسی آنکھیں ایک ٹک ہو کر بچے پر ٹھہری ہوئی تھیں، اس کے اداس چہرے پر اداسی کے ساتھ ساتھ ہمدردی کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ اچانک میری طرف دھیان آنے پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ابھی یہیں کھڑے ہیں، دیر نہیں ہو رہی؟"

مجھے ہوش آیا، گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ جلدی سے لفٹ رائٹ کرتا ہوا مشکل سے بیس منٹ میں آفس پہنچا۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی چپڑاسی نے کہا۔ "صاحب آپ کو بلا رہے ہیں"۔

میں حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرنے سے پہلے ہی جلدی سے اوپر انتونی صاحب کے کیبن میں داخل ہوا۔ انتونی صاحب محکمہ آب پاشی کے چیف انجینئر تھے، گزشتہ دس برسوں سے میں ان کے ماتحت اوورسیئر کا کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے سے نوکری شروع کی تھی، اب تنخواہ بھی تین سو روپے ہو گئی تھی، زیادہ تر باہر کے ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ اس لئے آفس اٹینڈ کرنا بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ صاحب کا بھی دوسروں کی بہ نسبت میرے ساتھ بہتر سلوک تھا۔ اس لئے ذمے داری والے خاص کام مجھی کو سپرد کئے جاتے تھے، آج بھی ایسا ہی کوئی خاص کام ہوگا۔ یہ سوچ کر میں چپ چاپ ٹیبل کے قریب کھڑا رہا۔ صاحب فائل دیکھ رہے تھے۔ کسی کاغذ کی تلاش تھی، فائل دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "بیٹھو"۔ کچھ دیر بعد کاغذ مل جانے پر انہوں نے باہر نکالا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے ہمیں نانگول کے لوگوں کی طرف سے موصول ہونے والی درخواست کی بات تو ہم بھول ہی گئے"۔

ان کے ہاتھ میں وہی درخواست تھی، کچھ جھجک محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "ہاں، لیکن اسے تو ایک برس بیت گیا"۔

صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ "ہاں، لیکن ایک سال میں بھی تو جانچ کرنا ہماری ڈیوٹی ہے یا نہیں؟" اتنا کہہ کر انہوں نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

بات یہ تھی کہ ایک آدھ سال پہلے نانگول کے پاس ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ تالاب بن جانے کے بعد گاؤں کے لوگوں کی طرف سے درخواست آئی کہ تالاب کے تعمیری کام میں ٹھیکے دار نے گڑبڑ کی ہے اور سیمنٹ اور لوہے کی چھڑوں کی بجائے بنیاد میں مٹی بھری دی ہے اس لئے بارش ہونے پر اگر بند ٹوٹ گیا تو گاؤں پر آفت آ جائے گی۔

یہ درخواست موصول ہونے کے بعد بند کا معائنہ کرنے کے لئے صاحب نے مجھے نانگول بھیجا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں وہاں جا کر معائنہ کروں، برسات شروع ہو گئی۔ تالاب چھلکنے سے پہلے ہی بند ٹوٹ گیا۔ بند ٹوٹنے سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا تھا کہ تعمیر کا کام ٹھیک سے نہیں ہوا پھر بھی ٹھیکے دار نے اپنی مدافعت میں کہا۔

"یہ تعمیر کا کام چل رہا تھا کہ اسی وقت بارش ہو جانے سے بند ٹوٹ گیا۔ ویسے بنیاد میں تو انگریمنٹ کے مطابق سیمنٹ اور لوہے کی چھڑیں کافی بھری گئی ہیں"۔

اس وقت ٹوٹے ہوئے بند کی بنیاد پر تقریباً پچاس فٹ پانی تھا۔ اس لئے معائنہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ آخر یہ

طے پایا کہ پانی سوکھنے پر معائنہ کیا جائے، پانی تو کب کا سوکھ چکا ہوگا لیکن معائنے کی بات بھلائی جا چکی تھی، آج اچانک صاحب کو وہ بات یاد آ گئی تھی، وہ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”سالا! کسی نے یاد بھی نہیں کیا۔ بارش تو آج کل میں ہونی چاہئے“۔

میں نے کہا۔ ”ہاں شاید آج ہی ہو گی“۔ انٹونی صاحب ایک دم چٹکی بجا کر بولے۔

”تم ابھی ناگول جاؤ، ضرورت ہو تو کچھ لوگوں کو مدد کے لئے لیتے جاؤ اس سے پہلے کہ پھر سے بارش ہو اور بند ڈوب جائے، معائنے کی پوری رپورٹ حاضر ہونی چاہئے“۔

میں نے چونک کر کہا۔ ”لیکن صاحب! آج ہی بارش ہو گئی تو؟“

”بارش ہوتے ہی تالاب نہیں بھر جائے گا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دو تین روز بارش نہ ہو اگر ایسا ہوا تو معائنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی“۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، میں ابھی گھر جا کر بیگ لے آتا ہوں“۔

صاحب سر ہلا کر بول اٹھے۔ ”نہیں نہیں تمہیں گھر جانے کی ضرورت نہیں، ایک ایک منٹ قیمتی ہے، یہاں سے جیپ لے کر سیدھے بند کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہارے گھر آدمی بھیج رہا ہوں، وہ دوسری گاڑی سے تمہارا سامان لے کر تمہیں بند پر دے آئے گا“۔ اور ہنستے ہنستے کہنے لگے۔ ”وہاں پہنچتے ہی آج آپ کو کپڑے وغیرہ کی ضرورت تھوڑی پڑے گی؟“

زیادہ حجت کی گنجائش نہیں تھی، اسی وقت میں کچھ لوگوں کو لے کر بند کے لئے روانہ ہو گیا۔ صبح سے گھر گھر آنے والے بادل دوپہر تک برسے بغیر ہی بکھر گئے تھے، شام کو تو ہوا بھی ایسی چلی کہ فوراً بارش ہونے کا امکان ختم ہو گیا، لگتا ایسا ہی تھا۔

میں نے ساتھیوں کو ہدایت دی۔ ”گاؤں سے مزدوروں کو بلوا کر بنیاد کھدوانے کا کام شروع کراؤ“۔

کچھ ہی دیر میں کام شروع ہو گیا۔ میں نے مزدوروں کو دگنی مزدوری دینے کا لالچ دے کر رات کو بھی کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ویسے تو کام کی جگہ مجھے موجود رہنا چاہئے تھا لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، چین نہیں پڑتا تھا اس لئے معاون کو دیکھ بھال کا کام سونپ کر میں تالاب کے کنارے چلا گیا۔ ڈھلتی ہوئی شام کے دھندلکے میں سوکھا ویران تالاب کھانے کو دوڑتا تھا۔ کنارے پر جا کر میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی پھر ٹھیکیدار کے نوکروں کے لئے بنائے جانے والی پترے کی جھونپڑی میں جا کر ایک بوری پر لیٹ گیا۔

رہ رہ کر نوازئیدہ بچے کا وہی بن کھلے پھول جیسا چہرہ نظروں کے سامنے تیر رہا ہے اور چھپرا کی آنکھوں کی بے چین پیاس، شادی کو سات برس بیت گئے تھے اور چھپرا کو بچہ نہیں ہوا تھا اور اب ہونے کی امید بھی نہیں رہی تھی، پوری جانچ کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا۔ ”رحم کا منہ چھوٹا ہے اگر آپریشن سے اسے چوڑا کیا جائے تو حمل کا امکان ہے لیکن ولادت کے وقت خطرہ ہوسکتا ہے، شاید پیٹ چیر کر بچہ نکالنا پڑے اور ایسے میں زچہ کے لئے جان کا خطرہ ہے۔ بہت مشکل سے چھپرا کو سمجھا بجھا کر آپریشن کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے چھپرا کی اولاد کی تمنا خاموشی کے پنجرے میں قید ہو گئی، اس کی بے چین ممتا محبت آمیز زوجیت میں تبدیل ہو گئی، اور اب تو ان دونوں عناصر کے درمیان خط تقسیم کھینچنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ مجھ پر مرکوز کر دی۔ وہ میری دیکھ بھال بں اس طرح کر رہی ہے جیسے میں اس کا شوہر نہیں، بچہ ہوں، اس نے میرے ساتھ بیوی کی محبت سے زیادہ ماں کی شفقت کا سلوک شروع کر دیا ہے ایسا

لگتا ہے جیسے وہ کچھ کھو کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہی بات کبھی کبھی مجھے تکلیف پہنچاتی ہے، ایک بچہ اس کے ہاتھوں میں سونپ دوں، کئی بار یہ خیال بھی آیا کہ یتیم خانے سے ایک صحت مند خوبصورت بچہ لا کر......

ایک بار تو ڈرتے ڈرتے میں نے چھپرا سے یہ بات کہہ بھی دی لیکن ذرا بھی خفا ہوئے بغیر اس طرح ہنس کر جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہو، اس نے جواب دیا۔ ''واہ، پرائے بھی اپنے ہو سکتے ہیں؟ میری بات اور ہے، چاہے جو کچھ ہو لیکن میں عورت ہوں، گود میں بچہ دیکھ کر ماتما بیدار ہوئے بغیر نہیں رہے گی لیکن آپ؟ خون کے رشتے کے بغیر آپ کی شفقت اس کی طرف کیسے ملتفت ہو گی؟'' بات بھی صحیح تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ خیال ترک کر دیا پھر اس طرح کا خیال کبھی نہیں آیا۔ کبھی بھول کر بھی میں نے چھپرا کو اندرونی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن نہ جانے کیوں آج ایک بے سہارا بچہ دیکھ کر اور اس کا چہرہ تکتی ہوئی چھپرا کی ان پیاسی نظروں سے ڈھلنے والی خاموش آواز سن کر......

آفس جاتے وقت راستے میں بھی مجھے یہی خیال آ رہا تھا کہ ایک بار لوٹ کر چھپرا سے کہہ دوں۔ ''پر ماتما نے تیری خالی گود بھرنے کے لئے گھر بیٹھے ہی......'' لیکن ہمت نہ ہوئی۔ شاید چھپرا اسے اپنی توہین سمجھ لے، شاید ماتما سے ماری عورت کی زندگی بے کار سمجھ کر......

فطرتاً وہ جتنی شفیق ہے اتنی ہی غصہ ور بھی، اگر کوئی غلط فہمی نکال لے تو کیا ہوگا؟ اسی تصور سے میں کانپ گیا۔ اس وقت بھی اسی خوف کے مارے میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ ''پولیس آ کر اسے اٹھا لے گئی ہو تو اچھا ہے''۔

آسمان سے اندھیرا اتر رہا ہے، کنارے کی ٹیکری کے نیچے والی سڑک سے ٹرک کے ہارن کی آواز آئی، باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو سب سامان لے کر ٹرک آ پہنچا ہے، یہاں کھانے کا انتظام ممکن نہیں تھا اس لئے آفس کی طرف سے تیار ٹفن آ چکے تھے، ساتھ ہی چائے پانی کا سامان بھی تھا۔ دو تین پٹرومیکس اور میرا بیگ بستر بھی آ گیا تھا۔

ٹیکری پر آ کر ایک شخص بیگ بستر رکھ گیا۔ کچھ دیر بعد نیچے جا کر میں نے پٹرومیکس کی روشنی میں، جاری کام پر نظر ڈالی۔ پھر انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وہیں کھانا کھایا اور ایک نوکر سے کہا۔ ''ایک آدھ گھنٹے بعد چائے بنا کر اوپر دے جانا''۔

نیند آنے لگی لیکن رات بھر جاگنا ضروری تھا۔ پھر بھی کچھ دیر لیٹنے کے خیال سے میں نے بستر کھول لیا۔ بستر کھولتے ہی اوپر رکھی ہوئی نئی شال کا قرمزی رنگ آنکھیں چکا چوند کر گیا۔ بیوی کو شوہر کی خدمت کا کتنا خیال ہے؟ گرمی میں شال کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن شاید بارش ہو جائے، ٹھنڈک لگے اور......

▲

پچھلے برس بھی میں تقریباً انہی دنوں میں یہاں آیا تھا اور میرے علم کے بغیر ہی چھپرا نے بستر میں شال رکھ دی تھی، وہ شال جس کے کنارے پر چھپرا نے خود بیل بوٹے کی ہفت رنگی کشیدہ کاری کی تھی اور وہ شال میں نے کھو دی تھی، پھر چھپرا نے نئی شال خریدی اور اس کے کنارے پر بھی ویسی ہی کشیدہ کاری شروع کی مگر یہ کشیدہ کاری ادھوری تھی، صرف سرے پر تھوڑی سی جگہ میں کشیدہ کاری ہو پائی تھی مگر اس کے ساتوں رنگ میرے سامنے ہنس رہے تھے، گھمبیر تاریکی دھیرے دھیرے، ایک کے بعد ایک سب کچھ نگاہوں میں تیر رہا تھا۔ تقریباً یہی دن تھے ٹھیکے وار کے خلاف نانگول کے لوگوں کی شکایتی درخواست...... خود معائنہ کرنے کے لئے انتونی صاحب کی ہدایت...... وہ گھمبیر اندھیری رات، اچانک ہونے

والی بارش...... اوپری حصے میں بارش ذرا پہلے شروع ہوئی ہوگی، اس لئے جو ندی تالاب میں موڑی گئی تھی، اس ندی میں اچانک سیلاب آ گیا۔ کھدائی کے لئے آئے ہوئے مزدور کدال پھاوڑے لئے جان بچا کر بھاگے، صرف میں تنہا رہ گیا۔ میں اس طرف تھا۔ اسی ٹیکری پر اور اب اُس پار نہیں جا سکتا تھا، یہ جگہ بھی محفوظ نہیں تھی، ہر لمحے پانی بڑھ رہا تھا اور ٹیکری کے دھنسنے یا ڈوب جانے کا قوی امکان تھا۔ اگر ٹیکری کے آس پاس پانی پھیل جائے تو کہیں بھی نہیں جایا جا سکتا۔ بڑی دیر تک بھیگتے رہنے سے میں یہیں ٹھٹھر گیا تھا لیکن آخر ٹیکری چھوڑ کر کسی محفوظ مقام تک جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

بارش کے ساتھ ساتھ سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی اتنی ہی قاتل تھی، میں نے بستر سے شال نکال کر جسم پر لپیٹ لی۔ پھر بقیہ سامان وہیں چھوڑ کر ٹیکری کے دوسرے کنارے اتر پڑا۔ زوروں سے برستی ہوئی بارش میں بھیگتا، ہوا کی تیز سی سنسناہٹ میں تھر تھر کانپتا، میں گھٹنوں تک پانی میں آگے بڑھا۔ پیروں تلے، پانی میں ڈوبے کھیتوں کی پھولی ہوئی مٹی والی چکنی زمین تھی، اور اوپر گھنگھور آسمان۔ بیوہ کے لباس کی طرح سیاہ بادلوں کے گھٹاٹوپ اجتماع نے سب کچھ تاریک کر دیا تھا۔ نانگول گاؤں اور راستہ کس طرف چھوٹ گیا ہے۔ اس کا مجھے خیال نہ تھا، میں آنکھیں موندے، لڑکھڑاتے قدموں سے نہ جانے کب تک چلتا رہا؟ ایک آدھ گھنٹے بعد پیر پانی سے بہ مشکل باہر نکلے، فضا میں بار بار چمکتی ہوئی بجلی کی لمحاتی مگر تیز روشنی میں مَیں نے اتنا تو دیکھ لیا کہ زمین گیلی ہونے کے باوجود پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی، بارش کم ہو گئی تھی، بے ہوش ہو کر گر پڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں تھی کہ پانی سے باہر آ جانے کے باعث مجھ میں ہمت پیدا ہوئی۔

چہرے سے پانی پونچھ کر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، دور کچھ اونچائی پر ایک مدھم چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ بارش کی دھار چیر کر میری بے چین آنکھوں نے اس کی روشنی پکڑ لی۔ زیادہ غور و فکر کئے بغیر میں مٹھیاں باندھ کر اس سمت میں دوڑا۔

سطح زمین سے کچھ اونچائی پر وہ بھی ٹیکری جیسی ہی جگہ تھی، بلندی پر چڑھتے ہوئے سانس پھول گئی۔ ناک تک آ جانے والے دم کے صرف باہر نکلنے کی دیر تھی کہ مجھے خیال آیا۔ میں کسی جھونپڑی کے دروازے کے پاس کھڑا ہوں، ایک لمحے بھی رکے بغیر میں نے دروازے پر زور زور سے ٹکیاں ماریں، پترے کا دروازہ بج اٹھا۔ وہ بجتا رہا اور اندر سے کسی کی چونکی ہوئی آواز آئی۔ ”کون ہے رے؟“

آواز چونکی ہوئی ہونے پر بھی تیز تھی، شعور کند کر دینے والی اس جسمانی پریشانی میں بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نازک آواز کسی عورت کی ہے، میں لگاتار ٹکیاں مارتے ہوئے بے چینی سے چیخا۔ ”کھولو، کھولو۔ مسافر ہوں، بارش میں راستہ بھول کر پریشان ہو گیا ہوں“۔

دو چار لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ ہاتھ میں لئے ایک دوشیزہ دروازے میں کھڑی تھی، اس کے خوبصورت چہرے پر تیرتے ہوئے اندیشے اس ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں بھی میری نظروں سے اوجھل نہ رہے، میں نے عجیب بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”گھبراؤ مت، کچھ دیر کے لئے پناہ دے دو، ممنون ہوں گا۔ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا“۔

وہ ایک لمحے تک میری طرف تکتی رہی، پھر ذرا پیچھے ہٹی اور آہستہ سے کہنے لگی۔ ”آیئے!“

میں مسرور قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے والی کھڑکی کے قریب والی کھونٹی پر اس نے چراغ ٹانگ دیا اور پھر کمر پر

ہاتھ رکھ کر میرا پانی سے بھیگا جسم غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ ڈالی، جھونپڑی پتھرے کی تھی اور کافی بڑی تھی، نیچے اینٹیں رکھ کر زمین پکی کی گئی تھی لیکن بیچ میں سیمنٹ نہ ہونے کے باعث نمی اور آ رہی تھی، میں نمی کی طرف دیکھے بغیر نیچے بیٹھ گیا۔ میری خستہ حالی نے اس کے چہرے کے اندیشے بکھیر دیئے تھے، ملائم لہجے میں وہ پوچھنے لگی۔ ”کہاں سے آ رہے ہیں؟“

میں نے جسم کے اکڑے ہوئے اعضا ہلاتے ہوئے ٹوٹتی آواز میں کہا۔ ”ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ذرا تکان ختم ہونے دو“۔ اتنا ہی بولنے میں میری سانس پھول گئی۔

اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ”بہت بھیگ گئے ہیں نا۔ کپڑے تبدیل کریں گے؟“

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے کہا۔ ”کپڑے...... لیکن کپڑے ہیں کہاں؟“

”ٹھہریئے“۔ وہ سامنے والے کونے میں چلی گئی۔ کونے میں ایک چارپائی پڑی تھی، نیچے سے ٹوٹا پھوٹا ٹرنک کھینچ کر اس نے ایک کپڑا باہر نکالا اور اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”گیلے کپڑے اتار کر اسے لپیٹ لیجئے“۔

بغیر بورڈر کی سفید موٹی ساڑھی...... اس وقت وہ شال دوشالے سے بھی زیادہ قیمتی تھی، اٹھنے کی ہمت نہیں تھی، پھر بھی دیوار کا سہارا لے کر انتہائی کوشش کے بعد میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے ساڑھی لنگی کی مانند جسم پر لپیٹ کر کپڑے اتار دیئے۔ شال، قمیص، پینٹ، بنیان، سب کچھ۔ کپڑوں سے ٹپکتے ہوئے پانی سے زمین تر ہو گئی تھی، میں پھر سے نیچے بیٹھ رہا تھا کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اِدھر آیئے، چارپائی پر بیٹھئے“۔

چارپائی پر میلا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اس پر گرنے

ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔ ''ٹھہریئے!'' پھر اس نے صندوق میں سے ویسی ہی دوسری ساڑھی نکال کر بستر پر بچھا دی، پھر پُرسکون ہو کر کسی قدر خوشی کے لہجے میں بولی۔ ''اب آرام سے لیٹیئے!''

میں لیٹ گیا۔ اس نے پھر سے دروازہ کھولا اور دروازے میں کھڑی ہو کر تمام کپڑے نچوڑ کر اندر بندھی ہوئی رسی پر ڈال دیئے، پھر گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے، آپ کی پتلون کی جیب سے یہ بٹوا نکلا ہے''۔

روپے کا پرس۔ لگ بھگ دو سو روپے تھے لیکن اس وقت اسے سنبھالنے کا ہوش کہاں تھا؟ میں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے کہا۔ ''اپنے پاس رکھو، جاتے وقت لے لوں گا''۔

پرس اس نے صندوق میں رکھ دیا اور صندوق چارپائی کے نیچے کھسکا دیا، کچھ دیر بعد سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو وہ گیلی زمین پر ٹاٹ بچھا کر چپ چاپ بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی، میں نے منہ پھیر لیا۔ چڑھتی ہوئی سانس کے ساتھ پیدا ہونے والی کھانسی اور بہتی ہوئی ناک...... اچانک وہ بولی۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ کو زکام ہو گیا ہے''۔

''ہاں......!''

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے بال چھوتے ہوئے کہا۔ ''سر تو اب تک گیلا ہے، زکام نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ ٹھہریئے، پونچھ دوں!''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، اس نے کھونٹی سے تولیہ اتار کر میرا سر پونچھنا شروع کر دیا۔ پھر سوکھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ ابھی سوکھ جائیں گے''۔

رات کی تنہائی میں اجنبی شخص کو دیکھ کر پیدا ہونے والے اندیشے، مانوس ہو جانے پر ختم ہو گئے۔ وہ الّوں کی طرح باتیں کرنے لگی۔ میں پیر سکوڑے ہوئے سینے کے بل لیٹا تھا۔ جسم میں پیوست ہو جانے والی ٹھنڈک کی وجہ سے دانت کٹکٹا رہے تھے، اس نے پوچھا۔ ''بہت سردی لگ رہی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پورے ایک گھنٹے تک بارش میں بھیگا ہوں، اس لئے سردی لگ گئی ہے''۔

اس نے چارپائی کے قریب آ کر کہا۔ ''ذرا کھسکئے تو!'' اور بستر کے نیچے رکھا ہوا کمبل نکال کر اس نے مجھے اڑھا دیا۔

بارش کم ہو جانے کے بعد دوبارہ جوش میں آ گئی تھی، ہر لمحے خوفناک گرج، طوفانی ہوا اور بجلی کی کڑک...... ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے بجلی کی زبان کی لپلپاہٹ اندر داخل ہو جاتی اور اس کا چھوٹا سا چہرہ چمک جاتا۔ نومولود بچے کا سا معصوم چہرہ۔ وہ اتنا بھولا لگتا کہ پیار کے جذبات بیدار ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ پیدا ہونے والی قربت کا احساس دلانے کے لئے میں نے اسے ''تو'' سے مخاطب کر کے پوچھا۔ ''تو یوں ہی بیٹھی رہے گی، سونا نہیں ہے؟''

اس نے گومگو کے عالم میں آس پاس نظر دوڑائی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ''کیسے سوؤں؟'' سب کچھ گیلا تھا اور شاید اس کے پاس اوڑھنے بچھانے کے لئے اور کچھ نہیں تھا۔ فوراً موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ کا زکام کیسا ہے، کہیئے تو رائی کا تیل مل دوں؟''

''رائی کا تیل؟''

''ہاں، گھر میں رکھنا پڑتا ہے، پتا جی کی طبیعت اچھی نہیں رہتی ہے، انہیں بھی اکثر زکام ہو جاتا ہے''۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''پتا جی کہاں ہیں؟''

''کام پر جاتے ہیں، نانگول کے پاس تالاب کھودا جا رہا ہے نا، اب تو جسم کام نہیں کرتا پھر بھی کام تو کرنا ہی پڑتا ہے''۔

''تالاب؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''تالاب میں پانی بھرتے ہی سب آدمی اُس پار بھاگ گئے''۔

''تب تو بپاجی بھی ان کے ساتھ ہوں گے، اب دو دنوں تک نہیں آسکیں گے، ندی میں سیلاب آتا ہے تو بارش رُکنے کے دو روز بعد تک ندی راستہ نہیں دیتی''۔ وہ ذرا بھی متردد ہوئے بغیر بالکل فطری انداز میں بول رہی تھی، اس نے پوچھا۔ ''آپ بھی وہیں سے آ رہے ہیں؟''

''ہاں میں اس طرف کے کنارے پر رہ گیا تھا، اس لئے اسی طرف بھاگا''۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنے بارے میں تمام باتیں اسے بتا دیں۔

اس نے ہنس کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے کچھ خوش ہو کر کہا۔ ''تب تو آپ سرکاری صاحب ہیں نا؟ یہ جان کر تو بپاجی بھی خوش ہوں گے کہ آپ یہاں آئے تھے''۔

میرا درجہ جاننے کے بعد اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ فوراً اٹھ کر تیل کی شیشی لے آئی۔ وہ بڑی دیر تک سر جھکائے مالش کرتی رہی، میری کھانسی رک گئی تھی، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دیکھا نا، رائی کا تیل بڑا اکسیر ہے۔ آپ کا زکام کیسا ہلکا پڑ گیا؟'' واقعی یہ رائی کا تیل ہی کا کرشمہ تھا یا اس کے کومل ہاتھوں کا؟

میں نے آنکھیں ملانے کی ہمت ہار کر آنکھیں موند لیں، اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''نیند آ رہی ہے؟''

باہر طوفان کے شور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اس میں نیند کیسے آ سکتی ہے؟'' اور پھر رک کر بولا۔ ''آج سارا دن پیٹ میں کچھ نہیں پڑا۔ خالی پیٹ کی وجہ سے بے چینی ہو رہی ہے''۔

ایسا لگا جیسے کھانے کے بارے میں پوچھنا بھول جانے کے سبب وہ یکایک شرما گئی ہو، دوسرے ہی لمحے بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔ ''چائے پئیں گے؟''

''اس وقت چائے؟''

''ہاں، بپاجی اکثر جب دیر سے آتے ہیں تو چائے مانگتے ہیں، اس لئے دودھ رکھنا پڑتا ہے تاکہ کہیں تو چائے بنا دوں، دوپہر کے وقت کی باجرے کی ٹھنڈی روٹی پڑی ہے، اسے بھی گرم کر دوں گی، چائے اور روٹی پسند آئے گی؟''

ایک اجنبی کے لئے اس کی اتنی پُرخلوص خدمات سے متاثر ہو کر میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں چائے بنوانے سے انکار کروں گا تو وہ ناراض ہو جائے گی، ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں مَیں نے کہا۔ ''سب پسند آئے گا''۔

یہ سنتے ہی وہ انتہائی خوشی سے کودتی ہوئی سامنے والے کونے میں پہنچ گئی اور جلدی سے انگیٹھی جلا کر چائے بنا ڈالی۔

وہ دس منٹ کے اندر ہی کانسی کی رکابی اور پیالے میں چائے روٹی دے گئی۔ شاہی طعام اور مغلیہ کھانے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہے لیکن ایسی شیرینی تو شاید اس میں بھی نہ ہوتی ہو گی، ذائقے سے معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں سونٹھ ڈالا گیا ہے، وہ زکام ٹھیک کرنے کی تمام کوششیں کر رہی تھی، میں کھا پی کر لیٹا۔ وہ پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔

میں نے کچھ سوچنے کے بعد ہمت کر کے کہا۔ ''تو چارپائی پر بیٹھ جا نیچے ہر طرف نمی ہے، تجھے بھی زکام ہو جائے گا''۔

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہم لوگوں کو اس طرح جلدی زکام نہیں ہوتا''۔

میں نے کہا۔ ''نہیں، میں چارپائی پر لیٹوں اور تو گیلی زمین پر بیٹھی رہے، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

شاید مجھے خوش کرنے کے لئے وہ میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی، دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی، اس کا سبب اسے بھی معلوم تھا۔ کچھ بات کرنے کی غرض

سے میں نے پوچھا۔ ''یہاں ویرانے میں جھونپڑی بنا کر کیوں رہتی ہو؟''

''یہاں ہمارا کھیت ہے، دیکھ بھال تو کرنی ہی چاہئے نا پہلے چار کھیت تھے لیکن ماں کے مرجانے کے بعد بپا جی سے اکیلے سنبھالتے نہ بنے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی، پھر بپا جی بیمار پڑے، تمام کھیت بیچ دیئے، یہی ایک بچا ہے......''

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس کا بات کرنے کا انداز بھی بے حد پیارا تھا۔ آواز میں مجبوری کا کوئی احساس نہیں تھا۔ پھر بھی میرے دل میں آپ ہی آپ ہمدردی پیدا ہونے لگی، وہ کیا کہہ رہی ہے؟ صرف ایک ہی کھیت بچا ہے، اس میں کیسے پورا پڑ سکتا ہے؟ اسی لئے تو بوڑھے باپ کو بیمار ہونے کے باوجود مزدوری کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے اور ندی میں سیلاب آ جانے کے باعث وہ دو دنوں تک گھر نہیں آ سکے گا، ذرا رک کر میں نے پوچھا۔ ''اس طرح تجھے اکیلی چھوڑ کر جانے سے بپا جی کو بڑی فکر ہوتی ہو گی؟''

''نہیں، فکر کی کیا بات ہے؟ یہاں کھیتوں کی کیاریوں پر تو ایسی کئی جھونپڑیاں ہیں مگر بارش میں آپ کو دکھائی نہ دی ہوں گی''۔

''کچھ دیر آرام کرلوں، اجالا ہوتے ہی چلا جاؤں گا''۔

''واہ! ابھی کیسے جائیں گے؟ دیکھئے تو بارش کو اب بھی چین کہاں ہے؟ ندی کیسے پار کریں گے؟''

بات تو ٹھیک تھی۔ میں سمجھتا تھا، پھر بھی میں نے کہا۔ ''لیکن تجھے اس طرح بیکار کیوں تکلیف دیتا رہوں؟''

اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک نمودار ہوئی۔

''تکلیف...... میرے لئے تو اچھا ہوا ورنہ بپا جی کے آنے تک تنہا رہنا پڑتا۔ میں تو کہتی ہوں کہ بپا جی کے آنے تک یہیں رہ جایئے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے کہ صاحب آئے ہیں''۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، وہ تو خوش ہوں گے لیکن تب تک تیری کیا حالت ہو جائے گی؟ میں اس طرح لیٹا رہوں اور تُو بیٹھی بیٹھی تپسیا کرتی رہے، یہی نا؟ بھلا ایسے میں مَیں کیسے آرام سے سو سکتا ہوں؟'' وہ خاموش ہو گئی۔ چراغ کی بالکل مدھم روشنی میں بھی مجھے اس کی آنکھوں کی چمک نظر آ رہی تھی اور پھر میں آہستہ آہستہ ڈوبتا گیا۔ میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ گونجتے کڑاکے میں لرزتی جھونپڑی کا دیا، سائیں سائیں کرتی ہوا میں تھرتھراتی روشنی، شاید چراغ میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ ایک تیز چمک کے بعد روشنی بجھ گئی۔ طویل گرج کے ساتھ بجلی کوندی، خوف کے مارے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

رات گئے بارش رک گئی۔ طوفان چلا گیا تھا اور سویرا ہونے پر سہانی دھوپ نکل آئی تھی، وہ بہت متاسف تھی۔ مجھے چارپائی پر سویا چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی گرہستی کے کام نمٹانے شروع کئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے میرے بھیگے کپڑے سوکھ گئے تھے۔ وہ انہیں تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے پہن لیجئے''۔ پھر شال تہہ کرتے ہوئے بیل بوٹے والی ست رنگی کشیدہ کاری پر تحسین آمیز نگاہ ڈال کر اس نے رسیلی آواز میں کہا۔ ''کیسی خوبصورت کشیدہ کاری ہے، ہے نا؟''

میں نے اچانک کہہ دیا۔ ''تجھے پسند ہے؟ تُو رکھ لے''۔

واقعی وہ اسے پسند آ گئی تھی اور صرف شال ہی نہیں اگلے روز وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے پرس بھی اس کے سامنے کر دیا۔ وہ سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں!''

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ دان نہیں ہے، تُو جانتی ہے اگر تُو نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت زندہ نہ ہوتا۔ میں زندگی عطا کرنے کے بدلے میں

تجھے یہ معمولی سا تحفہ دے رہا ہوں“۔

چڑھتی دھوپ میں کرنوں کی بانہوں سے پرچھائیاں کھسک رہی تھیں، وہ آہستہ آہستہ مجھ سے الگ ہو رہی تھی، بہت کچھ الگ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے لیکن اب وقت نہیں تھا۔ وہ رک گئی اور میں دروازہ پار کر گیا۔ الوداع کہتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔ ”پھر آئیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں، ڈیم بن رہا ہے اس لئے اکثر و بیشتر اس طرف آنا ہوتا رہے گا۔ اب آؤں گا تو تجھ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا“۔

اس کی معصوم آنکھوں میں عقیدت کی روشنی جگمگا رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دن کی روشنی میں اس روشنی کی لو برداشت کرنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے، وہ دروازے پر ہی کھڑی رہی اور میں چلا آیا۔

گھر آیا تو چھپرا کی بے چینی کی انتہا نہ تھی، طوفان اور ندی کے سیلاب کی خبر اسے مل چکی تھیں مجھے بخیر دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ پھر میرا سامان ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اس میں آپ کی شال کیوں دکھائی نہیں دیتی؟“

کیسے جواب دوں...... کیا جواب دوں؟ میں نے کہا۔ ”دوڑ بھاگ میں شال کہیں گم ہو گئی“۔

اس نے کہا۔ ”اچھا ہوا کہ کھو گئی، جان بچی تو لاکھوں پائے، نئی خرید لیں گے“۔

اور اگلے جاڑے میں اس نے میرے لئے نئی شال خرید لی اور جہاں پہلی شال چھوڑ آیا تھا، وہاں جانا ممکن ہی نہ ہو سکا۔

▲

یکا یک میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چونک کر دیکھا تو نوکر آ رہا تھا۔ ”صاحب! چائے“۔

چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر میں نے پوچھا۔

”بند پر کام کرنے والے مزدوروں میں کوئی کسان ہو تو اسے میرے پاس بھیج دو“۔

کچھ دیر بعد ایک کسان آیا، میں نے پوچھا۔ ”گزشتہ سال یہاں بند پر ایک کسان کام کرتا تھا۔ نام تو یاد نہیں ہے لیکن وہ بوڑھا اور بیمار تھا۔ اس پار کے کھیتوں میں کہیں اس کی جھونپڑی تھی“۔ اور کچھ ٹھہر کر میں نے کہا۔ ”ایک جوان لڑکی بھی“۔

”کس کی؟ چھمن کی بات کر رہے ہیں نا صاحب! وہ تو مر گیا، چھ مہینے ہو گئے ہوں گے۔ کھیت بیچ کر لڑکی بھی کہیں چلی گئی ہے، معلوم نہیں کہاں گئی“۔

آگے اور کچھ پوچھنے کی بات نہیں بچی تھی، بارش آتے آتے رک گئی تھی، میں کسی پریشانی کے بغیر دو دنوں میں ابتدائی رپورٹ تیار کر کے لوٹ آیا لیکن گھر کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں، دیوان خانے میں ایک چھوٹا سا پالنا جھول رہا تھا اور چھپرا کھڑی جھولا جھلا رہی تھی۔ ”یہ کیا ہے چھپرا؟“

ذرا بھی خفا ہوئے بغیر اس نے نرم فطری لہجے میں کہا۔ ”کیوں، اس دن آپ نے دیکھا نہیں تھا؟“

”کیا؟“

”چبوترے پر بچہ پڑا ہوا تھا نا! پھر پولیس آئی لیکن اس سلسلے میں الجھن پیدا ہوئی کہ بچے کو کہاں رکھا جائے“۔

”اس لئے تُو نے مانگ لیا، یہی نا؟“

”ویسے تو نہ مانگا ہوتا لیکن......“ وہ ذرا رک گئی پھر اس طرف کی دیوار کی جانب نظر کر کے بولی۔ ”لیکن پولیس نے چادر ہٹائی اور چادر کے نیچے سے یہ شال نکل پڑی“۔ اس نے کھونٹی سے کشیدہ کاری والی شال اتار کر میری طرف پھینکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔ ”جو شال آپ نے کھو دی تھی“۔

ان کی طبیعت ذخیرہ اندوز قسم کی ہے۔ ان کو نجانے کیا کیا جمع کرنے کا شوق تھا اور ہے مثلاً کتابیں، رسالے، تصویریں، جوتے، فکشن، فلمیں، کپڑے، دوست اور بیویوں کی شکل میں عورتیں۔

ہمارا مجاہد

☆ یارِ غار کے قلم سے

یہ اپنے والد صاحب کی طرح مشکل پسند ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہ مشکل کام کو مشکل ترین طریقے سے اور یہ مشکل کام کو آسان ترین طریقے سے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی تو انہوں نے خود ہی کچھ فرضی لڑکیوں کی طرف سے خود کو زبردست قسم کے لو لیٹر لکھنے شروع کر دیئے۔ ان خطوں کے لفافوں پر یہ کچھ مشکوک قسم کے نشان بھی بنا دیا کرتے تھے تاکہ بڑے ان کو پڑھنے پر مجبور ہو جائیں مثلاً کبھی دل بنا دیا جس پر تیر لگا ہوا ہو اور خون ٹپک رہا ہو، کبھی گلاب کا پھول بنا دیا اور کبھی فرضی بھیجنے والی کا پُرکشش نام بھی لکھ دیا۔ نتیجہ ان کی توقع کے مطابق نکلا اور گھر والوں نے ایک دو لیٹر پڑھ کر ہی سرگرمی دکھائی اور ان کی شادی کر دی۔ اب پچھتاتے ہیں کہ یہ واردات نہ کرتے تو کچھ اور سال سکون سے گزر جاتے مگر اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت اور بیوی چگ گئی جیب۔

ان کے گھر میں تعمیر و مرمت کے سب کام ان کے والد صاحب ہی کرتے یا کراتے تھے اور مستری کے پاس خراب چیزیں بھیجنے کی بجائے خود ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کے بعد وہ مشین مکینک کے پاس بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہتی تھی یا تو ٹھیک ہو جاتی تھی یا نئی لینا پڑتی تھی۔ ان کے بیمار ہونے کے بعد یہ ذمہ داری انہوں نے لے لی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہی کوشش کی۔ والد صاحب تو پھر بھی 50 فیصد چیزیں ٹھیک کر لیتے تھے مگر ان کی کارکردگی تو سو فیصد تھی لیکن چیزیں خراب کرنے میں۔ اگر ایک آدھ کچھ ٹھیک بھی ہوئی تو

اس سے بڑی خرابی پیدا ہو گئی جسے ٹھیک کرانے میں اس سے کہیں زیادہ خرچ آیا جتنی پہلی خرابی دور کرانے میں آنا تھا۔ بہرحال مکینک ان کو دعائیں دیتے ہیں کہ ان کا کام بڑھائے رکھتے ہیں۔

شروع سے ہی ان کا رجحان نصاب سے زیادہ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رہا۔ کالج میں قانون یہ تھا کہ ایک کلاس کو کتابیں لینے دینے کے لئے ایک یا دو دن مقرر تھے۔ یہ جو کتاب لیتے اسی دن پڑھ لیتے اور دوسرے دن دوسری لے کر وہ بھی اسی وقت پڑھ ڈالتے اور ہفتے کے باقی دن نصابی کتابیں پڑھ پڑھ کر پریشان ہوتے رہتے۔ آخر تنگ آ کر اپنے دوست مرزا کو ساتھ لے کر پرنسپل کے پاس چلے گئے کہ ہمیں دنوں کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے چونکہ یہ ادیب اور مرزا صاحب شاعر تھے اس لئے پرنسپل صاحب ان کو پسند کرتے تھے۔ دوسرے انہوں نے کتابوں کی محبت اور علم کے شوق کے متعلق ایسی پُر اثر تقریر کی کہ پرنسپل صاحب نے اسی وقت لائبریرین کو بلا کے حکم دے دیا کہ یہ دونوں صاحبان ہفتے کے کسی دن اور ان سے کسی وقت بھی کتاب لینے دینے آئیں تو ان کی خواہش پوری کی جائے۔ لائبریرین کو بڑا غصہ آیا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات تعمیل پر مجبور تھا اور یہ دونوں اسے تنگ کرنے کے لئے وقت ناوقت لائبریری میں جا دھمکتے اور بعض اوقات ایک دن میں دو دو تین تین بار کتابیں بدلتے اور مزے کی بات یہ کہ کوئی بھی کتاب ان کے نصاب سے متعلق نہ ہوتی اور دونوں سائنس کے طالب علم تھے لیکن شعر و ادب سے دلچسپی کی بنا پر اردو ادب کے تمام شعبے چاٹ گئے۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا کہ دونوں بی ایس سی کے امتحانات میں ہینڈز اپ ہو گئے اور بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق بمشکل بی اے کر کے گریجویٹ بننے میں کامیاب ہو گئے۔ شاید اس میں کچھ دخل لائبریرین کی بددعاؤں کا بھی تھا۔

اگر یہ اپنے رجحان طبع کے مطابق پہلے ہی سائنس کے چکر میں پڑنے کی بجائے اردو ادب رکھ لیتے تو زیادہ کامیاب رہتے مگر کچھ گھر والوں کی خواہش اور کچھ انجینئر بننے کے خواب کہ یہ سائنس میں خوار ہوتے رہے اور اب گھر کی چیزوں پر انجینئرنگ کر کے شوق پورا کرتے ہیں اوپر سے ان کی اپنی چیزیں بھی اکثر خراب رہتی ہیں کبھی کمپیوٹر تو کبھی موبائل، کبھی موٹر سائیکل تو کبھی اور کوئی چیز یہ سب ٹھیک ہوں تو خود بیمار ہو جاتے ہیں یا بیوی۔

ماضی میں یہ کئی رسالوں کی مجلسِ ادارت میں بھی شامل رہے ہیں تنقیدی مزاج کے باعث بڑے کامیاب رہے اب چونکہ وہ کسی رسالے میں نہیں ہیں اس لئے رسائل کے مدیران کو الٹے سیدھے مشورے دے کر اور رسائل میں غلطیاں نکال کر اپنا ٹھرک پورا کرتے ہیں اگر ان کے تمام مشوروں پر عمل کر لیا جائے تو رسالہ بڑی جلدی بند ہونے کے برائٹ چانسز ہو سکتے ہیں کیونکہ الیکٹرانک میڈیا کے چھا جانے کے باعث پرنٹ میڈیا کے حالات ویسے ہی دگرگوں ہیں اس لئے الٹے سیدھے تجربات جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں مگر ان کو کون سمجھائے یہ ابھی تک اس دور میں زندہ ہیں جب مارکیٹ پر رسائل کی اجارہ داری تھی۔

اکثر شعراء و ادباء کی طرح یہ بھی نہایت حُسن پسند ہیں اور فطرت کے حُسن کے ساتھ ساتھ نسوانی حُسن کے بھی قدردان ہیں۔ ویسے تو ان کو ہر خوبصورت لڑکی اچھی لگتی ہے اور اس کی تحسین کو یہ اللہ کی تعریف سمجھتے ہیں لیکن جوانی میں انہوں نے یکے بعد دیگر تین نہایت زوردار عشق کئے جنہوں نے ان کی صحت اور فکر پر بڑے منفی اثرات مرتب کئے۔ عجیب بات یہ کہ وہ تینوں لڑکیاں خوبصورتی کے محض اوسط معیار پر پورا اترتی تھیں اور خوبصورتی کے اعلیٰ معیار پر فائز کئی لڑکیوں کی محبت کو یہ اپنی انا کے باعث ٹھکرا چکے تھے۔ ان تین میں سے ایک لڑکی کے

معاملے میں تو ان کی محبت محض ون وے ٹریک ہی تھی البتہ وہ ان سے مفادات اٹھاتی رہی اور اُلو بناتی رہی اور وہ ان کو ہی نہیں اور بھی کئی لوگوں کو صفائی سے اُلو بنا رہی تھی اور سبھی کا خیال تھا کہ اسے ان سے سچا پیار ہے۔ باقی دو کے معاملے میں آگ دونوں طرف اگر برابر نہیں بھی تو 60 فیصد اور 40 فیصد کی نسبت سے ضرور لگی ہوئی تھی ایک کے معاملے میں 60 فیصد یہ تھے اور دوسرے معاملے میں 60 فیصد لڑکی تھی لیکن ظالم سماج حسب عادت وحسب معمول درمیان میں آ گیا کہیں ذات پات کی دیواریں حائل ہو گئیں تو کہیں اونچ نیچ نتیجہ وہی نکلا جو عموماً ایسے معاملات میں نکلا کرتا ہے کہ ان سب کی شادیاں تو ہو گئیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ جن کا کوئی قصور بھی اس معاملے میں نہ تھا مگر تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ ممکن ہے انہوں نے بھی کوئی غلطی کی ہو جس کی انہیں یہ سزا ملی ہو۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ غلطی کرو تو بھی ڈرو اور نہ کرو تو بھی ڈرو۔

ان کو ہر وقت کسی نہ کسی کام کا جنون ہوتا ہے اگر مطالعے کی طرف دھیان ہو گیا ہے تو دنیا جہان کی کتابیں پڑھ ڈالیں گے۔ اگر لکھنے کا خیال آ گیا تو مسلسل لکھتے چلے جائیں گے اور اگر تعمیر و مرمت اور تربیت کا خیال آ گیا تو سارا گھر تلپٹ کر دیں گے۔ اگر کمپیوٹر کی طرف دھیان آ گیا تو ساری رات انٹرنیٹ چلاتے رہیں گے اور اگر بیوی کا خیال آ گیا تو پھر اس کی خیر نہیں۔ انہوں نے برسوں قبل ایک دینی پرچے کی ادارت کے دوران داڑھی رکھی تھی اور اتنے برسوں میں وہ بڑھنے کی بجائے کم ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ سر کے بال کم ہو رہے ہیں تو بیلنس کیا ہے۔ خیر وہ عام طور پر نظر تو آ ہی جاتی ہے لیکن جس دن نائی کے پاس جائیں تو خوردبین سے تلاش کرنا پڑتی ہے۔

تعلیم کے دوران ہاسٹلوں اور ملازمتوں کے دوران فلیٹوں میں اکیلا رہنے کے باعث بہت سے زنانہ کام کرنے کے بھی ماہر ہیں مثلاً چائے بنانا، رومال اور شرٹیں دھو لینا، کپڑے استری اور مرمت کر لینا۔ شادی کے بعد جب بیوی کو پتا چلا تو بڑی خوش ہوئی کہ کچھ تو ہاتھ بٹائیں گے تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ تو کنوارپنے کی مجبوریاں تھیں اب اگر کوئی کام کرانا ہے تو میری ڈیوٹی یعنی پڑھنا لکھنا تم سنبھال لو، تمہارے کام میں کر دوں گا۔ بیوی جو بمشکل میٹرک کر سکی تھی اس نے جمع تفریق کی تو اسے یہ گھاٹے کا سودا لگا لہٰذا ان سے کسی تعاون کی آس ختم کر دی کیونکہ ان کے بزرگوں کے بھی ایسے ہی سخت اصول ہیں اس لئے اب وہ کسی مرد کو بیوی کا ہاتھ بٹاتے دیکھتی ہے تو سرد آہ بھر کر رہ جاتی ہے۔

ان کی طبیعت ذخیرہ اندوز قسم کی ہے، ان کو نہ جانے کیا کیا جمع کرنے کا شوق تھا اور ہے مثلاً تصویریں، کتابیں، جوتے، فکشن فلمیں دوست اور بیویوں کی شکل میں عورتیں باقی شوق تو ان کے تقریباً پورے ہو ہی گئے لیکن آخری عورتوں والا شوق بیوی کی سخت گیری کے باعث پورا کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ گو ہتھیار اب بھی انہوں نے نہیں ڈالے اور عزم جوان ہے لیکن چونکہ انہیں دولت جمع کرنے کا شوق نہ تھا اس لئے ان کا بیویوں والا عربی شوق شاید ہی کبھی پورا ہو۔

آف دی ریکارڈ بات یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ان کی ایک ہم مزاج کلاس فیلو نے انہیں شادی کی آفر کی تھی اور انہوں نے گھر والوں کے نہ ماننے کی وجہ سے معذرت کر لی تھی۔ پچھتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش! میں نے اس سے خفیہ شادی ہی کر لی ہوتی کیونکہ وہ تو اس پر بھی تیار تھی تو یہ شوق کسی حد تک تو پورا ہو جاتا مگر بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

***

پروفیسر پریا تابیتا

روح گھائل بدن فگار ہوئے
ظلم کشمیر میں ہزار ہوئے

موت رقصاں ہے اب فضاؤں میں
سر جدا تن سے بار بار ہوئے

سرخ جوڑے کفن میں لپٹے ہیں
سانحے ایسے بے شمار ہوئے

سرفروشوں کو مل گیا ہے کفن
جلتی وادی میں کاروبار ہوئے

ان سے پوچھو کہ عزتیں کیا ہیں
جن کے دامن ہی تار تار ہوئے

پاک ہوتا ہے وہ لہو جس میں
ڈھل کے موتی بھی آبدار ہوئے

صفِ ماتم بچھا کے بیٹھے ہیں
لمحے خوشیوں کے سوگوار ہوئے

خون ان کا پکارتا ہے سنو
اپنی جنت پہ جو نثار ہوئے

اہلِ انصاف سے کہے کوئی
ان کے دعوے بھی داغدار ہوئے

یہ ایک سو فیصد سچی کہانی ہے جسے واقعات کی کڑی سے کڑی ملا کر تحریر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کے کرداروں کے نام فرضی ہیں، کسی قسم کی مماثلت محض اتفاق ہوگا۔

0300-5563881 , Email:shafqat.mehmaadsafi@gmail.com

نشانِ عبرت

خمیازہ

☆ ایس ایم صفی

اسلام پور ضلع اٹک کے شمال مشرق میں سرحدی گاؤں ہے جس کی سرحدیں ایک طرف ضلع راولپنڈی (پنجاب) سے تو دوسری طرف ضلع ہری پور (خیبر پختونخوا) سے ملتی ہیں۔ یہ دریائے ہرو کے کنارے میدانی علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ ہری بھری فصلیں اور لہلہاتے سرسبز کھیت ہیں۔ یہاں کے رہنے والے اکثر لوگ زراعت سے وابستہ ہیں۔ لوگ محنتی اور جفاکش ہیں۔ لوگوں میں ملنساری اور امداد باہمی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھرپور شریک ہوتے ہے۔

ہر شہر اور گلی محلے کی طرح اچھے لوگوں کے درمیان اسلام پور میں بھی کچھ ضمیر فروش لوگ رہتے تھے جو مختلف غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ گاؤں میں لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری سکول تھا جو سرکاری عمارت کی عدم دستیابی کی بناء پر اسی گاؤں کے باسی محبوب کے گھر قائم تھا۔ سکول محبوب کی بھتیجی مس مریم کے زیر انتظام چل رہا تھا۔

اسلام پور میں غلام سرور بھی رہتا تھا، وہ ایک سرکاری ادارے کا ملازم تھا۔ اس کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ بہن بھائیوں میں شمائلہ سب سے چھوٹی تھی۔ غلام سرور کی ساری اولاد میں شمائلہ سب سے خوبصورت تھی۔ سرخ و سپید رنگت، سنہری بال، جھیل سی گہری نیلی چمکدار آنکھیں، بس حُسن و جمال میں وہ یگانہ تھی۔ وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھی۔ شمائلہ عام بچوں سے ذرا مختلف طبیعت کی مالک تھی۔ وہ کبھی اپنی ماں اور بہنوں کو تنگ نہ کرتی بلکہ تابعداری میں باکمال تھی۔ شمائلہ جب چار برس کی ہوئی تو اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسیہ باجی کے پاس داخل کرا دیا گیا۔ آسیہ باجی عرصہ دراز سے گاؤں بھر کی بچیوں کو فی سبیل اللہ قرآن مجید کی تعلیم دے رہی تھی۔

شمائلہ بلاناغہ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ وہ کمال حافظہ کی مالک تھی۔ آسیہ باجی کی توقع سے بھی بڑھ کر شمائلہ اپنا سبق یاد کرتی۔ جلد ہی شمائلہ نے ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لی۔ گھر والے تو شمائلہ کی ذہانت کے معترف تھے ہی اب وہ محلہ بھر میں مقبول ہو گئی۔ عام ماؤں کی طرح شمائلہ کی والدہ نے بھی اپنی بیٹی کے کان چھدوا رکھے تھے۔ ختم قرآن سے بڑھ کر اور خوشی کا موقع کون سا ہوگا۔ شمائلہ کی والدہ نے اپنے خاوند کی کمائی سے تھوڑا تھوڑا کر کے شمائلہ کی بالیوں کے لئے رقم جمع کی ہوئی تھی۔ شمائلہ کی والدہ نے بیٹی کو انعام کے طور پر سونے کی بالیاں بنوا دیں۔ سنہری بالیاں اس کے ننھے ننھے کانوں میں کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔

شمائلہ اب پانچ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے والدین نے اسے مس مریم کے پاس گرلز پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ ہر روز اپنی ہم جولیوں کے ساتھ بلاناغہ سکول جانے لگی۔ شمائلہ کی ذہانت کے جوہر جلد ہی اس کی استانیوں پر نمایاں ہو گئے۔ وہ ہر روز سکول اسمبلی میں اپنی پُرسوز آواز میں نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پڑھتی اور بچیوں کو دعا بھی پڑھاتی۔ سال گزر چکا تھا اب وہ دوسری جماعت میں پہنچ چکی تھی۔ سکول میں بلاناغہ بچیوں کو تختی لکھوائی جاتی تھی۔

مئی 1992ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ گندم کی سنہری بالیاں پک کر تیار ہو چکی تھیں۔ اسلام پور کے کسان اپنی کھیتی کو سمیٹنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ شمائلہ حسب معمول صبح سویرے اٹھی۔ اپنی ماں کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آسیہ باجی کے پاس قرآن مجید کا سبق پڑھنے چلی گئی۔ ساڑھے سات بجے شمائلہ آسیہ باجی کے گھر سے چھٹی کر کے واپس گھر پہنچی۔

شمائلہ کی بڑی بہن روبینہ صحن میں رکھے چولہے پر ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس کی والدہ صحن میں بچھی چارپائی

پر بیٹھی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی۔ غریب گھرانوں میں ناشتہ بھی تو روکھی سوکھی روٹی اور ایک چائے کی پیالی ہی ہوتا ہے۔ شمائلہ تو معصوم تھی۔ اسے گھر کے حالات کا درست طور پر ادراک نہیں تھا۔ اس روز اس کے من نے ایک فرمائش کی اور اس نے اپنی بہن سے انڈہ فرائی ناشتے میں مانگا۔ روبینہ نے جب اپنی بہن کی فرمائش سنی تو اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ روبینہ نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے اپنی بہن کو دلاسا دیا اور کہا کہ جب تم تفریح کے وقت آؤ گی تو میں تمہارے لئے انڈہ اور پراٹھا تیار کر کے رکھ دوں گی تم کھا لینا۔ فی الحال یہی روکھی روٹی چائے کے ساتھ کھا لے۔ بچے تو ویسے بھی سچے من کے مالک ہوتے ہیں جلد ہی بہل جاتے ہیں۔ شمائلہ نے جلدی جلدی چند نوالے خشک روٹی کے چائے کے ساتھ کھائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سکول کا یونیفارم پہنا، بالوں میں کنگھی کی، اپنا بستہ لیا، تختی ہاتھ میں اٹھائی اور سکول کی طرف روانہ ہو گئی۔ حسب معمول شمائلہ اسمبلی سے پہلے سکول میں پہنچی۔ اس نے دیگر ساتھیوں سے مل کر دعا و قومی ترانہ پڑھایا۔ نعت تو اس روز بھی شمائلہ نے پڑھی پر اس روز اس کی آواز میں عجب سوز و گداز تھا۔

خیر پڑھائی شروع ہو گئی۔ وقت مٹھی سے ریت کی مانند نکلا جا رہا تھا۔ دن کے بارہ بج گئے۔ سکول کی گھنٹی بجی اور بچیوں کو پچاس منٹ کی تفریح ہو گئی۔ تمام بچیاں تفریح کے وقت گھر چلی جاتی تھیں۔ باقی بچیوں کی طرح شمائلہ بھی اپنی تختی اٹھائے گھر کو روانہ ہو گئی تاکہ گھر سے کھانا بھی کھا آئے اور تختی بھی دھلا لائے کیونکہ تفریح کے بعد مس مریم نے تختیوں پر املا لکھوانی ہوتی تھی۔

گرمی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ زیادہ تر لوگ دھوپ سے بچنے کے لئے اپنے گھروں کے اندر جا چکے تھے۔ گلیاں اور راستے قدرے سنسان ہو چکے تھے۔ شمائلہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تختی اٹھائے دل میں انڈہ پراٹھا کھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شمائلہ جس راستے پر گھر جاتی تھی اسی راستے پر شیرے کا گھر بھی تھا۔ شیرے کے گھر میں بیری لگی تھی جس کی کچھ شاخیں باہر گلی میں تھیں۔ اکثر پکے ہوئے بیر گرتے تھے جو بچے اٹھا کر کھا لیتے۔ اس وقت بھی چند پکے ہوئے بیر زمین پر گرے ہوئے تھے۔ شمائلہ یہ بیر چننے لگی۔

اسی اثناء میں شیرے کی مجھلی بیٹی ببلی دروازے پر آ کر گلی میں دائیں بائیں جھانکنے لگی یہ اس کا معمول تھا کہ بارہ بجے کے بعد اس کو یونس کا انتظار ہوتا تھا مگر آج یونس تو نہ آیا ہاں البتہ ایک معصوم پری چلچلاتی دھوپ میں زمین پر گرے بیر چن رہی تھی۔ ناگاہ ببلی کی نگاہ اس معصوم چہرہ پر پڑی شمائلہ کے کانوں میں سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں، بس ببلی کے تیور بدلے اس نے شمائلہ کو بلایا۔

"بیٹا اندر آ جاؤ میں تمہیں بیری کے پکے ہوئے بیر دوں گی"۔ اس نے شمائلہ کو لالچ دیا۔ تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ شمائلہ اس کی چال میں آ گئی اور اس کے ساتھ ان کے گھر کے اندر چلی گئی۔ اندر گھر میں پہلے سے ببلی کی والدہ منورہ اور چھوٹی بہن زینت موجود تھیں۔ شمائلہ کو چارپائی پر بٹھایا اور اس کے کانوں کی بالیوں کو ٹٹولنے لگیں۔

"یہ تم نے کہاں سے بنوائی ہیں؟" زینت نے حریصانہ لہجے میں کہا۔ "بہت خوبصورت ہیں ذرا اتار کر دیکھ لیتی ہیں"۔

اس نے شمائلہ کی بالیاں کانوں سے اتار لیں۔ پھر تھوڑے سے بیر اسے دیئے اور بہلا پھسلا کر اسے بیرونی دروازے سے باہر نکال دیا اور خود دروازے سے اسے تاکنے لگی۔ شمائلہ نے باہر نکل کر رونا شروع کر دیا۔ وہ روتی اور ساتھ ساتھ کہتی کہ میں اپنی امی کو جا کر بتاتی ہوں کہ میری بالیاں تم لوگوں نے اتار لی ہیں۔ ببلی بھی

دروازے تک پہنچ آئی جب ماں بیٹی نے شمائلہ کی باتیں سنیں تو فوراً ان کو خوف ہوا کہ کہیں یہ بچی سچ سچ جا کر اپنی والدہ کو کہہ دے تو ان کے لئے مصیبت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک اور چال چلی اور شمائلہ کو بالیاں واپس دینے کے بہانے پھر اندر بلا لیا۔ جونہی شمائلہ دروازے تک پہنچی منورہ نے اس معصوم کو بازوؤں سے اندر کھینچ لیا اور بلی اور منورہ چیختی چلاتی بچی کو گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئیں۔ شمائلہ کو کمرے میں بند کر کے اسے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ مگر شمائلہ تو کسی طرح چپ نہیں کر رہی تھی۔ اب ماں نے پکڑا اور دونوں بہنوں نے طمانچوں سے گلاب کی پتیوں سے نرم گالوں کو سرخ کر دیا۔ اب شمائلہ کی چیخیں سسکیوں میں بدل چکی تھیں۔

شمائلہ اب مکمل طور پر ان تین ماں بیٹیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ان کی آنکھوں پر حرص و ہوس کے پردے پڑ گئے تھے۔ وہ کسی بھی طرح بالیاں واپس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شمائلہ مسلسل رو رہی تھی۔ شمائلہ کا وجود اب ان کے لئے مستقل خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ اگر وہ شمائلہ کو باہر نکالتی ہیں تو ان کا راز فاش ہو جاتا تھا اور اگر اسے گھر میں رکھتیں تو کتنے روز تک؟ انہوں نے اپنا دھندہ بھی تو کرنا تھا۔ بس یہی سوچ کر انہوں نے شمائلہ کو ٹھکانے لگانے کا سوچا۔ ادھر شمائلہ کا بار بار رونا ان کو اور زیادہ مشتعل کر رہا تھا۔ بلی کی سفاکی اپنے عروج کی حدوں کو چھونے لگی۔ بلی کے مضبوط ہاتھ معصوم گلے تک جا پہنچے۔ شمائلہ کے بازو زینت اور پاؤں منورہ نے پکڑ رکھے تھے۔ چند لمحوں میں وہ معصوم اپنی آواز کے ساتھ ساتھ سانسیں بھی کھو بیٹھی۔ خون کے دباؤ سے شمائلہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گلے پر انگلیوں کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ شمائلہ کی آنکھیں دباؤ سے کافی باہر آ گئی تھیں۔

یہ سارے گھر والے چلتا پرزہ قسم کے لوگ تھے اور اردگرد خاصے بدنام تھے۔ بلی اور زینت کسی نہ کسی مرد کو پھنسا کر گھر بلا لیتیں اور اس سے خوب پیسے بٹورتی تھیں۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں طوائفوں والا کام کر رہی تھیں۔ چھوٹے موٹے جرائم اس گھر کا ہر فرد کر لیتا تھا مگر قتل جیسا بڑا جرم پہلی بار سرزد ہوا تھا۔ آنکھوں سے جب لالچ اور ہوس کی پٹی اتری تو سوچنے لگیں کہ یہ کیا کر بیٹھی ہیں۔ اب ان کو اپنی بربادی مکمل طور پر نظر آنے لگی۔ انہوں نے ایک کمبل میں لاش کو لپیٹ کر اندر چھپا دیا۔

دن کے چار بج چکے تھے۔ بلی کا بڑا بھائی دوسا جو پتھر کاٹنے والے کرشر پر کام کرتا تھا سے چھٹی کر کے گھر آ گیا۔ تینوں ماں بیٹیوں نے دوسے کو اپنی سفاکی کی داستان سنائی اور شمائلہ کی لاش دکھائی وہ بھی بے چین ہو گیا۔ اب رات کا انتظار ہو رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی سفاکی کے تمام تر نشانات مٹا سکیں۔ مختلف تراکیب زیر غور آئیں۔ آخر کار گھر میں موجود گٹر کا کنواں سب سے مناسب طے پایا۔

ادھر شمائلہ کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ ہر طرف ڈھنڈیا پٹ رہی تھی۔ تمام گھر والے اور عزیز رشتہ دار تلاش میں سرگرداں تھے۔ اسلام پور کی مساجد میں وقفہ وقفہ سے شمائلہ کی گمشدگی کے اعلانات کئے جا رہے تھے۔ کسی بھی طرف سے کوئی خیر کی خبر نہیں لا رہا تھا۔ شمائلہ کی خبر ملتی بھی تو کیسے؟ اس کا مردہ جسم ایک کمبل میں لپٹا بلی کے گھر کے کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ شام کے سائے پھیلنے لگے اور رات کی تاریکی نے اپنے ڈیرے جمانے شروع کر دیئے تھے۔ ادھر شمائلہ کی والدہ اور والد کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ بے چینی بڑھ رہی تھی، تاحال شمائلہ کی کوئی خبر نہیں آئی۔

دوسری طرف شیرے کے گھر میں سفاکی اور درندگی کی ایک نئی داستان رقم ہونے والی تھی۔ رات کی تاریکی بھی کتنی داستانوں کو جنم دیتی ہے۔ رات کی تاریکی اب قدرے گہری ہو چکی تھی۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر

گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ شہری ہنگاموں سے دور اسلام پور کے لوگ جلدی سونے کے عادی تھے کہ صبح سویرے انہوں نے اپنے اپنے کام سرانجام دینے ہوتے۔ اب قدرے سناٹا چھا گیا تھا۔ کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رات کی خاموشی نے شیرے کے گھر والوں کے ارادے کو تقویت بخشی۔ منورہ نے گھر میں رکھا ٹوکہ اور خنجر نما چھرا نکالا جو زنگ آلود تھا۔ دوسا ٹوکہ لے کر پتھر سے تیز کرنے لگا اور بلی چھرے کو پتھر پر رگڑ رہی تھی۔

منورہ نے لاش کو برہنہ کر دیا۔ اب دوسا ٹوکے سے شمائلہ کے نازک بدن کو کاٹ رہا تھا۔ نازک ہڈیاں تھیں ایک ہی وار میں الگ ہوتی گئیں۔ ادھر بلی اور زینت چھری سے مزید حصوں کو چھوٹا کر رہی تھیں۔ دوسے نے لڑائی والا ایک کتا پال رکھا تھا جو خاصا بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ وہ بھی کبھی بھونک رہا تھا۔ منورہ نے ایک ٹکڑا کتے کے سامنے پھینک دیا۔ چند ہی لمحوں میں کتے نے گوشت کھا لیا۔ منورہ باقی حصے بھی اٹھا اٹھا کر کتے کے سامنے پھینکتی گئی۔ کتے نے خوب گوشت کھایا۔ اب کے کتے کا پیٹ بھر چکا تھا۔ بقیہ ماندہ حصوں کو گھر میں موجود گٹر کے کنویں کی سیلب کے چار انچ سوراخ سے منورہ نیچے پھینک رہی تھی۔ اس کام میں کوئی زیادہ وقت صرف نہیں ہوا، چھوٹی سی لاش تھی اور چار سفاک درندے، دوسے نے چھری، ٹوکہ، شمائلہ کے کپڑے اور تختی صحن کے ایک کونے میں گوھا کھود کر دبا دیئے۔ کنویں میں اوپر سے مٹی بھی از راہ احتیاط پھینک دی گئی تا کہ تعفن نہ پھیل پائے۔

جب غلط راستے پر انسان گامزن ہوتا ہے تو شیطان ہر لمحہ اس کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ صبح صادق سے پہلے وہ اپنا کام مکمل کر چکے تھے اور اپنے طور پر وہ اس داستان کے تمام ثبوت دفن کر چکے تھے۔

اگلے روز وہ خوش تھے کہ ان کے سیاہ کارنامے کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔ تیسرے روز انہوں نے گھر میں محلے کی خواتین کو بلوا کر ختم دلوایا اور چاولوں کی دیگ تقسیم کی۔

دوسری طرف شمائلہ کی تلاش جاری تھی۔ ہر جگہ ڈھونڈا جا رہا تھا۔ شمائلہ کی ماں اور بہنیں رو رو کر بدحال ہو چکی تھیں۔ ان بیچاروں پر قیامت گزر رہی تھی۔ شمائلہ کے تمام اعزاء و اقارب اسے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ شمائلہ کے گھر گاؤں کی خواتین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر ایک بھانت بھانت کی بولیاں بول رہا تھا۔ ہر ایک اپنے اپنے خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔ اسی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ گھر والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار چکے تھے۔ شمائلہ کے گھر اب بھی ماتم کا سا سماں تھا۔

جب کسی بھی طرح شمائلہ کی خیر کی خبر نہ آئی تو اب گاؤں کی گھاگ خواتین اس میدان میں اتر آئیں۔ ہر ایک اپنا مشورہ دے رہی تھی۔ گھر والے تو پہلے ہی حواس باختہ تھے اور تنکوں کا ہی سہی سہارا تلاش کر رہے تھے۔ لہٰذا ہر عورت کے کہنے پر کبھی اس عامل، کبھی اس بابا جی اور کبھی کسی اماں جی کے پاس جانے لگے۔ ہر ایک دُکان سجائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہر ایک مختلف کہانیاں سناتا سفید کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں لگا کر دے دیتا اور ان غریب لوگوں کو حسب مقدور لوٹتا۔ کسی نے دھونیاں دیں، کسی نے فلیتے دیئے، کسی نے کہا یہ تعویذ درخت کے ساتھ لٹکا دو جوں جوں یہ تعویذ ہلے گا تمہاری بیٹی تمہارے قریب آتی جائے گی۔ کسی نے کہا یہ تعویذ بھاری پتھر کے نیچے دبا دو تمہاری بیٹی مل جائے گی، کسی نے کالا بکرا تو کسی نے سفید مرغ تعویذات کی زکوٰۃ لے لی۔

الغرض بیچارے لٹتے ہوئے گھر کو خوب لوٹا گیا مگر تاحال شمائلہ کا سراغ نہیں ملا۔ ایک پرانی خرانٹ عورت

زیتون نے مشورہ دیا کہ فلاں جگہ بابا جی ہیں۔ وہ آئینے پر حساب کرتے ہیں اور ان کا حساب سچا ہوتا ہے۔ گمشدہ اگر زمین کی تہوں میں بھی ہو تو وہ اس کا احوال بتا دیتے ہیں۔ زیتون تو بابا جی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔ خواتین تو ویسے بھی کمزور عقیدہ کی مالک ہوتی ہیں فوراً ایسے لوگوں کی چال میں آ جاتی ہیں اور مردوں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیتی ہیں۔ شمائلہ کی والدہ نے بھی اپنے شوہر کو آخر کار بابا جی کے پاس جانے کے لئے راضی کر ہی لیا۔ اب یہ آخری امید اور کوشش تھی۔ طے یہ پایا کہ ساتھ شمائلہ کے بھائی حسن کو لے کر جانا ہے جو بمشکل آٹھ نو سال کا تھا کیونکہ بابا جی صرف نابالغ بچوں کو ہی آئینہ دکھاتے تھے۔

بروز اتوار صبح سویرے شمائلہ کے والدین تیار ہوئے، حسن کو تیار کیا اور ماسی زیتون کو خاص طور پر بلایا گیا تھا کیونکہ وہ بابا جی کی چہیتی تھی۔ الغرض یہ مختصر سا قافلہ ایک بار پھر شمائلہ کو تلاش کرنے نکل پڑا۔ اسلام پور سے پیدل سفر طے کرتے ہوئے وہ ریلوے سٹیشن فاروقیہ پہنچے۔ جہاں سے وہ ریل پر بیٹھ کر اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرین ٹھیک ساڑھے سات بجے سٹیشن پر پہنچی۔ غلام سرور نے پہلے سے چار ٹکٹ خرید لئے تھے۔ خدا خدا کر کے یہ لوگ ٹرین میں سوار ہو کر منزل کو روانہ ہو گئے۔ ٹرین ٹھیک 9 بجے حویلیاں سٹیشن پر پہنچ گئی۔ یہ لوگ نیچے اترے اور ایک تانگہ کرائے پر لے کر بابا جی کے ٹھکانے کی طرف گامزن ہو گئے۔ بیس منٹ کے ہچکولے کھانے کے بعد وہ آبادی سے دور ایک ویران سی جگہ جا اترے۔ راستے سے ذرا دور دو کچے مکان نظر آ رہے تھے۔ زیتون نے اشارہ کیا کہ وہ بابا جی کی بیٹھک ہے۔ بہت اللہ والے ہیں اسی لئے تو آبادی سے دور نکل آئے ہیں۔

خیر تین گھنٹے کی تکلیف دہ مسافت کے بعد وہ اپنی منزل تک پہنچ ہی گئے۔ جب یہ لوگ بابا جی کی بیٹھک میں پہنچے تو ان سے پہلے بھی چار پانچ خواتین اپنی حاجات کی براری کے لئے بابا جی کے پاس موجود تھیں اور بابا جی کی ''کرشمہ سازی'' سے ''فیض'' حاصل کر رہی تھیں۔ زیتون نے آگے بڑھ کر بابا جی کا ہاتھ چوما اور سلام کرنے کے بعد دور ہٹ کر مؤدب بیٹھ گئی۔ شمائلہ کی والدہ اور والد نے بھی دور سے بابا جی کو سلام کیا اور ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ان لوگوں کی باری آئی۔ زیتون نے اشارہ کیا تو شمائلہ کے والد نے بابا جی کو اپنی تمام روداد سنائی۔

بابا جی نے ایک لمبی آہ بھری اور تسبیح کے دانے تیز تیز پھیرنے لگے۔ کمرے میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ صرف انسانی سانسوں اور تسبیح کے دانوں کے گرنے کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

''بہت دیر کر دی ہے تم لوگوں نے''۔ بابا جی بڑبڑائے۔ ''لیکن خیر ہم اسے زمین کی تہوں اور آسمان کے پردوں میں ڈھونڈ لیں گے۔ مگر اب مؤکلوں کو بھینٹ زیادہ دینی پڑے گی۔ تمہاری بیٹی کی تلاش میں ہمارے غلاموں کو بہت محنت کرنا پڑے گی۔ کیا منظور ہے؟'' سناٹا ٹوٹا اور بابا جی کی گرج دار آواز گونجی۔

''سرکار ہم آپ کی ہر خدمت کریں گے، ہر فیس بھریں گے۔ بس میری بچی مجھے لوٹا دیں''۔ شمائلہ کی ماں نے دامن کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میری جھولی میں میری بچی کی خیرات ڈال دیں''۔ شمائلہ کی ماں بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور ٹپ ٹپ آنسو اس کے دامن کو تر کرنے لگے۔

''صبر کر بہن صبر کر!'' زیتون نے لقمہ دیا۔ ''ابھی سائیں جی بتا دیں گے فکر مت کرو''۔

''اچھا ٹھیک ہے، بچے کو آگے بھیجو''۔ بابا جی بولے۔ بابا جی کے لمبے بے ڈھنگے بال بڑھی ہوئی

مونچھیں، غضبناک آنکھیں بچہ تو دیکھتے ہی سہم گیا۔

حسن کا ہاتھ پکڑ کر ماں نے اٹھا کر آگے کر دیا۔ بابا جی نے ایک گول آئینہ بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''بچہ غور سے دیکھ، اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا''۔ بابا جی کی گرجدار آواز ابھری۔

حسن پہلے ہی سہما ہوا تھا، اب مزید ڈر گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا، ماں باپ کا حکم تو تھا ہی پر اب بابا جی کا حکم سخت تھا۔

دھڑا دھڑ تسبیح کے دانے گر رہے ہیں اور پھونک پر پھونک آئینے پر ماری جا رہی ہے۔

''دیکھ بچہ دیکھ کیا نظر آیا؟''

بچہ تا حال خاموش رہا۔

''بتاؤ نا حسن!'' ماں نے بیٹے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور التجا کی۔

''ہاں بچہ بتا اب تیرا گاؤں آ گیا ہے؟'' بابا جی بولے۔ سہما ہوا بچہ ہاں کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

زیتون کی تو باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ اشاروں سے غلام سرور اور ثریا کو مطمئن کر رہی تھی۔ اب شائلہ کے والدین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''ہاں بچہ! یہ دریائے ہرو ہے نا؟'' بابا جی نے پوچھا۔

حسن بولا۔ ''جی جی!''

''ابھی پتا چلتا ہے کہ کہاں پر ہے تمہاری بہن، نظریں نہیں ہٹانا غور سے دیکھنا''۔ بابا جی بولے۔

گھنٹہ ڈیڑھ دو گھنٹے بیت گئے تھے معصوم کو آئینہ دیکھتے ہوئے اب تو جو بابا جی کہتے بچہ من وعن ہاں ہاں کہہ رہا تھا۔

''اب دریا سے پار بھی ہو جا''۔ بابا جی بولے۔

''دوسرا کنارہ آ گیا ہے؟''

''ہاں جی!'' بچہ بولا۔

''یہ خیمے جھگیاں کس کی ہیں، کس کی ہیں، بول بھی گونگا ہو گیا ہے کیا، پٹھانوں کے ہیں نا؟'' بابا جی غصے سے بولے۔

بچہ تھر تھر کانپ رہا ہے۔ ''جی ہاں جی ہاں!''

''وہ دیکھ کیا ہے خیمے کے اندر؟ دیکھو بھی اندھے وہ دیکھ تیری بہن کو رضائیوں میں چھپا رکھا ہے۔ پٹھانوں نے، نظر آیا یا نہیں؟''

حسن لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جی بابا جی! بالکل جی۔''

وہ تو جان چھڑانا چاہتا تھا۔ مسلسل آئینے کو دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں اور سر میں درد ہو رہی تھی۔

ماسی زیتون تو لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ''دیکھا میں تو پہلے دن سے تم لوگوں کو کہہ رہی تھی مگر تم تو مان ہی نہیں رہے تھے۔ اب تو یقین آ گیا ہے نا۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ اللہ والے ہیں بابا جی میرے۔''

بابا جی گویا ہوئے۔ ''عمل اب ختم ہے، دیکھ تو نو میں نے آج تیری خاطر بہت سخت عمل کیا ہے۔ نہ لایا کر ایسے لوگوں کو، جن کو یقین نہ ہو''۔

''نہ بابا جی! ناراض نہ ہوں''۔ زیتون بولی۔ ''یہ لوگ تو اب دل سے آپ کے معتقد ہو گئے ہیں''۔

''بس اب تم لوگ جاؤ''۔ بابا جی بولے۔

شائلہ کے ابو کو شائلہ کی ماں نے ٹھونگا مارا تو اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا ہدیہ ہے بابا جی؟''

''پورے دس ہزار''۔ بابا جی نے اطمینان سے کہا۔

شائلہ کا والد ہکا بکا رہ گیا۔

''خیر یہ تو نو میری خاص مرید ہے۔ یہ تمہارے ساتھ آئی ہے۔ آٹھ میں کام چل جائے گا''۔ بابا جی گویا ہوئے۔

''دے دیں دے دیں جی۔ بابا جی کو ناراض نہ

کرنا''۔شائلہ کی والدہ نے غلام سرور سے کہا۔
''ہم پھر حاضری دیں گے''۔شائلہ کی والدہ بولی۔
اب یہ لوگ دن ایک بجے کے قریب وہاں سے اجازت لے کر گھر کو روانہ ہوئے۔تمام راستے تو بس زیتون ماسی بولے جارہی تھی اور بابا جی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔عصر کے وقت یہ لوگ گھر پہنچے۔اعزاء و اقارب پہلے سے انتظار میں تھے۔گھر آ کر شائلہ کی ماں نے سارا ماجرا سنایا۔مرد اور نوجوان تو جیسے پہلے سے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔فوراً تیاری کر کے، ہرو کے پار پٹھانوں کی خبر گیری کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔اب تو یہ خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔لوگ تو پہلے ہی ان کے دکھ میں شریک تھے۔الغرض جس کے ہاتھ جو لگا برچھی، کلہاڑی، ڈنڈہ لئے ان کو جاملا۔
اب یہ گاؤں سے باہر جاتے ہوئے لوگوں کا ہجوم ایک لشکر جرار کا منظر پیش کر رہا تھا۔گاؤں کی ادھیڑ عمر خواتین بھی باہر نکل آئی تھیں اور ہرو کے کنارے پر کھڑی ہوگئیں اور پٹھانوں کو کوس رہی تھیں۔دریائے ہرو کا دوسرا کنارہ گاؤں سے کوئی آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔چند سمجھدار آدمیوں نے اس طرف دریائے ہرو کے کنارے پہنچ کر ہجوم کو ترتیب دیا اور نوجوانوں کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کیا۔یہ لوگ بیک وقت چاروں طرف سے پٹھانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔کیونکہ اگر ذرا بھی غفلت برتی گئی تو پٹھان بچی کو چھپادیں گے۔
تیز رفتار نوجوانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پٹھانوں کے خیموں کو گھیر لیا۔
قلب پر گاؤں کے بزرگ لوگ تھے جو دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ان کے ساتھ بھی ڈنڈوں اور کلہاڑیوں سے لیس نوجوان موجود تھے۔میسرہ اور میمنہ پر خاص برق رفتار برچھوں اور کلہاڑیوں سے لیس نوجوان تھے جن کی عقابی نگاہیں خیموں پر گڑی ہوئی تھیں۔الغرض یوں لگ رہا تھا کہ کوئی منظم دستہ ہے جو باقاعدہ جنگ کے لئے پٹھانوں کے خیموں کی طرف بڑھ رہا ہے۔
جب دور سے پٹھانوں نے عوام کے اس سیلاب کو اپنے خیموں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔وہ فوراً خیموں سے نکل کر باہر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔خواتین اور بچے بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔وہ اسی سوچ میں غلطاں تھے کہ ان پر یہ کون سی مصیبت آن پڑی ہے۔میمنہ اور میسرہ کے نوجوان اب ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔انہوں نے دور سے یہ خیموں کا گھیراؤ کر رکھا تھا اور ڈنڈے برچھیاں اور کلہاڑیاں لہرا رہے تھے۔انہوں نے پٹھانوں کو للکارا کہ اپنی جگہ سے ہلنا مت۔وہ ابھی کوئی جواب ہی نہ دے پائے تھے کہ پشت والی کمک بھی پہنچ گئی۔قلب والا دستہ دھیرے دھیرے اب خیموں کے قریب تر ہو رہا تھا۔نوجوان بہت مشتعل تھے مگر وہ بزرگوں کا انتظار کر رہے تھے۔اب تو قلب والے بھی خیموں کے پاس جا پہنچے میمنہ اور میسرہ والے نوجوانوں نے بھی اب گھیرا تنگ کر دیا تھا۔وہ بھی خیموں کے قریب جا پہنچے۔
اتنے میں غلام سرور کے جگری دوست چاچا منظورے کی آواز بلند ہوئی۔گالی دیتے ہوئے اس نے پٹھانوں کو مخاطب کیا۔
''کہاں چھپا رکھی ہے تم لوگوں نے ہماری بچی، نکالو اسے''۔
''خدا قسم ہمارے پاس تمہارا بچی نہیں ہے''۔پٹھان مرد بیک زبان بولے۔''ہم کو بچی کا نہیں معلوم''۔
اسی تو تڑاک میں مشتعل نوجوان ڈنڈوں سے پٹھانوں پر ٹوٹ پڑے کوئی لاتیں تو گھونسے مار رہا تھا۔کچھ لوگ نوجوانوں کو پرے دھکیل کر بیچ بچاؤ کر رہے تھے۔پٹھانوں کی خواتین اور بچے ایک طرف سہمے

کھڑے تھے۔ پٹھانوں کے کتے بھونک رہے تھے مگر جلد ہی نوجوانوں کے ڈنڈوں نے ان کو دور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ خیموں میں کچھ لوگ گھس گئے اور خیموں میں نیچے کی زمین اوپر کر کے رکھ دی تھی۔ ہر چیز کو ٹٹولا جا رہا تھا۔ قریب لگے گندم کے ڈھیر کو بھی چھان مارا مگر شائلہ نہ ملی۔ ملتی بھی تو کیسے، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا ان بیچارے پٹھانوں کو بھی۔

''ان لوگوں نے بچی کو راتوں رات علاقہ غیر میں پہنچا دیا ہو گا''۔ ایک گرج دار آواز ابھری۔ ''ان کے خلاف قانونی کارروائی ہو گی تب یہ بتائیں گے''۔

اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ تھا، شائلہ کی والدہ زیتون کے ہمراہ کنارے پر کھڑی گاؤں کی دوسری خواتین کے ساتھ انتظار میں تھی کہ ابھی اس کے دل کا ٹکڑا مل جائے گا۔ جب یہ ہجوم واپس پہنچا تو مغرب ہو چکی تھی۔ تمام لوگ مایوس ہو کر گھروں کو چل دیئے۔ شائلہ کی والدہ اور والد بھی گھر کو روانہ ہو گئے۔ جب یہ ہجوم نظروں سے اوجھل ہوا تو بیچارے پٹھانوں کی جان میں جان آئی۔

وقت کے دھارے کو کون روک سکتا ہے۔ ازل سے لکھی تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ شائلہ کو غائب ہوئے بیس روز گزر چکے تھے۔ شائلہ کے گھر اب بھی ماتم کا سا سماں تھا۔ گاؤں کی خواتین کا اب تک تانتا بندھا ہوا تھا۔ آئے دن سورہ یٰسین کا ختم پڑھنے خواتین بیٹھ جاتیں کچھ کھجور کی گٹھلیاں لئے ورد اوراد کرتیں۔ بلی بھی از راہ ہمدردی شائلہ کے گھر ہر تیسرے چوتھے روز جاتی۔ یٰسین شریف کے ختم میں حصہ لیتی اور ساتھ ساتھ سن گن بھی لیتی رہتی۔

بلی کیا تھی قدرت کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھی۔ سرخ و سپید رنگ کی مالک تھی۔ چال تو قیامت کی تھی۔ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ وہ حسن و جمال

میں یگانہ تھی۔ دنیا میں ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر ہوتا ہے۔ اس کے والدین کی تربیت اسے اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔ بلی کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی ہوا۔ بلی کا باپ شیرا جو فوت ہو چکا تھا۔ شروع سے ہی غلط راستوں کا راہی تھا۔ شراب کا عادی تھا۔ غریب تو تھا ہی چنانچہ اس نے اپنی اس عادت کو پورا کرنے کے لئے آسان حل نکال لیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنی ضرورت کے لئے شراب کشید کر لیتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس نے اسی کام کو بطور کاروبار شروع کیا تھا۔ یوں اس کا کاروبار چل پڑا۔ بیوی بچے بھی اسی کام میں طاق ہو چکے تھے۔ شیرے کو متعدد بار پولیس پکڑ بھی چکی تھی مگر ہر بار دے دلا کر وہ چھوٹ جاتا تھا۔ یوں شیرے کا تھانے میں آنا جانا لگا رہتا۔ آخر بڑھاپے اور پولیس کی مار نے رنگ دکھایا۔ اندر سے تو وہ پہلے ہی شراب نوشی سے چھلنی ہو چکا تھا۔ جلد ہی اس دنیا کو چھوڑ گیا۔ شیرے کے لواحقین میں ایک بیوہ، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

جب سے بلی نے قد کاٹھ نکالا تھا اس نے باپ کے دھندے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہے تھے۔ ترقی کیوں نہ ہوتی اب تو شراب کے ساتھ ساتھ شباب کی آمیزش بھی شامل تھی۔ بلی اپنی دلفریب اداؤں سے لوٹنے کا کام خوب کرتی تھی۔ چھوٹی زینت تھی تو کوتاہ قد مگر حسن و جمال میں وہ بھی یگانہ تھی اور اپنے کام میں ماہر تھی۔

مے نوشوں میں تو اس کا مقام تھا ہی مقامی پولیس والوں میں بھی چند اس کے مرید خاص تھے۔ اسی لئے وہ بے دھڑک دھندہ چلا رہی تھی۔ وہ بھی گاہے بگاہے بلی کے مہمان بنتے رہتے تھے اور اپنے من کی آگ بجھاتے۔ بلی مختار کل تھی گھر یا باہر میں۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ زندگی کی ہر آسائش بلی کے اشارے کی منتظر ہوتی۔ الغرض دولت اور غرور کے نشے میں وہ چُور تھی کہ قدرت کی گرفت کی گھڑی آن پہنچی اور انہوں نے معصوم شمائلہ کا قتل کر ڈالا۔

شمائلہ کو گم ہوئے پچیس دن گزر چکے تھے۔ متعلقہ چوکی میں گمشدگی کی رپٹ درج ہو چکی تھی۔ چند روز پہلے نیا چوکی انچارج سجاول شاہ تعینات ہوا تھا۔ بندہ وہ ایماندار تھا، اپنے پیشے کے ساتھ مخلص تھا۔ شاہ صاحب نے اس واقعہ کو بطور چیلنج قبول کیا اور خفیہ طور پر اپنی تحقیقات کو آگے بڑھانے لگا۔ شاہ جی کو کسی طرح شمائلہ کے قتل کی بھنک پڑ گئی۔ بلی کے چاہنے والے چوکی پر بھی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے ہر طرح سے غور کیا تو اس کو بلی کے گھر پر شک ہو گیا۔ بلی کو اطلاع مل گئی کہ ان کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ گرفتاری کا خوف ان کو دامن گیر ہوا۔ یوں انہوں نے اسلام پور کو الوداع کہنے کا منصوبہ بنایا۔ دوسری وجہ گاؤں چھوڑنے کی یہ بھی تھی کہ جس رات سے انہوں نے سفاکی سے شمائلہ کو قتل کر کے ٹھکانے لگایا تھا اس وقت سے کسی پل بھی بلی اور اس کے گھر والے سکون سے نہ سو سکے تھے۔ وہ سو بھی کیسے سکتے تھے۔ ہر روز مغرب کے بعد ان لوگوں کو شمائلہ کی دلخراش چیخیں سنائی دیتیں۔ یہ دراصل ان کا ضمیر تھا جو ان کو ایک پل بھی آرام نہ کرنے دیتا۔ ان کے اعصاب پہلے ہی مضمحل تھے کہ گرفتاری کی خبر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جاتے بھی تو کہاں جاتے ان کا کوئی آگے تھا نہ پیچھے۔ محض چند دُور پرے کے گاؤں میں رشتہ دار تھے جو ان کے سیاہ کرتوتوں کی وجہ سے پہلے ہی لاتعلق ہو چکے تھے۔ گاؤں سے باہر ان کا کوئی خاص جاننے والا نہ تھا۔ اس کام میں بلی کے دیرینہ عاشق صادق یونس نے ذمہ داری نبھائی جو بظاہر بلی کے بھائی دوسے کا دوست تھا مگر حقیقت میں دل و جان سے بلی کو چاہتا تھا۔

یونس بذات خود ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ کنبے برادری والا تھا۔ والدین نے پچیس سال کی عمر میں شادی

کر دی تھی۔ کام وہ راج گیری کا کرتا تھا۔ اس کا بھائی ٹھیکیدار تھا یہ اپنے بھائی کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ جلد ہی اللہ تعالیٰ نے یونس کو ایک بیٹا اور دو بیٹیاں عطا کر دیں مگر یونس نے کبھی دل سے اس شادی کو قبول نہ کیا تھا۔ وہ تو بس بلی کے عشق میں گرفتار تھا اور اپنی دھن دولت اور شباب اسی کی نذر کر رہا تھا۔ اب یہ اچھا موقع تھا کہ وہ بلی کو اپنے احسانات سے مات دیتا۔

راتوں رات سامان گاڑی میں لوڈ ہوا۔ یوں یونس کی وساطت سے بلی کا خاندان قریبی صوبے خیبر پختونخوا کے گاؤں خانپور کے راجہ کی امان میں پہنچ گیا۔

راجہ واقعی راجہ تھا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ورثے میں مربعوں زمین، حویلیاں، باغات اور کرشر پلانٹ پائے۔ والدین نے بڑی چاہت سے شادی کرائی مگر تین سال تک اولاد کی نعمت سے محروم رہا۔ آخر جائیداد کا وارث بھی چاہئے تھا تو راجہ جی کی دوسری شادی کرا دی گئی۔ چھوٹی رانی بے مثال حسن کی مالک تھی مگر راجہ تو شراب و شباب کا رسیا تھا۔ ہر روز وہ نئے شکار کا عادی تھا۔ عیاشی کے تمام لوازمات اسے دستیاب تھے۔ دو سال بعد چھوٹی رانی امید سے ہوگئیں۔

جب یہ مختصر سا خاندان علی الصبح راجہ جی کے پاس پہنچا تو راجہ نے ان کو الگ ایک مکان دے دیا۔ اس کے پاس کون سی کمی تھی۔ نوکر چاکر اور نوکرانیوں کی افراط تھی۔ راجہ کے تو پہلے سے بن معاوضہ کئی ملازم تھے۔ اب یہ لوگ بھی شامل ہوگئے۔

بلی کے بھائی کو سٹون کرشر پر کام کے لئے بھیج دیا گیا کیونکہ اسے کام کا پہلے سے کچھ تجربہ تھا۔ خواتین کے لئے حکم تھا کہ وہ صبح سویرے راجہ جی کی حویلی جا کر کام کاج کریں۔ تینوں ماں بیٹیاں علی الصبح ہی حویلی پہنچ جاتیں اور حویلی کے کام کاج میں مشغول ہو جاتیں۔ بلی خاص طور پر چھوٹی رانی کی خدمت کرتی۔ ان کے بال سنوارتی، پاؤں دباتی اور جھاڑو مانجا لگاتی۔ بس اب ان کا ہر روز یہی معمول تھا۔ دو سا صبح سے شام تک کرشر پر کام کرتا اور خواتین دن بھر حویلی میں معروف کار رہتیں۔ بلی نے دو تین روز میں چھوٹی رانی کے دل کو مولیا اور وہ اس کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ گھنٹوں میٹھی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

جون کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گرمی اپنا زور دکھا رہی تھی۔ بلی دھوپ کی تپش تیز ہونے س پہلے ہی حویلی کے صحن کو صاف کرنا چاہتی تھی تاکہ بقیہ وقت رانی کے پاس ائر کنڈیشن کمرے میں گزارا جائے۔

کام کے دوران بلی کا دوپٹہ بار بار سر سے سرک رہا تھا۔ بلی نے اسے اپنے سر کے گرد پٹی کی طرح گھما کر دو پلو شانوں سے گرا دیئے اور جھاڑو لگانے لگی۔ گرمی کی وجہ سے بلی کا چہرہ پسینہ سے تر اور سرخ تھا۔

اس روز خلاف توقع راجہ جی حویلی تشریف لے آئے۔ راجہ جی تھے تو پچاس کے لگ بھگ مگر امنگیں جوان تھیں۔ ویسے بھی بلی کا بے پردہ بدن تو دعوت دے رہا تھا۔ راجہ جی نے جونہی بیرونی دروازے سے قدم رنجہ فرمایا تو کھڑے دیکھتے ہی رہ گئے۔ آج پہلی دفعہ راجہ جی نے بلی کو دیکھا تھا۔ راجہ جی کی نظریں بلی کے کھلے بالوں پر پڑیں اور جلد ہی گلاب چہرے سے پھسلتی ہوئی بلی کے بدن کا طواف لگانے لگیں۔ راجہ جی تو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ گیا۔

قدرت نے عورت کو بہت زیادہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ عورت کی طرف ہر غلط نظر اٹھتے ہی اس کا سکیورٹی سسٹم متحرک ہو جاتا ہے اور وہ اپنا بچاؤ کر لیتی ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ راجہ کو اپنے حسن کے جلوے کا دیدار کرانے کے بعد بلی بھاگ کر کمرے میں جا پہنچی اور چھوٹی رانی کو راجہ کے آنے کی اطلاع دی۔ بھاگتے ہوئے بلی کا لچکتا جسم راجہ جی پر اور ہی

قیامت ڈھا گیا۔ راجہ جی جلدی جلدی ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر دل و دماغ عجب کشمکش میں تھا کہ یہ نازک اندام کلی اب تک کیسے اس کی دسترس سے دور رہی ہے۔

''راجہ جی آئے ہیں''۔ چھوٹی رانی کی آواز بلند ہوئی۔ ''بلی ذرا ان کے لئے صندل کا شربت بنالا''۔

''جی ابھی لائی چھوٹی رانی!'' بلی نے لوچ دار آواز میں کہا۔

بلی جام پلانے میں ماہر تھی۔ یہ تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا، فوراً شربت تیار کر کے ٹرے میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں آ پہنچی۔

اب تو بلی نے دوپٹہ سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ راجہ نے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بلی نے مزید ایک گلاس آگے بڑھ کر راجہ جی کو تھما دیا وہ دوسرا گلاس بھی پی گیا۔ بلی تو چہرہ شناس تھی۔ وہ فوراً راجہ جی کے ارادوں کو بھانپ گئی۔ لہٰذا جلد ہی وہ راجہ جی کے قریب ہو گئی۔ اب تو راجہ جی بلاناغہ حویلی تشریف لاتے۔ بلی کے ہاتھوں کی چائے اور کبھی شربت پیتے۔ راجہ جی موقع کی تلاش میں تھے کہ کسی طرح بہتی گنگا میں نہائیں۔

ادھر چھوٹی رانی جواب امید سے تھیں، وہ بھی خوش تھی کہ راجہ جی اب بلاناغہ اس کے پاس آ کر گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ ایک دن صبح صبح ہی چھوٹی رانی کے بھائی کے انتقال کی خبر حویلی میں پہنچ گئی۔ چھوٹی رانی مسلسل رو رہی تھی کیونکہ وہ ان چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ جلد ہی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ چھوٹی رانی کے ہمراہ بلی بھی تیار ہو گئی۔ باقی بھی کافی سارے لوگ قافلہ کی صورت میں راجہ کے ہمراہ راجہ کے سسرالی گاؤں جا پہنچے۔ گاؤں تھوڑا دور تھا۔ تمام لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔ کفن دفن سے فارغ ہو کر راجہ نے واپسی کی راہ لی۔ چھوٹی رانی نے تو اب چالیسویں تک اپنے میکے میں رہنا تھا۔ بس بلی راجہ جی کے ہمراہ واپس آ گئی۔ راجہ نے حکم دیا کہ جب تک چھوٹی رانی گھر واپس نہیں آتی بلی حویلی میں ہی رہے گی۔ یہی بات تو بلی اور اس کے گھر والے بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح راجہ کے دل میں گھر کر لیں۔

وہ راجہ جی کے جشن کی رات تھی۔ راجہ جی نے ولایتی شراب کی بوتلیں الماری سے نکالیں اور بلی کو جام تیار کرنے کو کہا۔ بلی تو ایک ماہر ساقی تھی۔ اس نے اپنے تمام جوہر دکھائے۔ اب تو یہ ہر روز کا معمول تھا۔ بلی حُسن و جمال میں یگانہ تھی مگر انسان کی بھی عجیب فطرت ہے۔ وہ ایک ہی چیز سے جلد اکتا جاتا ہے۔ لہٰذا راجہ جی ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے کبھی کبھی چھوٹی زینت کو بھی طلب کر لیتے تھے۔ وقت کو تو جیسے پر لگ گئے ہوں۔ راجہ کو تمام تر عیاشی میسر تھی تو بلی کے خاندان کو ایک مضبوط پناہ گاہ۔

جب بلی کا خاندان یوں چوری چھپے گاؤں چھوڑ کر اچانک غائب ہوا تو لوگوں کو شک گزرنے لگا۔ ادھر پولیس نے بھی اپنا کام تیز تر کر دیا تھا۔ مگر مجبوری تھی کہ کون ان لوگوں تک رسائی حاصل کرے۔ اور پولیس بغیر ثبوت کے ان کو دوسرے ضلع سے گرفتار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ راجہ بااثر آدمی تھا، وہ اتنی آسانی سے کیسے ہاتھ لگے شکار کو پولیس کے حوالے کرتا۔

شائلہ کی گمشدگی کو پورے دو ماہ گزر چکے تھے۔ چوکی انچارج اسلام پور آیا تھا۔ گاؤں کے وڈیرے کے ڈیرے پر بیٹھ کر گھنٹوں مشاورت جاری رہی۔ آخرکار غلام سرور کے ایک جگری یار منظور راجہ نے حامی بھر لی کہ وہ دوسے کو راجہ سے لے کر آئے گا۔ منظور اگلے روز صبح سویرے اللہ کا نام لے کر روانہ ہو گیا۔ راجہ کے ساتھ منظور کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ راجہ نے منظور کی خوب آؤ بھگت کی کیونکہ راجہ شکار کا شوقین تھا۔ منظور بھی

شکار کا شوقین تھا اور اکثر اپنے کتے لے کر راجہ کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا۔ منظور نے راجہ کو دوسے کے متعلق بتایا کہ ہمارے گاؤں سے یہ لوگ تمہارے پاس آ گئے ہیں۔ گاؤں میں بچی گم ہوئی ہے۔ پولیس اور گاؤں والے ان لوگوں پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا دوسے کو میرے ساتھ بھجوا دیں تاکہ وہ اپنی بے گناہی پولیس کے سامنے ثابت کر سکے اور میرا یہ وعدہ ہے کہ اگر یہ لوگ بے گناہ ہوئے تو میں اسے واپس تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔

راجہ رضامند ہو گیا کیونکہ یہ سیدھا سیدھا قتل کا معاملہ تھا۔ راجہ خواہ مخواہ اپنے گلے نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

منظور سہ پہر تک بلی کے بھائی دوسے کو لے کر واپس گاؤں پہنچ گیا۔ ان تمام ترباتوں سے بلی اور اس کی بہن اور والدہ لاعلم تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ دوسا کہاں گیا ہے۔ رات گئے تک دوسا واپس نہ آیا خیر یہ اس کا معمول تھا۔ وہ کبھی کبھی رات کرشر پلانٹ پر ہی گزار دیتا تھا۔

چار بجے کے قریب پولیس کی گاڑی چوک میں آ کر رکی اور سجاول شاہ سیدھا ڈیرے کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ جہاں دوسا پہلے سے موجود تھا۔ پولیس والے دوسے کو لے کر چوکی روانہ ہو گئے۔

دوسا درمیانے قد اور مضبوط سڈول جسم کا مالک تھا۔ پتھروں کو توڑتے توڑتے وہ خود بھی پتھر بن گیا تھا۔ پولیس چوکی پر جانا آنا اس کا آبائی پیشہ تھا۔ مگر آج اس کے دل میں خدشات اور وساوس جگہ کیے ہوئے تھے۔

چوکی پر پہنچ کر سجاول شاہ دوسے کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے پیار سے شائلہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ دوسا مگرمچھ کے آنسو بہاتا رہا اور مسلسل انکار کرتا رہا۔ اب تو سجاول شاہ کا بھی پارہ چڑھ گیا تھا۔ اس نے دو ملازموں کو آواز دی اور دوسے کی چھترول شروع کرا دی۔ دوسے کو اوندھے منہ لکڑی کے بنچ پر لٹا کر قمیص اتار دی گئی اور پولیس والے اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو مضبوطی سے باندھ چکے تھے۔ اب ماہر چھترول نے دوسے کی چھترول شروع کر دی۔ آدھ گھنٹے میں دوسے کی کھال ادھڑ چکی تھی مگر بلا کا جگرا تھا دوسے کا۔ پتھر بولتا پر دوسا منہ سے نہ بولا۔ ایک لفظ تک اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اب اسے الٹا لٹکا کر پوچھ گچھ شروع ہو گئی لیکن اب بھی پولیس کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

سجاول شاہ بے چین تھا وہ جلد از جلد ملزم کا اقرار سننا چاہتا تھا۔ اب اس نے ایک ملازم کو چولہے پر توا گرم کرنے کو کہا۔ دوسا اب مار کھا کھا کر بدحال ہو چکا تھا۔ یقیناً اب اس میں مزید برداشت کی سکت نہ تھی۔ جب توا خوب گرم ہوا تو دوسے کو ملازمین بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر چولہے کے پاس لے آئے۔ اب وہ اس کی شلوار اتار کر توے پر بٹھانا چاہتے تھے۔ گرم توے کو دیکھتے ہی دوسے کا دل دہل گیا۔

''پوچھو کیا پوچھنا ہے تھانیدار صاحب!'' دوسا کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں بتاتا ہو، صاحب جی! میں سچ سچ بتاتا ہوں''۔

''ٹھہر جاؤ''۔ سجاول شاہ نے حکم دیا۔ ''اسے میرے پاس کمرے میں لے آؤ''۔

ملازم دوسے کو کمرے میں لے آئے۔ اب اسے زمین پر سجاول شاہ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ ''ہاں، بول کہاں گئی ہے وہ لڑکی؟'' سجاول شاہ نے پوچھا۔

''دوسے نے تمام تر روئیداد سنائی اور قتل کی تمام تر تفصیلات بتائیں۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ پولیس کی گاڑی چوک میں آ رکی۔ لوگ جھٹ سے اردگرد جمع ہو گئے۔ دو پولیس والوں نے دوسے کو بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ اسے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسے کو سیدھا اس کے گھر حراست میں لے

جایا گیا۔ دوسے نے گھر میں دفن چھری، ٹوکہ، شمائلہ کے کپڑے اور تختی نکال کر دی۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ تمام تر آلات قتل کی برآمدی گاؤں کے لوگوں کی موجودگی میں ہوئی۔ اب تو ہر زبان پر شمائلہ کا ایک بار پھر تذکرہ تھا۔ غلام سرور کے گھر میں اب تو باقاعدہ ماتم ہو رہا تھا۔

رات کو سجاول شجاہ نے بقیہ معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔ اگلے روز پھر سجاول شاہ ہمراہ کانسٹیبلان اسلام پور پہنچ گیا۔ لوگ دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔ شمائلہ کے والد کو بھی بلا لیا گیا۔ تمام لوگوں کی موجودگی میں شیرے کے گھر کے کٹر والا کنواں کھولا گیا۔ گھپ اندھیرا اور بدبو بھی کنویں میں نیچے کون اترتا۔ جوان آخر جوان ہوتے ہیں اور وہ بھی گاؤں کے حمید اور اختر دونوں جھٹ سے تیار ہو گئے ان کو رسے کے ذریعے نیچے اتارا گیا۔ انہوں نے مٹی کو ہٹانا شروع کیا مگر بدبو کی وجہ سے زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے اور ان کا دماغ چکرانے لگا۔ ان کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ اب جمعہ نامی جوان تیار ہو کر نیچے اترا بلا کا بہادر نوجوان تھا۔ اس نے نیچے اتر کر ٹٹولنا شروع کر دیا۔ کافی دیر کے بعد اس کے ہاتھ ٹانگ کی ہڈیاں آئیں جنہیں ڈول میں باہر نکال لیا گیا۔ ہر ایک خوف زدہ تھا۔ شمائلہ کے والد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ دو تین گھنٹے کی تگ و دو کے بعد چند اعضاء شمائلہ کے جسم کے باہر نکال لئے گئے۔ بس یہی شمائلہ تھی جسے سفید کپڑے میں لپیٹا گیا اور گاؤں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ ہر آنکھ پرنم تھی اور لوگ ببلی اور اس کے گھر والوں کو کوس رہے تھے۔

سجاول شاہ نے تمام قانونی تقاضے پورے کر لئے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے سجاول شاہ متعلقہ ایس ایچ او کے ہمراہ خانپور تھانے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں کے متعلقہ انچارج کو ساتھ لیا اور تمام تر نفری کے ہمراہ راجہ جی کی حویلی جا پہنچے۔ ابتدائی تعارف کے بعد راجہ کو تمام روداد سنائی گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا راجہ نے بادل ناخواستہ ببلی اور اس کی ماں اور بہن کو پولیس کے حوالے کیا۔ ببلی کے تو ہوش اڑ چکے تھے۔

ببلی اور اس کے خاندان والے متعلقہ چوکی پر پہنچ چکے تھے۔ پوچھ گچھ تو مزید کرنی تھی۔ آج ببلی کا غرور خاک میں مل چکا تھا۔ ببلی جو کسی ایرے غیرے کو منہ نہ لگاتی تھی، بے بسی کی علامت بنی بیٹھی تھی۔ تین روز کا ریمانڈ تھا ان لوگوں کا۔ ریمانڈ تو برائے نام تھا اس میں چوکی پر موجود ملازمین کی دن رات خوب گزر رہی تھی۔ منورہ بیگم تو بوڑھی ہو چکی تھی مگر ببلی اور زینت دونوں کافی تھیں۔

مقدمہ چلتا رہا تاریخیں بدلتی رہیں۔ ببلی اور اس کے خاندان کا چالان کر کے جیل منتقل کر دیا گیا تھا۔ یونس نے خوب وفاداری نبھائی تھی۔ ہر تاریخ پر ملنے جایا کرتا تھا اور کیس کی پیروی کرتا رہا۔ جیل میں بھی ملاقات کے لئے جایا کرتا تھا۔

جیل میں ببلی کو پہلے دن ہی جیلر کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ جیلر نے بہتی گنگا میں خوب غوطے لگائے پھر جیلر سے لے کر عام ملازم تک نے ببلی اور زینت کے حسن کے نظارے کئے اور اپنا اپنا حصہ وصول کیا۔

مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا۔ انصاف تو عدالتی نظام میں عنقا ہے۔ ہر چیز برآمد ہونے اور ملزموں کے اقرار کے باوجود عدالت گواہیاں طلب کر رہی تھی۔ گواہی کون دیتا، کس کے سامنے انہوں نے یہ گھناؤنا کام کیا تھا۔ گواہ تو صرف قاتل خود تھے۔

تاریخیں بدلتی رہیں مگر شمائلہ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچایا گیا تھا۔ بلکہ ببلی کے بھائی دوسے کو تو ابتدا سے ہی جیل سے رہائی مل گئی تھی۔ وہ دوبارہ راجہ کے پاس چلا گیا تھا کیونکہ گاؤں تو اب پورے

کا پورا ان کا دشمن تھا۔ ان کا مکان بوسیدگی کی وجہ سے گر گیا تھا۔ اب صرف وہی ایک ٹھکانہ تھا سر کو چھپانے کا۔ اب راجہ بھی گاہے بگاہے ملاقات کے لئے دوسے کے ہمراہ چلا جاتا اور بلی اور زینت کو دلاسا دیتا اور ان کی جلد رہائی کا ان کو مژدہ سناتا۔

جب زمین پر منصفوں نے انصاف کے تقاضے پورے نہ کئے تو شمائلہ کے والدین کی دعائیں رنگ لائیں۔ ظالموں کی گرفت کی گھڑی آن پہنچی تھیں بلی کے خاندان کا اب منطقی انجام ہونا تھا۔

جیل میں تین سال بیت چکے تھے۔ بلی کی والدہ منورہ بیگم کافی نحیف ہوگئی تھی، اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ اسے جیل کے ہسپتال میں زیر علاج رکھا گیا مگر افاقہ ندارد آخر کار ڈاکٹروں نے اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے منتقل کر دیا۔ انتہائی قابل رحم حالت تھی اس بڑھیا کی مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں چھ ماہ گزارنے کے بعد اس دنیا فانی سے چلی گئی اور اپنے سیاہ کارناموں کی بھاری گٹھڑی ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئی۔

وقت کا پہیہ اپنی روانی سے گھومتا رہا۔ پانچ سال بعد زینت کی رہائی عمل میں لائی گئی۔ جیل سے خلاصی پانے کے بعد کوئی ٹھکانہ تو تھا نہیں مجبوراً دوسا اپنی بہن کو اپنے پاس راجہ جی کی پناہ میں لے گیا۔ زینت تو اب راجہ کی رکھیل بن کر رہ گئی۔ دن رات راجہ اور اس کے مصاحبوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی۔ قدرت نے بھی شمائلہ کا بدلہ بہت عجیب انداز میں اس خاندان سے لیا۔

دوسا جو کہ کرشر پلانٹ کا ماہر سمجھا جاتا تھا، راجہ کے کرشر پر انچارج تھا۔ ایک دن وہ معمول کی چیکنگ کر رہا تھا، چیکنگ کے دوران اس نے کرشر کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ کبھی کنویئر کو تو کبھی الیکٹرک موٹروں کو۔ کرشر حسب معمول چل رہا تھا۔ کان پڑی آواز وہاں نہیں سنی جا سکتی۔ گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ ڈمپر دھڑا دھڑ پتھر لا لا کر اس کرشر میں ڈال رہے تھے۔ دوسا قدرے جھک کر معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ سیدھا بڑے بڑے پتھروں کے ہمراہ کرشر کے منہ میں جا پہنچا۔ دور سے ایک ہیلپر نے دوسے کو گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ چیخ و پکار کر رہا تھا مگر یہاں کسی کو کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بھاگم بھاگ کنٹرول روم پہنچا اور اس نے ایمرجنسی بٹن دبا کر کرشر کو بند کر دیا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ کرشیر کے رکنے تک دوسا کے جسم کی بوٹیاں اور قیمہ بن چکا تھا۔ تمام مزدور بھاگم بھاگ وہاں پر پہنچے بڑی مشکل سے دوسے کے جسم کے مختلف اعضاء اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو کنویئروں سے ڈھونڈ کر اتارا گیا۔ مگر یہ کل جسم کا صرف دسواں حصہ بھی نہ تھا۔ راجہ کو موبائل فون پر اطلاع دی گئی۔ وہ بھی وہاں پر آن پہنچا۔ دوسے کی ہڈیوں اور بوٹیوں کو سفید کفن میں لپیٹ کر دفنا دیا گیا۔ اسی دوسے نے معصوم شمائلہ کے جسم کے ٹکڑے چھرے اور ٹوکے سے کئے تھے۔ قدرت نے اس کی بھی وہی حالت کر دی۔

بھائی کی موت کی خبر جیل میں بلی تک پہنچ چکی تھی اور اسے رہ رہ کر شمائلہ اور اس کے جسم کے ٹکڑے یاد آ رہے تھے۔ شمائلہ کی دلدوز چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سوائے کف افسوس ملنے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ آج کوئی اس کا مونس اور غمخوار نہ تھا۔ ماں تو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ اب بھائی نے بھی سزا پالی تھی۔ تمام رات بلی نے آنکھوں میں گزار دی۔ رات بھر وہ آنسو بہاتی رہی اور افسوس کرتی رہی۔

ماں کی موت اور بھائی کے انجام نے زینت پر گہرا اثر ڈالا۔ اب وہ ہر چیز سے بے زار ہوگئی تھی۔ اس کا من کسی بھی کام میں نہ لگتا تھا۔ اس نے جی بھر کے شراب

کے جام حلق میں اتارے تھے۔ اب غم کو بھلانے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔ اب وہ اس دنیا سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ دن چڑھے تک وہ بستر پر دراز رہی۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ دس بجے کے قریب اس نے نہادھو کر نئے کپڑے پہنے اور حویلی سے نکل پڑی۔

حویلی میں ہر ایک اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر تک نہ تھی۔ اس کے دکھ کو کون جانتا۔ کون اس کی غمخواری کرتا۔ کسی کا زینت کی طرف دھیان تک نہ گیا۔

زینت اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ دریائے ہرو کے کنارے جا پہنچی۔ آج اسے اپنے ماں باپ بھائی اور بہن رہ رہ کر یاد آرہے تھے۔ رہ رہ کر اسے شمائلہ کی یاد آرہی تھی اور خود سے ہم کلام تھی۔

کاش کاش میں بلی کو روک لیتی۔

کاش اس معصوم کا قتل ہم لوگ نہ کرتے۔

کتنا بھرا بھرا ہمارا گھر تھا۔ کس چیز کی کمی تھی ہمیں۔

کاش وہ سونے کی بالیاں ہم نہ اتارتیں۔ میں بہن کا ہاتھ روک لیتی۔ شور مچاتی اور وہ بچی ہمارے ظلم سے بچ جاتی۔

موسم برسات کا تھا، دریا میں طغیانی تھی۔ پانی کے بھنور بن رہے تھے۔ زمینیں کٹ کٹ کر دریا کی نذر ہو رہی تھیں۔ کیا خونی منظر پیش کر رہا تھا دریائے ہرو۔ زینت اچانک اٹھی اور دریا میں کود گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریائی لہروں کی نذر ہوگئی۔ چند بار وہ اوپر نیچے ہوئی اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شام کو راجہ جی نے زینت کے بارے میں حویلی میں موجود لوگوں سے دریافت کیا مگر اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

دریائے ہرو اسلام پور کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ برسات میں اکثر لوگ دریا کے کنارے نظارے کے لئے آجاتے ہیں۔ کچھ تو بہتی ہوئی چیزوں کے لالچ میں اپنے آپ کو دریائی لہروں سے الجھا بھی دیتے ہیں اور آخرکار اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کچھ نوجوان تو باقاعدہ طغیانی میں شرطیں باندھ کر دوسرے کنارے تک تیر کر جاتے ہیں اور پھر واپس بھی آتے ہیں۔ یہ موج مستی جاری تھی کہ اچانک کوئی چلایا۔ وہ دیکھو کیا جا رہا ہے۔ سب کی نظریں اسی جانب اٹھ گئیں۔ چند ایک نے شک ظاہر کیا کہ یہ کوئی لاش ہے۔ چند ماہر تیراک آن کی آن میں تیر کر لاش تک جا پہنچے۔ انہوں نے لاش کو پکڑ لیا اور خاص انداز میں اسے پانی پر دھکیلتے دھکیلتے کنارے تک لے آئے۔ یہ تو کسی عورت کی لاش تھی۔ مسلسل دو روز تک پانی میں رہنے کی وجہ سے گوشت گل چکا تھا۔ پیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جسم پر کپڑے نام کی کوئی چیز باقی نہ تھی۔ مختلف حصے جسم کے زخمی تھے۔ لاش کو کنارے پر پہنچا کر اوپر پردہ ڈال دیا گیا۔ گاؤں کی خواتین بھی جمع ہوگئی تھیں۔ چارپائی لائی گئی اور لاش کو چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ پورے گاؤں میں لاش کی خبر پہنچ گئی تھی۔ اس لئے ہر ایک کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ خواتین لاش والی چارپائی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ زینت کی رشتہ دار خواتین نے اسے پہچان لیا تھا۔ ہر ایک ان کے اس انجام کو دیکھ کر لرز رہا تھا۔ گاؤں والوں نے ازراہ ہمدردی اسے کفن پہنایا اور گاؤں کے قبرستان میں ہی اسے دفن کر دیا۔

سال لمحوں کی طرح بیت چکے تھے۔ بلی کو جیل پہنچے پندرہ سال بیت چکے تھے۔ 2007ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ بلی کی تمام تر جوانی جیل کی سلاخوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اب تو وہ لڑکی سے عورت نظر آرہی تھی۔ بالوں کا سنہری رنگ سفیدی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گالوں اور ہونٹوں کی سرخی ماند پڑ گئی تھی۔ جوانی کی بہاریں بھنوروں نے لوٹ لی تھیں۔ جسم موٹاپے کا شکار ہو چکا تھا۔ بن اولاد کے دس

بچوں کی ماں نظر آ رہی تھی۔ بدن کا جوڑ جوڑ درد میں مبتلا تھا۔

لوگوں نے تو مال مفت دل بے رحم کی طرح اس کو لوٹا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے فسچولا کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ہر وقت اس کا پیشاب ٹپکتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا بدن اور کپڑے بدبودار ہوتے تھے۔ کوئی اسے اپنے پاس بٹھانے کو تیار نہ ہوتا۔ بس ایک کونے میں پڑی رہتی تھی۔ اس حالت میں ببلی کو رہائی کا پروانہ مل گیا۔

دنیا میں اس کا اپنا تو کوئی عزیز رشتہ دار تھا ہی نہیں آ بس صرف ایک یونس ہی تھا جو اس کی خبر گیری کرتا تھا۔ یونس ببلی کو لے کر سیدھا راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ ببلی کا کوئی اور ٹھکانہ تو تھا ہی نہیں۔ اس لئے وہ جیل سے رہائی کے بعد چپ چاپ یونس کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ اب یونس کی سابقہ بیوی سے اولاد جوان ہو گئی تھی اور وہ یونس کا بار بار جیل میں ببلی کو ملنا ناپسند کرتے تھے۔ اسی کشمکش میں یونس اپنی سابقہ بیوی اور بچوں سے دور ہو گیا۔ یونس کے بڑے بیٹے نے نشہ کی عادت اپنا لی تھی۔ بیوی اور بیٹی لوگوں کے گھر کام کاج کرنے لگیں۔

یونس تو ببلی کا چاہنے والا تھا، وہ اس عمر میں بھی اپنے اندر کافی رعنائیاں رکھتی تھی۔ الغرض دونوں نے نکاح کر لیا۔ جس کی یونس کی اولاد اور پہلی بیوی نے بھرپور مخالفت کی مگر یونس نے اپنی ضد پوری کی۔ چند ماہ ہنسی خوشی گزرتے رہے اب ببلی ہر وقت خوشبو سے معطر لباس پہنتی تھی تاکہ پیشاب کی بدبو پر قابو پایا جا سکے۔ یوں ببلی کا علاج معالجہ بھی جاری رہا۔ فسچولا کے لئے ببلی کا دو بار آپریشن بھی ہوا مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

یوں ببلی بیماریوں کا مرکب تو پہلے بھی تھی مگر اب نہ جانے کس کس مرض نے اسے آن دبوچا تھا۔ وہ اب نیم مردہ حالت میں بستر پر پڑی رہتی۔ یونس بھی دن بھر روزی کے لئے تگ و دو کرتا تو رات گئے لوٹتا۔ اب تو ببلی کا چارپائی سے نیچے اترنا بھی محال تھا۔ وہ یونہی ہفتہ ہفتہ بھر گندگی میں لتھڑی پڑی رہتی۔ یہی تو وہ ببلی تھی جو دن میں کئی بار لباس تبدیل کرتی تھیں خوشبوؤں میں رچی بسی رہتی تھی مگر آج اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

ببلی کے رو رو کر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ چارپائی پر پڑے پڑے اس کا نرم نازک بدن جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ کچھ زخم تو باقاعدہ ناسور بن گئے تھے۔ زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی اور بدن کے اوپر کیڑوں نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ ببلی موت کی دعا کرتی تھی مگر موت بھی اس سے جیسے روٹھ گئی تھی۔ اسے اپنا بیتا وقت رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔

ببلی کو رہ رہ کر شائلہ کا خیال آ رہا تھا۔ اس کا بھولا پن یاد آ رہا تھا۔ اس کی منتیں اور ترلے یاد آ رہے تھے۔ پھر اسے اپنے ہاتھ شائلہ کی گردن پر رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ اب وہ ٹوکے اور چھری کے وار اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ نہیں رہے تھے۔

ببلی کے سامنے گزشتہ مناظر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ پھر اسے باپ، ماں، بھائی اور بہن کا انجام یاد آ رہا تھا۔ اس نے اسی کسمپرسی کی حالت میں آسمان کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور اپنے رب کے حضور معافی کی طلبگار ہوئی۔ اسی حالت میں موت کے فرشتے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے سانسوں کی ڈوری ٹوٹ گئی اور یوں سارے کا سارا خاندان اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

لوگ دنیا سے چھپ کر جرم کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ انہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

◆❋◆

شاہرن نے گھر سے بھاگ کر پورے خاندان کے منہ پر کالک پوت دی ہے۔ اگر خاندانی عزت بچانی ہے تو پھر شاہرن کو قربان کرنا ہوگا۔

بات ہے رسوائی کی

عشقِ نامراد

0399-9997909
☆ دستگیر شہزاد

طلال لاہور میں رہتا تھا۔ وہ ایک امیر کسان بلال کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی ایک بہن رافعہ بھی تھی۔ جہاں طلال اپنے والدین کا لاڈلا تھا وہیں اپنے نانا ایوب خاں اور ماما ریحان خاں کا بھی دلارا تھا۔ دونوں اس پر جان چھڑکتے تھے۔ طلال کی ننہال گلاب نگر میں تھی۔ وہ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔

ایک شام کی بات ہے طلال اپنی ننہال پہنچا تو اس کے ماموں کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر بولے۔ بھانجے اچھا ہوا تم موقع پر آ گئے۔ ایک شادی میں چلنا ہے۔ جہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گاؤں اسلام پورہ ہے۔ وہیں بارات آ رہی ہے چلو تیار ہو جاؤ۔ شام کو لوٹ آئیں گے۔

طلال نہایا دھویا عمدہ لباس زیب تن کیا اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اسلام پورہ میں شادی کی گہما گہمی تھی۔ کھلے میدان میں شامیانے لگے ہوئے تھے اور فضا میں فلمی گیت گونج رہے تھے۔ بریانی، قورمے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف مرد حضرات بیٹھے گپ شپ لڑا رہے تھے تو دوسری طرف خواتین۔ طلال نے بھی اپنے ماموں ریحان خاں کے ساتھ باتوں کا لطف اٹھایا۔ اس کے بعد ریحان خاں تو اپنے رشتے داروں سے گپ شپ کرنے لگا اور طلال اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دھوم دھڑکے سے بارات آ گئی۔ بارات دیکھنے کے شوق میں خواتین میں بھگدڑ مچ گئی۔ اسی میں ایک نوعمر لڑکی تیزی سے شامیانہ سے نکلی اور طلال سے ٹکرا گئی۔ چونک کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔

''راستہ چھوڑ کر کھڑے نہیں ہو سکتے کیا؟'' لڑکی نے غصے سے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں''۔

طلال نے کان پکڑ لئے۔ لڑکی کنی کاٹ کر جانے لگی تو طلال نے ہاتھ پھیلا کر راستہ روک لیا۔ ''ذرا ایک منٹ رکو تو''۔ لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے طلال کو گھورا۔

''اب کیا ہے؟''

''میں لاہور سے آیا ہوں''۔ طلال نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''گلاب نگر میں میرے ماموں ریحان خاں رہتے ہیں اور میرا نام طلال ہے''۔

''تو میں کیا کروں؟''

''تم بھی اپنا نام بتا دو''۔

''میرا نام شاہرن ہے''۔

''شاہرن! واقعی، جیسی تم خوبصورت ہو ویسا ہی تمہارا نام بھی خوبصورت ہے''۔ یہ کہتے ہوئے طلال نے اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک بات مجھے اور بھی کہنا ہے اگر تم اسے بھی سن لو تو میرے دل کو قرار آ جائے۔ یہ سوٹ جو تم پہنے ہو تم پر خوب پھب رہا ہے''۔

لڑکی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر نظریں جھکا کر تیزی سے اپنی سہیلیوں کی طرف بھاگ گئی۔ عورت محبت کے بغیر آدمی ہوتی ہے جبکہ عزت کے بغیر عورت، عورت نہیں رہتی۔

17 سالہ شاہرن اسلام پورہ کے باشندے حماد خاں کی بڑی بیٹی تھی۔ حماد خاں پیشے سے ٹرک ڈرائیور تھا۔ شاہرن کے علاوہ اس کے کنبے میں بیوی، سائرہ اور پانچ اولادیں اور تھیں۔ گاؤں میں پانچویں تک ہی تعلیم کا بندوبست تھا۔ اس کے بعد قریبی قصبہ علی پور جانا پڑتا تھا۔ اس لئے پانچویں کلاس پاس کر کے شاہرن گھر بیٹھ گئی تھی۔

اس دن شاہرن اپنے کنبے کے ساتھ شادی میں شریک ہونے کیا آئی طلال کی زندگی میں ایک سہانا موڑ آ گیا۔ طلال کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ شاہرن کو دیکھتا ہی رہے لیکن وہ تھی کہ بدلی کے چاند کی طرح کبھی دکھائی دیتی تو کبھی بھیڑ میں گم ہو جاتی۔ طلال کا دل شادی کے پروگرام پر رکے رہنے کا تھا لیکن ریحان خاں ماموں رکنے کو تیار نہیں تھے۔ مجبوراً طلال کو گلاب نگر لوٹ آنا پڑا۔ اپنا دل وہ اسلام پورہ میں ہی چھوڑ آیا تھا لیکن دوسرے دن دوپہر کو وہ پھر اسلام پورہ میں گھومتا نظر آیا۔ شاہرن کے دیدار کی تڑپ اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔

شاہرن نے طلال کو اپنے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا حال بھی طلال سے جدا نہیں تھا۔ اس پر بھی پہلی نظر کے پہلے پیار کا جادو چل گیا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ ایک گلی میں جو سنسان پڑی ہوئی تھی، طلال کے سامنے پہنچ گئی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے طلال سے کہا۔ ''مجھے بدنام کراؤ گے کیا؟ میرے چچا بڑے ظالم ہیں، کاٹ کر پھینک دیں گے''۔

''کر دیں قتل، مجھے اب کسی کا ڈر نہیں''۔ طلال نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''شام کو چار بجے سکول کے پچھواڑے ملو''۔

''ٹھیک ہے''۔ شاہرن نے کہا اور پلٹ کر بھاگ گئی۔

طے شدہ وقت پر طلال سکول کے عقب میں پہنچا تو وہاں شاہرن پہلے سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ طلال کو وہ سکول کے برآمدے کی دیوار کی اوٹ میں لے گئی۔ وہاں ان دونوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

''اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بس یہی کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور کسی پل چین نہیں قرار نہیں''۔

''ایسی محبت سے کیا فائدہ جس محبت کا حاصل نہیں''۔ شاہرن مایوس لہجے میں بولی۔

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ ہماری محبت کا حاصل نہیں''۔ طلال نے کہا۔

''اس لئے کہ تم پردیسی ہو''۔ شاہرن نے وجہ بیان کی۔

''اگر میں ہمیشہ کے لئے گلاب نگر میں رہ جاؤں تب تو مجھے قبول کر لوگی؟''

''تم اپنے گھر کے اکلوتے ہو، ماں باپ چھوڑ کر ننھیال میں رہ لو گے؟'' شاہرن نے اپنی پلکیں جھکائیں۔

''میں کیسے اعتبار کرلوں؟''

''راہِ عشق میں قدم بڑھانا ہے تو اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ اعتبار اور پیار دو ایسے پرندے ہیں جن میں سے ایک اڑ جائے تو دوسرا خود ہی اڑ جاتا ہے''۔

شاہرن نے طلال کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی زبان خاموش تھی لیکن آنکھیں بول رہی تھیں۔ اسی لمحے سے دونوں کی جنونی محبت کا آغاز ہو گیا۔

طلال نے قریبی چونگی امرسدھو میں سائیکل کے پرزے بنانے والی فیکٹری میں جوڑ توڑ کر کے ملازمت حاصل کر لی۔ ننھیال، ددھیال سب خوش، طلال نے جو کیا وہ کر کے دکھایا تو شاہرن اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔ اب طلال کے پاس دو ہی کام تھے۔ فیکٹری میں جا کر ڈیوٹی کرنا اور شاہرن کے سر سے سر جوڑ کر آنے والے کل کے سنہرے خواب دیکھنا۔ طلال اب شاہرن سے ملنے اسلام پورہ ہی نہیں آتا، اپنے محبوب کے ساتھ تفریح کرنے کے لئے شاہرن بھی چونگی امرسدھو تک جانے لگی۔ اس بے خوفی کا انجام وہی ہوا جو دوسری عشقیہ داستانوں میں سامنے آتا ہے۔

سب کو خبر ہو گئی کہ طلال اور شاہرن کیا گل کھلا رہے ہیں۔ گاؤں کی ایک عورت نے شاہرن کی ماں سائرہ کے کانوں میں یہ بات پھونکی تو اس کے ہوش جاتے رہے۔ شرم و غصے سے تلملائی سائرہ نے شاہرن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال کے سبب ہمیں ساری عمر آنسو بہانا پڑیں''۔ ماں نے وسوسوں میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

شاہرن چونکی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''امی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے پٹی پڑھانے کی کوشش مت کرو''۔ ماں نے کہا۔ ''تم خوب سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے اور ریحان خان کے بھانجے کے متعلق بات کر رہی ہوں''۔

> رشتوں کی خوبصورتی ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنے میں ہے۔ بے عیب انسان تلاش کرو گے تو اکیلے رہ جاؤ گے۔

شاہرن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی۔

''امی! طلال بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں صرف دو جذبوں کی قائل ہوں، عزت اور محبت۔ اس سے زیادہ میری کوئی خواہش نہیں''۔

بیٹی کے جواب سے سائرہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے طمانچہ مار کر شاہرن کا منہ لال کر دیا۔

''شکر ہے تیرے چچاؤں کو یہ خبر نہیں ہے'' اس نے قہر بھرے لہجے میں کہا۔ ''عزت کی خاطر وہ پلک جھپکتے میں کسی کی جان لے سکتے ہیں تو اپنی جان دے بھی سکتے ہیں۔ قتل نہیں ہونا چاہتی ہو تو طلال کو بھول جاؤ''۔

''امی! طلال کو بھول جانا میرے اختیار کی بات نہیں رہ گئی ہے''۔ شاہرن نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس پر سائرہ نے پھر شاہرن کو پیٹنا شروع کر دیا اور اسی دن سے اس کی گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے دن سائرہ صبح ہی صبح ریحان خاں کے گھر بھی پہنچ گئی۔

''تمہارا بھانجا میری بیٹی کو خراب کر رہا ہے''۔ اس نے ریحان خان کو دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میرے دیور آ کر تمہارے گھر خون کی ہولی کھیلیں، طلال کو واپس اس کے گھر بھیج دو''۔

ریحان خاں کو معاملے کی نزاکت اور اس کے سنگین

نتائج کے خطرے کا احساس تھا اس لئے اس نے فوراً بلال کو فون کر کے معاملے سے آگاہ کر دیا اور فیکٹری جا کر طلال کا حساب بے باق کر دایا۔ اسی دن اسے لاہور روانہ کر دیا گیا۔

گھر آ کر بھی طلال کو ماں باپ کی تلخ باتیں سننے کو ملیں۔ بیٹے کا چال چلن درست برقرار رکھنے کے لئے بلال کو ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

طلال نے کہا کہ شاہرن سے میرا نکاح کرا دو لیکن ماں باپ کسی قیمت پر اس رشتے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے طلال کی شادی لاہور کے باشندے بھورے خاں کی بیٹی گڑیا سے کرا دی۔ طلال کا دل چاک تو ہوا لیکن حالات اور قسمت کے آگے وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ زندگی کے آدھے غم انسان دوسروں سے غلط توقعات کر کے خریدتا ہے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد طلال کا دوبارہ ننہال میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کی شادی کی خبر اسلام پورہ میں پھیل چکی تھی۔ اس لئے شاہرن سے بھی عائد پابندیاں ہٹا لی گئیں۔ طلال نے اس سے ملنے کی کوشش کی مگر شاہرن نے اس سے بات تک نہیں کی۔ بہت مشکل سے طلال شاہرن سے بات کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسے حالات اور اپنی مجبوری سے واقف کرایا۔ رو رو کر یقین دلانے کی کوشش کی۔

''شادی ہو گئی تو کیا ہوا؟'' طلال نے کہا۔ ''میری پہلی اور آخری چاہت تم ہو۔ تمہارے لئے گڑیا کو بھی چھوڑ سکتا ہوں''۔

یہ سن کر شاہرن پگھل گئی اور اس کے بعد دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ اب وہ تھوڑے تھوڑے دنوں میں اسلام پورہ آتا۔ شاہرن سے ملاقات کرتا اور واپس لوٹ جاتا۔ ایک موبائل فون بھی خرید کر اس نے شاہرن کو دے دیا تھا۔ دن میں کئی بار وہ فون پر طویل باتیں کرتے رہتے۔

اسی دوران دو اہم باتیں ہوئیں۔ پہلی یہ کہ طلال ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ دوسری یہ کہ شاہرن کے گھر والوں کو پھر بھنک لگ گئی کہ بیٹی کے عشق کی دبی ہوئی چنگاری پھر سے بھڑک کر شعلہ بننے کے لئے بے تاب ہے۔ لہٰذا شاہرن پر پھر سے پابندیاں عائد کی گئیں اور اس کے ساتھ ہی حماد خاں نے اس کی شادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔

اب ادھر شاہرن پریشان تھی تو اُدھر طلال بھی سکون سے نہیں تھا۔ اس کی اور شاہرن کی آشنائی کا علم گڑیا کو ہو گیا۔ کوئی بھی بیوی ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر پرائی عورت سے پریت کے ڈورے جوڑے۔ اس لئے گڑیا ہر وقت طلال کو طعنے دینے لگی اور دھمکی دینے لگی کہ اسلام پورہ جا کر وہ شاہرن کی سرِ عام ایسی بے عزتی کرے گی کہ دنیا دیکھے گی۔

''تم نے اُس وقت بے وفائی کی جب میرا یقین آخری مقام پر تھا''۔ گڑیا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

شاہرن اور طلال کی فون پر بات چیت مسلسل جاری تھی۔ دونوں کے حالات سنگین ہوتے جا رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ 20 جون 2013ء کو طلال کو اسلام پورہ دیکھا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد شاہرن لاپتہ ہو گئی۔ ڈھونڈنے سے بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تو سائرہ سمجھ گئی کہ وہ طلال کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس نے فون کر کے فوراً اپنے شوہر اور دیوروں کو جمع کر لیا۔ ان لوگوں نے اپنے غصے کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ پہلے سب مل کر ریحان خاں کے گھر گئے لیکن اسے شاہرن اور طلال کی خبر نہیں تھی۔ اس لئے حماد خاں وغیرہ ریحان خاں کو بھی ساتھ لے کر تھانہ امرسدھو جا پہنچے۔ انسپکٹر زین خرم نے حماد خاں کی فریاد سنی اور طلال کے

خلاف اغوا کا کیس درج کرنے کے بجائے نیک مشورہ دیا۔

"جوان اور کنواری لڑکی کا معاملہ ہے۔ تھانہ کچہری ہونے سے اس کا مستقبل خراب ہو سکتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ لوگ اپنے طریقے سے انہیں تلاش کر لیں۔ ناکام رہیں تو پھر آ کر رپورٹ درج کرائیں"۔

حماد خاں نے ایک جیپ کرائے پر لی۔ اس کے بعد بھائی، بابو، رشتے دار الطاف، لیلا اور ریحان خاں کو لے کر لاہور روانہ ہو گئے۔ طلال اپنے مکان میں مل گیا لیکن شاہرن کے بارے میں پنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ حماد خاں جانتا تھا کہ طلال گلوبل جھوٹ بول رہا ہے اس لئے اس نے نفسیاتی چال چلی۔

"طلال بیٹا! بھاگی ہوئی لڑکی کو پھر سے اپنے گھر میں رکھنے کا ہمارے یہاں رواج نہیں ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس سے شادی کرے گا۔ بہتر ہو گا کہ جھوٹ بولنے کی بجائے تم اسے ہمارے سپرد کر دو۔ ہم جائز طریقے سے تمہاری شادی شاہرن سے کر دیں گے"۔

دوسرے لوگوں نے بھی حماد خاں کی بات کی تائید کی تو طلال ان کے جھانسے میں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ شاہرن کو میں نے جنگ پور میں ایک رشتے دار کے پاس رکھا ہوا ہے۔ سب لوگ بلا تاخیر جنگ پور پہنچے۔ طلال نے شاہرن کو بلا کر اس کے باپ اور چاچاؤں کے سپرد کر دیا۔ شاہرن کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔

"طلال! تم نے یہ کیا غضب کیا؟" اس نے خوفزدگی کے عالم میں کہا۔ "یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

طلال کو یقین تھا کہ ایسا کوئی ظلم نہیں ہونے والا، اس لئے حماد خاں شاہرن کو لے کر اسلام پورہ لوٹ آئے۔ اس وقت تک رات نے پاؤں پسارنے شروع کر دیئے۔

شاہرن حماد خاں کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے دل کی آگ پر جیسے تیسے قابو رکھا لیکن بابو خاں غصے سے تلملا رہا تھا۔ پوری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ شاہرن نے گھر سے بھاگ کر پورے خاندان کے منہ پر کالک پوت دی ہے۔ اگر خاندانی عزت بچانی ہے تو پھر شاہرن کو قربان کرنا ہو گا۔ جب رشتے سچے ہوں تو زیادہ سنبھالنے نہیں پڑتے اور جن رشتوں کو سنبھالنا پڑے وہ سچے نہیں ہوتے۔

صبح ہوتے ہی بابو خاں نے بستر چھوڑ دیا اور کپڑوں میں تیز دھار چھرا چھپا کر بھائی کے گھر پہنچ گیا۔ شاہرن نے صبح کی چائے کے لئے چولہے پر پانی چڑھایا ہی تھا کہ بابو خاں موت کا فرشتہ بن کر اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس نے کپڑوں میں چھپایا ہوا چھرا نکالا اور شاہرن کو زمین پر پٹک کر اس کا گلا کاٹ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ موت کی آغوش میں سما گئی۔

شاہرن کے قتل سے اسلام پورہ میں کہرام مچ گیا۔ حماد خاں کے پڑوسی مرغوب نے تھانہ چونگی امر سدھو جا کر واردات کی اطلاع دی۔ اس کے بیان کی بنیاد پر مقدمہ قتل درج کر لیا گیا۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر لاش اپنے قبضے میں لے لی اور حماد خاں، بابو خاں، سائرہ اور اس کے بھائی حرم خاں کو حراست میں لے لیا۔ تفتیش میں سائرہ اور حرم خاں بے قصور پائے گئے تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔

اسی درمیان کسی بہی خواہ نے فون کر کے طلال کو واقعہ کی اطلاع دے دی، طلال کو گہرا صدمہ پہنچا۔ ساری دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک اور ویران ہو گئی۔

> زندگی بدلنی ہو تو ایک جملے، ایک واقعہ سے بدل جاتی ہے۔ نہ بدلنی ہو تو ہزار کتابیں، کئی واقعات اور دانشور مل کر بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

فوجی مزاح کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل بے ضرر ہوتا ہے۔ اس سے کسی کی تضحیک یا تحقیر مراد نہیں ہوتی لیکن موقع اور حالات کی مناسبت سے بڑا فٹ آجاتا ہے۔

ضربِ سکندری

فوجی زندگی اور حسِ مزاح

☆ سکندر خان بلوچ

مزاح مزاح زندگی ہے۔ اس کے بغیر زندگی جہنم بن جائے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے حسِ مزاح کی خوبی سے نوازا ہے جو مزاح کا استعمال خود بھی جانتے ہیں اور اُس سے لطف اندوز ہونا بھی۔ ایسے لوگ محفل کی جان ہوتے ہیں۔ ماحول میں تازگی کا موجب بنتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ فوج بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ورنہ فوج کی سخت خشک اور تکلیف دہ زندگی عذاب بن جائے اور ایسے ماحول میں زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ ایسے اعصاب شکن ماحول میں زندگی کے خشک ماحول سے مزاح کے پھوٹنے والے چشمے فوجی زندگی کے صحرا کو سیراب کرنے کا کام کرتے ہیں۔ حالات اور ماحول کی سختی سے بھی لطف اندوز ہونے کی خوبی پیدا کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے فوج نے سول سے زیادہ مزاح نگار پیدا کیے ہیں۔

انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد ایک ڈگری کالج میں بطور لیکچرر پُرسکون زندگی گزار رہا تھا کہ نہ جانے کیوں فوج میں جانے کا خبط سوار ہو گیا۔ لہٰذا انتخاب کے مختلف مراحل سے گزر کر فروری 1965ء میں تربیت کے لئے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول جا پہنچا۔ ہماری عسکری تربیت تو ایک ہفتہ بعد شروع ہوئی لیکن تربیت سے پہلے ہی ہمارے ڈرل انسٹرکٹر نے ہمیں دوڑا دوڑا کر ادھ مؤا کر دیا۔ حکم یہ تھا کہ کوئی کیڈٹ چلتا ہوا یا باہر کھڑا ہوا نظر نہ آئے بلکہ صرف دوڑتا ہوا نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن ہماری ٹانگیں سوج گئیں۔ پورے بدن میں درد۔ ہم رات کو سونے کی بجائے اپنی ٹانگیں دباتے، Iodex قسم کی ادویات سے مالش کرتے لیکن درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ابھی اکیڈمی میں میرا تیسرا دن تھا۔ ہم پی ایم اے روڈ پر سینما ہال کی طرف اوپر فلم دیکھنے کے لئے لے جائے جا رہے تھے (نئے کیڈٹس کے لئے فلم دیکھنا بھی تربیت کا ایک حصہ تھا اس لئے وہاں جانا

ضروری تھا) میری پلاٹون کے تمام لڑکے لنگڑاتے ہوئے دوڑ کر چلے گئے لیکن میرا ٹانگوں کا درد نا قابل برداشت تھا لہٰذا پیچھے رہ گیا۔ اپنی سابقہ پُر سکون زندگی اور کردہ نا کردہ گناہوں کی سوچ میں گرتا لنگڑاتا چلتا اوپر جا رہا تھا۔ پی ایم اے روڈ اکیڈمی کے وسط میں "اِن گیٹ" سے "آؤٹ گیٹ" تک تقریباً تین میل لمبی تھی لیکن ہماری منزل سینما ہال ہماری بیرک سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھی اور یہ تمام کی تمام چڑھائی تھی لہٰذا دوڑ کر چڑھنا بہت مشکل بلکہ محال تھا۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ یوں لنگڑا کر چلنے پر بھی سزا مل سکتی ہے۔ میں اپنی شدید درد میں مبتلا ٹانگوں پر بڑی مشکل سے اپنے وزن کو اُٹھائے جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے سے ایک گرجدار آواز آئی۔ "صاحب یہ کیا مرغابی کی طرح مٹک مٹک کر چل رہے ہیں" یہ آواز ڈرل سٹاف (انسٹرکٹر) کی تھی۔ پہلے ہی بہت مشکل سے چل رہا تھا۔ اب یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ اگلا حکم سننے سے پہلے دوڑنے کی کوشش کی لیکن شدید درد کی وجہ سے ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ دوسری آواز آئی "یہ کیا بچہ جننے والی خاتون کی طرح پاؤں اُٹھا رہے ہو۔ پاکستان فوج کو ایسے افسران کی ضرورت نہیں"۔

دل چاہتا تھا کہ اُس کے پاؤں پڑ کر منت کروں کہ مجھے ابھی واپس بھیج دیں۔ میں ایسی افسری سے باز آیا میری بلکہ میرے پورے خاندان کی توبہ۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت کیسے جان چھڑائی جائے؟ ہوش و حواس تو تقریباً ختم ہو چکے تھے کہ تیسرا فقرہ نازل ہوا۔

"اچھا تو نازک اندام صاحب درد ہو رہا ہے میں آپ کا دردِ زہ ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ یہ پاکستان ملٹری اکیڈمی ہے (زور پاکستان پر) فیشن پریڈ نہیں جہاں حسیناؤں کی طرح مٹک مٹک کر چلیں"۔

ظالم نے کیا خوبصورت الفاظ اور تشبیہات استعمال کیں اگر ہوش و حواس میں ہوتا تو ضرور لطف اندوز ہوتا۔ فیشن شو کو بھی فیشن پریڈ کا نام دینا واقعی بہت اچھوتا خیال تھا۔ حکم ہوا "اچھا آپ صاحب نہیں چل سکتے فرنٹ رول (Front Roll) شروع کریں اور سینما ہال تک فرنٹ رول کرتے جائیں"۔ جو آدمی چل بھی نہ سکتا ہو اُسے فرنٹ رول کا حکم ملے۔ بہر حال مرتا کیا نہ کرتا فرنٹ رول شروع کر دیئے۔ لیکن اس پر بھی وہ ظالم مطمئن نہ ہوا۔ پھر آواز گونجی "یہ فرنٹ رول کر رہے ہو یا مچھلیاں پکڑ رہے ہو۔ تیز اور تیز" اس سے زیادہ زندگی میں مَیں نے اپنے آپ کو کبھی بے یار و مددگار محسوس نہیں کیا۔ تقریباً دس گز تک فرنٹ رول کیے ہوں گے کہ تارے نظر آنے لگے۔ کھڑے ہونے کی اجازت مانگی۔ زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر جو دوڑنا شروع کیا سینما ہال تک بغیر رُکے دوڑتا گیا۔ معلوم نہیں وہ کون سا جذبہ یا خوف تھا جو مجھے وہاں تک کھینچ کر لے گیا۔

اُس وقت تو میں ان لفاظ اور استعاروں سے لطف اندوز نہ ہو سکا لیکن اب جب سوچتا ہوں تو حوالدار نور کمال کی علمی و ادبی دسترس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ہمارا ڈرل انسٹرکٹر تھا۔ فوجی مزاج سے میرا یہ پہلا واسطہ تھا جو پچیس سال جاری رہا اور زندگی کے تلخ اور مشکل لمحات میں بھی پھلجھڑیوں کی مانند زندگی کو خوشگوار بنائے رکھا۔ "مرغابی کی طرح مٹک مٹک کر چلنا۔ بچہ جننے والی خاتون کی طرح پاؤں اُٹھانا، دردِ زہ میں مبتلا خواتین کی طرح چلنا، حسیناؤں کی طرح مٹک مٹک کر چلنا" وغیرہ کیا خوبصورت تشبیہیں ہیں جو اُردو ادب میں مجھے کہیں نظر نہیں آئیں۔

عسکری زندگی میں سزا اور جسمانی تکالیف تو تربیت کا حصہ ہیں جس کے بعد نہ صرف ہم خوگر ہو گئے بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جس دن سزا نہ ملتی بور بور محسوس کرتے۔ لیکن جس چیز سے ہم زیادہ لطف اندوز ہوتے وہ ہمارے ڈرل انسٹرکٹر حوالدار نور کمال کے

الفاظ اور تشبیہات کا انتخاب اور موقع کی مناسبت سے ان کا استعمال تھا جو ہمیں سول زندگی میں فوج میں جانے سے پہلے ملا اور نہ بعد میں۔ نور کمال کے حس مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہم لوگ جان بوجھ کر اُسے چھیڑتے تھے۔

ایک دن ہمارے ایک ساتھی کے پیٹ میں درد تھا۔ پریڈ میں تھوڑا ٹیڑھا کھڑا تھا۔ نور کمال صاحب کی نظر پڑی۔ دُور سے چنگھاڑا "یہ کیا صحرائی مسجد کے کوزے بنے کھڑے ہو۔ سیدھے افسروں کی طرف کھڑے ہو"۔ واہ سبحان اللہ کیا خوبصورت تشبیہ تھی! "صحرائی مسجد کا کوزہ"۔ ہم سب بہت محظوظ ہوئے۔ اُس لڑکے کا نام بھی صحرائی مسجد کا کوزہ پڑ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے الفاظ اور تشبیہات ادبی دنیا کے بڑے بڑے جغادری بھی استعمال نہیں کر سکتے۔

ایک دن ہم سب کو کھڑا کر کے ایک ایک کیڈٹ کو علیحدہ علیحدہ ڈرل سکھا رہے تھے۔ ہمارے ایک بنگالی ساتھی بڑے دُبلے پتلے انسان تھے۔ انہوں نے جونہی آگے قدم بڑھایا ہم سب کی ہنسی نکل گئی۔ نور کمال صاحب گویا ہوئے "واہ۔ صاحب واہ کیا الہڑ مٹیار کی طرح چل رہے ہیں۔ دیکھنا کہیں کمر میں بل نہ پڑ جائے"۔ بنگالی کیڈٹ کو تو سمجھ نہ آئی لیکن ہم سب بہت لطف اندوز ہوئے اور کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

اکیڈمی میں نئے کیڈٹ جب تک "ڈرل سیلوٹنگ ٹسٹ" پاس نہ کریں ان کی راتوں کی نیند حرام رہتی ہے کیونکہ اُس وقت تک باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جان کچے دھاگے سے لٹکی رہتی ہے۔ تمام کیڈٹس کی حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ پہلی ہی کوشش میں یہ ٹسٹ پاس کر لیا جائے۔ ایک دن ہم ڈرل گراؤنڈ میں 'اٹن شن' پوزیشن میں کھڑے تھے کہ ہمارے ایک ساتھی کو چھینک آ گئی ضبط کی پوری کوشش کے باوجود روک نہ سکا۔ لہٰذا چھینک دیا۔ ہم سے دُور صوبیدار میجر رفیع صاحب کھڑے تھے جنہیں ہم Rafi, the terror کے لقب سے جانتے تھے۔ وہ ہماری پریڈ دیکھ رہے تھے۔ وہاں چونکہ تمام رپورٹس انگریزی میں لکھی جاتی ہیں اس لئے بعض اوقات مناسب انگریزی میں ترجمہ نہ کر سکنے کے خوف سے کچھ خطائیں معاف کر دی جاتی تھیں لیکن پریڈ پر چھینک مارنا ناقابل معافی جرم تھا اور بدقسمتی سے رفیع صاحب کو اس کی انگریزی بھی نہ آتی تھی لیکن پھر بھی اتنے بڑے مجرم کو محض انگریزی کی وجہ سے معاف کرنا رفیع صاحب کی فطرت کے خلاف تھا۔

ہمارے سامنے ہمارا ڈرل انسٹرکٹر حوالدار نور کمال کھڑا تھا۔ ان تمام انسٹرکٹرز کو وہاں 'سٹاف' کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اس چھینک پر رفیع صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔ وہاں سے دھاڑے "سٹاف! صاحب کا نام اور نمبر نوٹ کریں۔ جرم چھنک آن پریڈ"۔ ساتھ ہی خیال آیا چھنک کو انگریزی میں کیا کہنا چاہیے۔ تو سٹاف کی آسانی کے لئے مزید فقرہ بڑھا دیا "چھنک آن پریڈ انگریزی بعد میں بنا لیں گے"۔

فوجی مزاح کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل بے ضرر ہوتا ہے۔ اس سے کسی کی تضحیک یا تحقیر مراد نہیں ہوتی لیکن موقع اور حالات کی مناسبت سے بڑا فٹ آ جاتا ہے۔ 1972ء میں بطور ایجوکیشن آفیسر میں جنوبی وزیرستان پوسٹ ہوا۔ وہاں بلوچستان کے بارڈر کے پاس ہماری "توئے خولہ" نام کی ایک پوسٹ تھی جہاں کافی سارے جوانوں کی ترقی تعلیمی کمی کی وجہ سے رُکی ہوئی تھی۔ لہٰذا مجھے پہلا ہدف یہی ملا کہ ان جوانوں کے لئے خصوصی کلاسز کا بندوبست کر کے تعلیمی کمی کو پورا کیا جائے۔ میں اپنے ایک صوبیدار کے ساتھ وہاں گیا اور خصوصی کلاس شروع ہو گئی۔ ایک ماہ بعد رپورٹ آئی کہ کورس مکمل ہو گیا ہے لہٰذا امتحان لیا جائے۔ میرے

کمانڈنگ آفیسر نے وہاں الیکشن پر جانا تھا وہ مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے امتحان دینے والے جوانوں سے پوچھا "تم لوگوں نے کیا پڑھا ہے؟" سب جوانوں نے اٹن شن ہو کر جواب دیا۔

"سر ہم نے بوت (بہت) پڑھا ہے"۔

"آخر کیا پڑھا ہے اور کیا سیکھا ہے؟" سی او نے پھر پوچھا۔

ایک جوان نے سادگی سے جواب دیا "سر ہم نے بوت سیکھا ہے اب ہم "ب" کا نقطہ نیچے لگاتا ہے پہلے اوپر لگاتا تھا۔" سی او خود بھی پٹھان تھا۔ یہ جواب سن کر ہنس پڑا۔ کہا ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے انہیں پاس کر دو۔ تعلیمی ترقی کا اس سے بہتر جواب بھلا کیا ہو سکتا تھا؟

ایک دفعہ ایک خچر یونٹ کی چند خچریں دریائے جہلم کے پل سے گزر رہی تھیں کہ کسی وجہ سے ایک خچر دریا میں گر گئی۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی لہٰذا کوشش کے باوجود خچر کو بچایا نہ جا سکا۔ بعد میں یونٹ کا آڈٹ ہوا۔ آڈٹ والے تو ویسے ہی بال کی کھال اُتارتے ہیں لہٰذا انہوں نے اعتراض اُٹھایا کہ ٹھیک ہے خچر تو ڈوب گئی لیکن اس کی کھال بیچ کر رقم خزانے میں کیوں نہیں جمع کرائی گئی؟ یہ اعتراض شاید انہوں نے یونٹ کو زچ کرنے کے لئے لگایا تھا کیونکہ جب خچر دریا میں ڈوب چکی تھی تو کھال کیسے اُتارتے؟ بدقسمتی سے بغیر سوچے سمجھے افسران بالا نے اِس اعتراض کا جواب مانگا۔ کمانڈنگ آفیسر بھی تھوڑا مزاحیہ قسم کا آفیسر تھا۔ اُس نے یہ جواب لکھا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ کھال نہ اُتار سکے کیونکہ خچر بہت جلدی میں تھی اور بغیر پوچھے دریا میں کود گئی۔ میرے خیال میں اِس پر حکم عدولی کا الزام بھی لگنا چاہیے۔"

1947 میں جب پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو سب سے بڑا مسئلہ کیڈٹس کو پڑھانے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا حصول تھا جو میسر نہ تھے۔ خوش قسمتی سے اس دور میں انڈین یونیورسٹیز میں کام کرنے والے بہت سے مسلمان پروفیسرز حضرات مہاجرین کی شکل میں پاکستان آگئے لیکن یہاں ان کے لیے ان کے معیار کے مطابق جاب نہ تھے۔ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے نامزد کمانڈنٹ بریگیڈیئر فرانس اینگل نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سویلین انسٹرکٹرز کیڈر بنا کر انہیں پاکستان اکیڈیمی کے لیے منتخب کر لیا۔ فوجی ماحول اور سویلین ماحول خاص کر یونیورسٹی اساتذہ اور دانشور طبقہ کے لئے بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شروع شروع میں جب سویلین سکالرز نے بطور انسٹرکٹرز پاکستان ملٹری اکیڈیمی جیسے سخت ڈسپلن والے ماحول میں کام کرنا شروع کیا تو کئی لطیفے بھی معرض وجود میں آئے۔ قارئین بھی انجوائے کریں۔

ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔ غالباً حیدر آباد یونیورسٹی (بھارت) کے مشہور سکالر تھے۔ پاکستان کے ابتدائی ایام میں جاب نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان ملٹری اکیڈیمی آگئے اور یہاں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس دور میں کیڈٹس کا تعلیمی معیار محض میٹرک ہوتا تھا اور اس وقت کے سینئر فوجی افسران کا بھی یہی کچھ۔ ڈاکٹر صاحب نے تجربے سے سیکھا کہ فوجیوں سے بحث آ بیل مجھے مار کے مترادف ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں ایسا موقعہ آتا ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت ہوشیاری سے ٹال دیتے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب ایک کیڈٹ کلاس کو انگریزی پڑھا رہے تھے۔ مضمون تھا Speech Training۔ سامنے بلیک بورڈ پر Speech Training کا ہیڈنگ لکھا تھا کہ اس دوران اکیڈیمی کے ڈپٹی کمانڈنٹ جو خود میٹرک پاس تھے کلاس کے اندر آ گئے۔ تھوڑی دیر کھڑے ہو کر لیکچر سنتے رہے۔ کلاس سے باہر آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے گویا ہوئے۔ ڈاکٹر

کمانڈنگ آفیسر نے وہاں انسپکشن پر جانا تھا وہ مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے امتحان دینے والے جوانوں سے پوچھا "تم لوگوں نے کیا پڑھا ہے؟" سب جوانوں نے اٹن شن ہو کر جواب دیا۔

"سر ہم نے بُوت (بہت) پڑھا ہے"۔

"آخر کیا پڑھا ہے اور کیا سیکھا ہے؟" سی او نے پھر پوچھا۔

ایک جوان نے سادگی سے جواب دیا "سر ہم نے بُوت سیکھا ہے اب ہم "ب" کا نقطہ نیچے لگاتا ہے پہلے اوپر لگاتا تھا۔" سی او خود بھی پٹھان تھا۔ یہ جواب سن کر ہنس پڑا۔ کہا ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے انہیں پاس کر دو۔ تعلیمی ترقی کا اس سے بہتر جواب بھلا کیا ہو سکتا تھا؟

ایک دفعہ ایک خچر یونٹ کی چند خچریں دریائے جہلم کے پل سے گزر رہی تھیں کہ کسی وجہ سے ایک خچر دریا میں گر گئی۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی لہٰذا کوشش کے باوجود خچر کو بچایا نہ جا سکا۔ بعد میں یونٹ کا آڈٹ ہوا۔ آڈٹ والے تو ویسے ہی بال کی کھال اُتارتے ہیں لہٰذا انہوں نے اعتراض اُٹھایا کہ ٹھیک ہے خچر تو ڈوب گئی لیکن اس کی کھال بیچ کر رقم خزانے میں کیوں نہیں جمع کرائی گئی؟ یہ اعتراض شاید انہوں نے یونٹ کو زچ کرنے کے لئے لگایا تھا کیونکہ جب خچر دریا میں ڈوب چکی تھی تو کھال کیسے اُتارتے؟ بدقسمتی سے بغیر سوچے سمجھے افسران بالا نے اِس اعتراض کا جواب مانگا۔ کمانڈنگ آفیسر بھی تھوڑا مزاحیہ قسم کا آفیسر تھا۔ اُس نے یہ جواب لکھا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ کھال نہ اُتار سکے کیونکہ خچر بہت جلدی میں تھی اور بغیر پوچھے دریا میں کود گئی۔ میرے خیال میں اِس پر حکم عدولی کا الزام بھی لگنا چاہیے۔"

1947 میں جب پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو سب سے بڑا مسئلہ کیڈٹس کو پڑھانے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا حصول تھا جو میسر نہ تھے۔ خوش قسمتی سے اس دور میں انڈین یونیورسٹیز میں کام کرنے والے بہت سے مسلمان پروفیسرز حضرات مہاجرین کی شکل میں پاکستان آگئے لیکن یہاں ان کے لیے ان کے معیار کے مطابق جاب نہ تھے۔ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے نامور کمانڈنٹ بریگیڈیئر فرانسس اینگل نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سویلین انسٹرکٹرز کیڈر بنا کر انہیں پاکستان اکیڈیمی کے لیے منتخب کر لیا۔ فوجی ماحول اور سویلین ماحول خاص کر یونیورسٹی اساتذہ اور دانشور طبقہ کے لئے بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شروع شروع میں جب سویلین سکالرز نے بطور انسٹرکٹرز پاکستان ملٹری اکیڈیمی جیسے سخت ڈسپلن والے ماحول میں کام کرنا شروع کیا تو کئی لطیفے بھی معرض وجود میں آئے۔ قارئین بھی انجوائے کریں۔

ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔ غالباً حیدرآباد یونیورسٹی (بھارت) کے مشہور سکالر تھے۔ پاکستان کے ابتدائی ایام میں جاب نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان ملٹری اکیڈیمی آگئے اور یہاں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس دور میں کیڈٹس کا تعلیمی معیار محض میٹرک ہوتا تھا اور اس وقت کے سینئر فوجی افسران کا بھی یہی کچھ۔ ڈاکٹر صاحب نے تجربے سے سیکھا کہ فوجیوں سے بحث آبیل مجھے مار کے مترادف ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں ایسا موقعہ آتا ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت ہوشیاری سے ٹال دیتے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب ایک کیڈٹ کلاس کو انگریزی پڑھا رہے تھے۔ مضمون تھا Speech Training۔ سامنے بلیک بورڈ پر Speech Training کا ہیڈنگ لکھا تھا کہ اس دوران اکیڈیمی کے ڈپٹی کمانڈنٹ جو خود میٹرک پاس تھے کلاس کے اندر آ گئے۔ تھوڑی دیر کھڑے ہو کر لیکچر سنتے رہے۔ کلاس سے باہر آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے گویا ہوئے۔ ڈاکٹر

صاحب انگریزی بعد میں پڑھانا پہلے اپنے سپیلنگ (Spelling) درست کرلیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ''سرکون سے سپیلنگ؟''

''Speech کے سپیلنگ'' ڈپٹی کمانڈنٹ نے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے بتایا:

ڈاکٹر صاحب نے آرام سے پوچھا: ''سر درست سپیلنگ کیا ہیں؟''

''Speech ہیں'' ڈپٹی کمانڈنٹ نے درشتگی کے سے انداز میں فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب نے فوراً ڈسٹر اٹھایا۔ بورڈ سے "ee" مٹا کر "ea" لکھ دیا یعنی Speach۔ ساتھ ہی کہا ''Sorry سر غلطی ہوگئی''

ڈپٹی کمانڈنٹ اپنی کامیابی پر اکڑتے ہوئے کلاس سے باہر نکلے تو ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ ڈسٹر اٹھایا اور "ea" مٹا کر "ee" لکھ کر Speech درست کر دیا۔ کیڈٹس نے اصل سپیلنگ پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے بتایا: درست سپیلنگ تو "ee" ہی ہے لیکن فوج میں جو سینئر آفیسر کہے وہی درست ہوتا ہے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد جب حالات بہتر ہوئے تو ایک ایک کرکے تمام ڈاکٹرز لیول کے انسٹرکٹرز اکیڈمی سے چلے گئے۔ ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم پشاور یونیورسٹی میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین بنے۔ 1964 میں مجھے ان کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔

اسی طرح میتھ ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ڈاکٹر احمد مرحوم فلاسفر قسم کے انسان تھے۔ ہر وقت سوچ میں گم رہتے جیسے کوئی مسئلہ حل کررہے ہوں۔ ایک شام وہ PMA روڈ پر ہاتھ میں سٹک پکڑ کر واک کررہے تھے۔ اچانک سٹک ان کے ہاتھ سے گرگئی۔ سامنے سے دو کیڈٹ آرہے تھے۔ سٹک گرتی دیکھ کر اسے اٹھانے کے لئے دوڑے۔ نزدیک آکر ایک کیڈٹ نے ڈاکٹر صاحب کو خوش کرنے کے لئے پوچھا: ''سر کیا ہوا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کن سوچوں میں گم تھے کہنے لگے:

"Perpendicularity has fallen into horizontality with the force of gravity."

''کشش ثقل کے زور سے عمودافق میں تبدیل ہوگیا ہے''۔ پاس آؤٹ ہونے تک کیڈٹس اس فقرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن نہ سمجھ سکے۔

گو ڈاکٹرز حضرات تو اکیڈمی چھوڑ کر چلے گئے لیکن سویلین انسٹرکٹرز کی روایت 1968 تک جاری رہی۔ 1968 میں کئی مجبوریوں کی وجہ سے ان حضرات کو ان کی سروس کے مطابق رینکس دے کر یونیفارم پہنا دی گئی۔ سویلین انسٹرکٹرز جو ایک دن پہلے تک سوٹ میں پھرتے تھے دوسرے دن اچانک میجری اور کرنیلی لگا کر پھرنے لگے۔ اس دور میں ہمارے پاس افریقن کیڈٹس بھی تربیت کے لئے آتے تھے۔ ایک دن ایک آفیسر نے ایک نائیجرین کیڈٹ سے مذاق کرتے ہوئے پوچھا:

''تمہاری آرمی میں تو پروموشن بہت تیز ہوتا ہوگا۔ چند سالوں میں ہی میجر بن جاؤ گے''

کیڈٹ نے تحمل سے جواب دیا ''سر تیز تو ہے لیکن اتنا تیز بھی نہیں جتنا پاکستان آرمی میں ہے''

''پاکستان آرمی میں تیز پروموشن؟'' آفیسر نے حیران ہوکر پوچھا۔ وہ کیسے؟''

کیڈٹ نے پھر اطمینان سے جواب دیا۔ ''سر فلاں انسٹرکٹر کل تک سویلین تھے آج لیفٹننٹ کرنل ہے۔ اس سے اور تیز پروموشن کیا ہوگا؟

پچھلی صدی کی پچاس کی دہائی میں امریکی فوجوں کی کوریا جنگ کے دوران امریکی فوج کے کمانڈر جنرل میکارتھر مختلف وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ جنرل میکارتھر کے والد بھی فوجی آفیسر تھے اور شاید جنرل کے عہدے

تک پہنچے۔ یہ سینئر میکارتھر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ امریکی سول وار کے بعد یہ صاحب بطور کرنل ایک بارڈر پر تعینات تھے جہاں سے بہت سمگلنگ ہوتی تھی۔ انہوں نے بہت سختی کی اور سمگلنگ رُک گئی۔ ایک دن ایک بالکل نئی گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر خاتون اُن سے ملنے آئی۔ اُن کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ سینئر میکارتھر نے دونوں کو کافی پیش کی اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ یہ خاتون بغیر تمہید کے گویا ہوئی۔

"کرنل۔ باہر نئی شیورلیٹ گاڑی آپ کی منتظر ہے۔ یہ رہی اسکی چابی۔ ساحل سپین کے ٹاپ کلاس ہوٹل میں آپ کا دو ہفتے کے لئے کمرہ بُک ہے۔ یہ رہے دو ایئر ٹکٹ اور ہوٹل کا بکنگ کارڈ۔ یہ دستخط شدہ چیک ہے۔ اس پر جو رقم لکھنا چاہیں لکھ لیں اور یہ میری سیکرٹری اس عرصہ کے لئے آپ کی خدمت کے لئے آپ کے ساتھ رہے گی۔ اگر مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا یہ فوری پورا کر دے گی"۔

اس آفر پر میکارتھر بہت حیران ہوا۔ پوچھا "اس خوبصورت آفر کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" خاتون نے جواب دیا "کچھ خاص نہیں۔ ایک ہفتہ کے لئے فلاں بارڈر خالی چھوڑ دیں۔" میکارتھر نے ایک دن کی مہلت مانگی۔

خاتون کے جانے کے بعد اپنے کمانڈر کو یہ سگنل بھیجا۔

"براہ مہربانی مجھے اِس کمانڈ سے فوری ہٹا دیا جائے یا دو ہفتوں کی چھٹی دی جائے کیونکہ مسز .... نے میری مکمل قیمت پیشگی ادا کر دی ہے:

Mrs. has paid me my full price in advance. Please change me from Command immediately or grant me two weeks leave. Most urgent.

(عسکریت پسندیاں)

ہمت کی جولانی

بلندیوں پر جدوجہد سے پہلے عزم کمندیں ڈالتا ہے۔ایک بے بال و پر بچے کے پختہ عزم کا قصہ۔

☆ مبشر حسن ملک
0345-6875404

کنگ آف جاپان اچانک کسی اور کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔آپ کو ذرا دیر انتظار کرنا پڑے گا"۔خاتون نے اسے بتایا تو اس کے دل کی دھڑکن واپس متوازن سی ہو گئی اور وہ فوراً ویٹنگ روم کی دبیز گدے والی کرسی میں دھنس گیا۔پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کے سال تھے اور سیٹو کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے وہ تعلیمی ریسرچ کے سلسلے میں بیرونِ ملک آیا تھا۔

لمحہ بھر کے لئے اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو ماحول میں رچے بسے پُر تمکنت دبدبے کا بوجھ دل پر محسوس کرنے لگا۔"میرے یہاں لائے جانے میں میری مرضی شامل نہیں"۔اس نے اپنے دل کو تسلی دی، پھر دھیرے دھیرے اس کے آوارہ خیال ماضی کی طرف لوٹنے لگے اور اسے ایک بچہ "مظفر" بڑی شدت سے یاد آیا جو حیات میں بارہا اسے اپنا احساس دلاتا رہا تھا۔مظفر کو معمولی بچہ نہیں تھا مگر غیر معمولی حالات کا شکار رہا تھا۔چھوٹی عمر ہی سے وقت کے طوفانی دھارے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اسے زمانے کے جور و جفا سے بھی رُوشناس کرا دیا تھا۔

یہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تھی۔نوعِ آدم بڑا جنگ و جدل دیکھ رہی تھی اور اب اس کے اثرات سے نبرد آزما تھی۔انگریز شان و شوکت سے برصغیر پر حکومت کر رہا تھا۔مسلمان انگریز کے غلام تو تھے ہی، معاشی طور پر ہندوؤں کے غلام بھی ہو چکے تھے۔

مظفر کی زیست میں نبی ابتدائی یادیں بے حد تلخ تھیں۔اس کی عمر چار برس ہو گی، جب اس کے گھر میں آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔اس کی ماں مسلسل رو رہی تھی اور والد محترم چارپائی پر سفید چادروں میں لپٹے بے حس پڑے تھے۔"انہیں موذی پلیگ نے کھا لیا"۔لوگ بار بار دہراتے اور ننھے بچے کو بے ساختہ پیار کرنے لگتے، جو تمام صورت حال سے بے نیاز اپنے کھیل کود میں مصروف تھا۔

آخر ماں کو موقع مل گیا۔وہ لاش کے سرہانے سے بمشکل اٹھی اور صحن کے کونے کی طرف لپکی، اس نے وہاں چھوٹا سا گڑھا کھود ڈالا، پھر اندر گئی اور چاندی کے تین سو روپے پیالی میں بھر کر لے آئی۔ایک دوسری پیالی سے اس نے سکے ڈھک دیئے اور بالآخر یہ مایا زمین میں

گاڑھ دی۔ تمام تماشہ مظفر حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ دنیا کے رواج سے آشنا نہیں تھا، اس لئے کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ یادوں کے نقوش البتہ اس کے ذہن میں کندہ اَنمٹ رہ گئے۔

"تمہارے والد نے انتقال سے پہلے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تمہیں تعلیم دلواؤں۔ وہ تمہیں اعلیٰ درجوں تک تعلیم دلوانا چاہتے تھے مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ کل یہ پیسے تمہارے کام آئیں گے۔ ہمیں مرحوم کی تمناؤں کی تکمیل کرنا ہوگی"۔ ماں نے بیٹے کو تلقین کی۔

یتیمی اپنا احساس دلا دیتی ہے۔ سر پر تنی چھتری کی پناہ سرک جائے تو وجود تپتی دھوپ میں جلنے لگتا ہے، پھر سایوں کے متلاشیوں کو وہ نفوس بھی اجنبی دکھائی دیتے ہیں، جو کبھی ان کے دست نگر ہوا کرتے تھے۔ مظفر کو احباب کی ٹھوکریں خصوصاً گراں گزریں۔ وہ فطرتاً بہت حساس تھا۔

ایک شام مظفر کی ماں نے صحن کو کونا کھودا تو اسے پیالیاں مل گئیں مگر وہ سکوں سے خالی ہو چکی تھیں۔

"کبھی جنات بھی دولت کے تمنائی ہو جاتے ہیں اور موقع پا کر اس پر ہاتھ صاف کر لیتے ہیں"۔ احباب نے اسے سمجھایا۔

"مگر وہ تو یتیم کا مال تھا"۔ ماں روئی اور چلائی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بچے کے مجرموں کا یتیمی سے پالا نہیں پڑا تھا۔

کنبے کو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔

"بچہ شیر ہے، اسے کہو کہ محنت مزدوری کر لے"۔ احباب نے مظفر کی ماں کو مشورہ دیا۔

"مگر یہ تو معصوم بچہ ہے، کم سن اور لاغر، اسے مزدوری کون دے گا؟" ماں نے بے بسی کے عالم میں سوال کیا۔

"مجھے تو پڑھنا ہے۔ میں نے مزدوری کر لی تو والد صاحب کی تکمیلِ تمنا کون کرے گا؟" مظفر نے بے ساختہ بات کی۔ والد کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اگلے روز گھر میں فساد برپا ہو گیا۔ ماں نے احباب کی بات مان لی۔ "مزدوری کرو گے تو کھانا ملے گا"۔ ماں نے مظفر کو بتا دیا اور اس کی طرف سخت رویہ اختیار کر لیا۔ معصوم بچے نے وہ بھوک دیکھی، جسے زندگی بھر فراموش نہ کر سکا۔ اسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا تھا۔ قدرتی خصائص، جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے تھے، اب بھیانک لبادہ اوڑھے اس کے مقابل کھڑے تھے۔ کسی سے مانگتا تو شاید اسے کچھ مل بھی جاتا مگر اس نے بھوک مٹانے کے لئے شیشم کے پتے کھانے کو ترجیح دی اور اسی پر صبر و شکر کرتا رہا۔ رات مسجد میں سو جاتا، دن قریبی جنگل میں بسر کر لیتا۔ اس طرح اس نے کئی روز گزار دیئے مگر آخرکار اسے ہار ماننا پڑی۔ مسلسل بھوک کے سامنے اس کا عزم ماند پڑ گیا۔

مظفر کو سکول چھوڑنا پڑا۔ یہ اس کے احباب کی فتح تھی۔

کبھی لواحقین ننھے قلوب میں برپا قیامت کا احساس نہیں کر پاتے، کبھی وہ اپنی کم مائیگی کے باعث محرومی دوسروں پر مسلط کر کے شادمان ہو جاتے ہیں۔ اپنی اس شکست پر مظفر بہت رویا۔ اس شب اس کے والد اسے خواب میں دکھائی دیئے۔ انہوں نے اسے تسلی دی اور صبر کی تلقین کی۔ مشکل اوقات میں کبھی وہ اس کی ڈھارس بندھایا کرتے تھے۔

بچے کو ایک امیر گھرانے میں ملازمت مل گئی، جہاں غربت بہت بڑا گناہ تھی۔ مظفر وہاں اندرونی چھت پر آویزاں لکڑی اور کپڑے میں بنا دیسی پنکھا ڈوری کی مدد سے مسلسل آگے پیچھے حرکت میں لایا کرتا تھا تاکہ کمرے میں خوابیدہ افراد کی نیندوں میں خلل واقع نہ ہو۔ سستی یا غفلت اس پر بہت بھاری پڑ جاتی تھی۔ بچے کے لئے یہ

کام مشکل تھا۔ اسے روز کئی گھنٹے مشقت کرنا پڑتی تھی، اس کے بازو شل ہو جاتے مگر ڈوری کی حرکت جاری رہتی تھی۔ کبھی تصور میں اس کے ہاتھوں سے جڑی ڈوری جھولا بن جاتی اور وہ ہم جماعت دوستوں کے ہمراہ اس کے سہارے جھولنے لگتا مگر خواب اس دم ٹوٹ جاتا، جب خوابیدہ نفوس ہڑبڑا کر جاگ اٹھتے اور نگاہوں کی تندی اس کا سینہ چیرنے لگتی۔

ایک روز وہ ماں کے سامنے رو پڑا۔ ''میں پڑھنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی دوسرے بچوں کی طرح روزانہ مدرسے جاؤں''۔ وہ تقریباً ضد کرتے ہوئے بولا۔ اس روز ماں بھی بری طرح رو پڑی۔

''میں کوشش کروں گی کہ تمہاری خواہش پوری کروں''۔ اس نے جواب دیا۔ چند روز بعد اس نے لخت جگر کی نوکری چھڑا دی۔

ماں نے گھر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خواتین اس سے قرآن اور مذہبی کتب پڑھنے لگیں۔ عربی کے علاوہ وہ فارسی بھی جانتی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاں طالبات کی تعداد بڑھنے لگی۔ گو غربت قائم رہی مگر اس کا گھر چل پڑا۔ اس کے بچے کا حصول تعلیم ممکن ہو گیا۔

رشتہ داروں کے جوان طبقے کی نفرت مظفر کے زمرے میں بڑھ گئی۔ وہ اسے سنار کہا کرتے تھے اور اس کے اوصاف میں جھلکتی ہوئی نفاست سے خائف رہا کرتے تھے۔ وہ اس کی کرتہ شلوار زیب تن کرنے کی عادت پر بھی تنقید کرتے۔ سردیوں میں سویٹر مظفر کو کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک سرما کے دوران کسی نے اسے عنایت کر دیا، مگر اگلے ہی روز وہ تحفہ بھی چوری ہو گیا اور وہ بدنصیب پھر بغیر سویٹر کے رہ گیا۔ وہ شدید جاڑے کے موسم میں بھی علی الصباح تین کو میل فاصلہ طے کر کے سکول جایا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یتیم انسانی ظلم کے علاوہ کڑے موسموں کا جبر برداشت کرنے کا بھی عادی ہو چکا تھا۔

رمضان کی ایک تلخ شام نے مظفر کو بہت رلایا۔ افطاری کے بعد اس نے اپنا بستہ ڈھونڈا تو اس میں کتابیں موجود نہیں تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے چند ان پڑھ اور کھلنڈرے کزنوں نے ہاتھ دکھا دیا تھا۔ وہ اس کی کتابیں ردی میں بیچ آئے تھے اور ملنے والے پیسوں کے عوض کھانا بھی کھا چکے تھے، اس طور بچے کی کائنات لٹ گئی تھی۔

اسی رات اس یتیم بچے کو لیلۃ القدر کی زیارت ہوئی۔ ہر طرف تیز روشنی چھا گئی۔ خوف سے نکلا تو اس نے ان لمحوں میں دعا مانگ لی۔ ''یارب! میرا دل علم کی لو سے منور کر دینا اور مجھے ایسی افسری عطا کرنا کہ میں تعلیمی اداروں کو فروغ دے سکوں اور تعلیم پھیلانے کا باعث بن سکوں''۔ مظفر کی یہ دعا قبول ہو گئی۔ اس نے نہ صرف پی ایچ ڈی کیا بلکہ سیٹو کے ساتھ منسلک ہو کر دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں بحیثیت ریسرچ سکالر کام کیا۔ یونیورسٹی آف لنڈن سے فیلوشپ کا حصول ممکن بنایا اور امریکہ میں بطور فلبرائٹ سکالر پہچانا گیا۔ اس نے متعدد کتابیں لکھیں اور شہرہ آفاق کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ علاوہ پاکستان کے محکمہ تعلیم میں بطور سینئر افسر نمایاں خدمات انجام دیں۔

''کنگ آف جاپان آپ سے ملاقات کے لئے تیار ہیں''۔ خاتون نے تیسری بار دہرایا تو ڈاکٹر مظفر حسن ملک اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور خاتون کے ہاتھوں کھلتے ہوئے بھاری دروازے میں داخل ہو گیا۔

ان سطور میں نے اپنے والد مرحوم ڈاکٹر مظفر حسن ملک کو خراج تحسین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مکافاتِ عمل

مَیں جب بھی اُسے ملتا، وہ حزن وملال اور کرب کی شدید ترین کیفیت سے دوچار نظر آتا......اور کم وبیش ڈیڑھ دو سال تک انتہائی عبرت ناک زندگی گزار کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔

خدا کا کوڑا

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
0323-4546115

عزیز عطا فاروقی ایک سلجھے ہوئے باوقار نوجوان ہیں۔ منصورہ (ملتان روڈ لاہور) کے سامنے ایک بستی گلشن عباس میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے ایک عبرت ناک مشاہدہ لکھ کر میرے حوالے کیا۔ زبان کی ضروری اصلاح کے بعد اُسے عزیز صاحب کے شکریے کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

1996ء سے 2000ء تک چار سال کا عرصہ روزگار کے سلسلے میں مَیں نے ملائشیا کے صدر مقام کوالالمپور میں گزارا۔ مَیں وہاں مسجد انڈیا کے علاقے میں سیلنگور مینشن میں مقیم تھا۔ جہاں کئی اور پاکستانی بھی رہتے تھے جن میں چاچا رحمت بھی تھا۔ عمر اُس کی تقریباً پچپن سال تھی اور وہ سرگودھا کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ سوکھا سڑا، نحیف ونزار، سستے میلے کپڑے گویا وہ بے چارگی اور افسردگی کی مجسم تصویر تھا۔ ہم نے اسے کبھی مسکراتے ہوئے نہ دیکھا۔ گم صم پریشان رہتا۔

خوف اور حزن نے اس کے چہرے پر جیسے مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ اُسے اچھا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ سستے ہوٹل سے جہاں دال یا شوربہ مفت ملتا ہے، وہ ایک وقت میں صرف دو روٹیاں کھاتا تھا۔ کنجوسی اور جزرسی اس کے کردار کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ اندازہ کریں کہ اُس نے کہیں مستقل رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ تھوڑے دن کے لئے کہیں ایک جگہ پناہ لے لیتا اور پھر کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتا تھا۔

ہر ہفتے کی شام کو ہم سب پاکستانی سری پتالنگ تبلیغی مرکز میں اکٹھے ہوا کرتے۔ بیان سننے کے بعد اجتماعی کھانا کھاتے اور پھر رات گئے تک اپنی آپ بیتیاں سناتے سناتے سو جایا کرتے۔

مؤرخہ 7 نومبر 1998ء کو نماز عصر کے بعد میں چاچا رحمت کی قیام گاہ پر گیا تا کہ اُسے اپنے ساتھ تبلیغی مرکز لے چلوں۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہے اور بغیر کسی دوا کے یونہی پڑا ہوا ہے۔ پتہ چلا کہ وہ صبح سے بھوکا بھی ہے۔ چنانچہ میں پانچویں فلور سے نیچے آیا۔ ایک میڈیکل سٹور سے دوائی اور دودھ اور کھانے کی کچھ چیزیں لے کر اس کے پاس گیا۔ چاچا نے دودھ پیا، ڈبل روٹی کھائی تو اس کی طاقت کچھ بحال ہوگئی۔ پھر مَیں نے اسے دوا کھلائی تو وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ دروازہ بند کردیں۔ آج مَیں آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

اور اس کے بعد چاچا رحمت نے جو واقعات سنائے انہوں نے مجھے خوفزدہ کر دیا اور میرے ذہن اور کردار پر بڑے ہی دوررس اثرات مرتب کئے۔ یہ عبرت ناک اور سبق آموز کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کیا خبر یہ کس کس کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔

چاچا رحمت نے بتایا: عزیز صاحب میرے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ تین بھائی اور دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ بدقسمتی سے میری طبیعت شروع ہی سے آوارگی کی طرف مائل تھی۔ آٹھویں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ چھوٹے بہن بھائیوں پر رعب گانٹھنا اور ہم عمر لڑکوں کی پٹائی کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جوان ہوا تو باقاعدہ بدمعاش بن گیا اور پھر ایک دن مَیں نے گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے زبردستی شادی کرلی۔

شادی کے بعد جلد میں نے باپ سے مطالبہ کیا کہ میرے حصے کی زمین میری ملکیت میں دے دیں۔ باپ نے پس و پیش کیا تو مَیں نے سختی کی اور باپ نے ساری زمین شرعی اعتبار سے ساری اولاد میں تقسیم کر دی۔ میرے حصے میں بیالیس ایکڑ آئے۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میری بیوی نے مجھے ترغیب دی کہ یہ جو باپ نے اپنے قبضے میں زمین رکھی ہوئی ہے، اس سے مطالبہ کرد کہ وہ بھی ہمیں دے دے۔ ماں باپ کو تو اب تین وقت کی روٹی کی ضرورت ہے، وہ ہم انہیں دے دیا کریں گے۔

مَیں نے باپ سے یہ بات کی تو اُس نے جواب دیا کہ دیکھو تمہارے حصے کی زمین مَیں تمہیں دے چکا ہوں۔ اس زمین کے بارے میں مَیں نے وصیت کی ہوئی ہے کہ میری وفات کے بعد یہ گاؤں کی مسجد اور مدرسے کو دے دی جائے ...... یہ زمین مَیں تمہیں نہیں دے سکتا۔

لیکن مَیں نے اصرار کیا کہ یہ زمین بھی میرے قبضے میں دی جائے اور جب باپ نے سختی سے انکار کیا تو میں نے اُسے گھونسوں اور مکوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اس پر بھی وہ نہ مانا تو مَیں اس کے سر پر جوتے مارنے لگا اور اتنے جوتے مارے کہ اُس کے کان سے خون بہنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ میں اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر ڈیرے پر چلا گیا۔

تقریباً دو گھنٹے گزرے تھے کہ میری ماں میرے

پاس آئی کہنے لگی کہ تمہارے باپ کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آتا تھا اور وہ تمہارے لئے دعا کرتا تھا۔ مَیں نے پوچھا کیا دعا کرتا تھا تو بتایا وہ کہتا تھا خدایا میرے بیٹے کو معاف کردے، اُسے ایسی اولاد نہ دے جو اُسے مارے، اس کی پٹائی کرے۔

ماں نے یہ بھی بتایا کہ تمہاری چھوٹی بہن نے اپنے حصے کی زمین تمہیں دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ اب خوش ہو جاؤ اور گھر چلو۔

مَیں بہن کا اعلان سن کر بہت خوش ہوا۔ اسے اپنی فتح سمجھا اور گھر آ گیا۔

چاچا رحمت نے بتایا عزیز صاحب! میرا باپ اس واقعے کے بعد گم صم رہنے لگا۔ وہ کوئی بات نہیں کرتا تھا، اسی حالت میں وہ ایک روز رات کو سویا اور صبح بیدار نہ ہوا۔ نیند ہی میں کسی وقت اُسے موت نے آ لیا تھا۔

چاچا رحمت نے بتایا۔ میری محبوب بیوی نے پانچ سال کے عرصے میں تین بیٹیوں کو جنم دیا اور پھر اسے کینسر کے موذی مرض نے آ لیا اور وہ دو سال تک شدید اذیت میں مبتلا رہ کر فوت ہو گئی۔ اس کے علاج پر مَیں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا حتیٰ کہ تقریباً نصف رقبہ مجھے فروخت کرنا پڑا مگر اس کی صحت بحال نہ ہوئی۔

اس کے بعد مَیں نے دوسری شادی کی۔ اس خاتون سے میری چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ چونکہ مجھے بیٹے کی شدید خواہش تھی اس لئے میں نے تیسری شادی کی لیکن لگتا ہے کہ باپ نے تو مجھے معاف کر دیا تھا مگر خدا نے معافی نہ دی اور تیسری بیوی سے بھی چار لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ اس طرح میرے گھر میں بیٹیوں کی تعداد گیارہ ہو گئی اور خدا نے مجھے ایک بیٹا بھی عطا نہ کیا۔ گویا باپ کی وہ دعا دردناک انداز میں قبول ہو گئی کہ خدایا میرے بیٹے کو ایسی اولاد نہ دینا جو اُسے مارے، جو اس کی پٹائی کرے۔

چاچا رحمت نے بتایا۔ عزیز صاحب! مجھ پر اللہ کی ناراضگی کا کوڑا پوری شدت کے ساتھ برسا۔ میرے رزق سے برکت بالکل ہی رخصت ہو گئی۔ ساری کی ساری زمین بک گئی، میری بہنوں اور بھائیوں نے میرا مکمل بائیکاٹ کر دیا اور جوان ہوتی ہوئی گیارہ بیٹیوں نے میری راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا۔ میری صحت برباد ہو گئی اور میں پائی پائی کا محتاج ہو گیا۔ حتیٰ کہ تنگ آ کر، خوفزدہ ہو کر میں یہاں آ گیا ہوں اور جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ نہ اچھا کھانا نصیب میں ہے، نہ اچھا لباس پہنتا ہوں۔ پیسہ پیسہ بچا کر بیویوں کو اور بیٹیوں کو بھیجتا ہوں مگر پھر بھی سکون کو ترس گیا ہوں۔ گیارہ بیٹیوں کے مستقبل کا خیال مجھے سانپوں کی طرح کاٹتا رہتا ہے اور میری زندگی جہنم کا نمونہ بن گئی ہے۔

یہ واقعہ سنانے کے دوران بھی چاچا رحمت بار بار اشکبار ہوتا رہا اور آخر میں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ خوف اور عبرت سے میرے بھی آنسو نکل آئے۔

چاچا رحمت جب مسلسل بیمار رہنے لگا اور مزید کمزور ہو گیا تو ہم پاکستانی دوستوں نے مل کر چندہ کیا۔ اُسے ٹکٹ خرید کر دیا اور وہ پاکستان آ گیا جہاں وہ ایک سال کے اندر اندر فوت ہو گیا۔

ظلم کا بھیانک انجام

یہ واقعہ مجھے اوکاڑہ کے بزرگ استاد ماسٹر علی احمد صاحب نے سنایا۔ موصوف 1933ء میں برج جیوے کے علاقہ (نزد اوکاڑہ) میں پیدا ہوئے لیکن نوجوانی میں سندھ چلے گئے۔ وہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازم ہو گئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ نواب شاہ میں گزارا۔ وہیں گورنمنٹ ہائی سکول میں ریاضی اور انگلش پڑھاتے رہے اور وہیں سے 1992ء میں ریٹائر ہو کر اپنے آبائی

علاقے میں واپس آ گئے۔

انہوں نے بتایا۔ 1982ء کی بات ہے میں نواب شاہ کے میں مارکیٹ روڈ نمبر 2 پر ایک مکان میں کرایہ دار تھا۔ یہ مکان ایک شخص مختار احمد کی بہن کا تھا اور مختار احمد ہی اس کا کرایہ وصول کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں کرایہ دینے کے لئے اس کے گھر گیا تو اُس کی بُری حالت تھی۔ وہ زاروقطار رو رہا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ تین سال پہلے بیوی فوت ہو گئی تھی اور ایک ہفتہ قبل اکلوتا جوان بیٹا قبر میں اتر گیا ہے اور میری اپنی زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے۔

میں نے تفصیل پوچھی تو اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔ میں پولیس میں ملازم تھا۔ ترقی کر کے ہیڈ کانسٹیبل بن گیا۔ ایک بار ڈاکے اور قتل کے ایک ملزم کو جیل سے عدالت تک پہنچانا تھا۔ اس روز فیصلے کی تاریخ تھی میرے ساتھ ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگی تھی۔ ہم دونوں نے ملزم کو جیل سے لیا اور چونکہ عدالت تک فاصلہ زیادہ نہ تھا، اس لئے ہم تینوں پیدل ہی چل پڑے۔

یہ راستہ کچھ ویران سا تھا۔ ایک جگہ تو اونچے قد کی بہت سی جھاڑیاں تھیں، بالکل جنگل کا منظر تھا، وہاں اُس ملزم نے بڑی لجاجت سے درخواست کی کہ میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ میری ایک ہتھکڑی کھول دیں اور اجازت دیں کہ جھاڑیوں کی اوٹ میں پیشاب وغیرہ کرلوں۔

ہمیں ترس آ گیا۔ ہم نے اُس کی ایک ہتھکڑی کھول دی اور وہ قریب ہی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ابھی اُسے بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کھلے منہ کی ایک گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آئی، اس میں سے سات آٹھ تنومند آدمی اترے، انہوں نے آناً فاناً ہماری رائفلوں پر قبضہ کیا۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھے، ہمیں جھاڑیوں میں پھینکا اور ملزم کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر یہ جا وہ جا۔ یہ سب کچھ پنجابی فلموں کے انداز میں اس قدر اچانک ہوا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ تاہم اُن لوگوں نے مہربانی یہ کی کہ جاتے وہ ہماری رائفلیں ہمارے قریب ہی پھینک گئے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ کوئی شخص اس راستے پر چلا آ رہا ہے۔ ہم نے جھاڑیوں کے اندر سے آواز دی کہ جانے والے ذرا ٹھہر جانا اور ہماری مدد کرنا۔ وہ آدمی ٹھہر گیا اور ہمارے قریب آ گیا۔ تب ہم نے اُسے اپنی بپتا سنائی کہ ہم پولیس ملازم ہیں، ڈاکو ہمیں بے بس کر کے یہاں پھینک گئے ہیں۔ مہربانی کرو اور ہمارے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھول دو۔

اس شخص نے ہمارے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیاں کھول دیں۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ شخص ہمدردی سے ہمارا حوصلہ بڑھانے لگا اور ہاتھوں سے ہمارے کپڑوں کی مٹی صاف کرنے لگا۔

جب تک ہم زمین پر گرے پڑے تھے، اُس وقت تک جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی لیکن اب نتائج وعواقب کے بارے میں سوچ کر میں تو چکرا کے رہ گیا۔ ''ہمارے ساتھ تو بہت ہی دردناک حادثہ ہوا ہے...... اب کیا ہوگا؟ اگر ہم اسی طرح خالی ہاتھ عدالت میں جاتے ہیں اور وہاں بتاتے ہیں کہ ایک ڈاکو اور قاتل اغوا کر لیا گیا ہے تو کوئی ہماری بات نہیں مانے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ انہوں نے کوئی بھاری رشوت لے کر ڈاکو اور قاتل کو بھگا دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں فوراً ملازمت سے برطرف کر کے گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہم پر لازماً مقدمہ چلے گا اور ہم کسی سخت سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ پھر کیا کیا جائے؟ بچت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ ہم شدید قسم کی پریشانی سے بچ جائیں؟

اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک عجیب شیطانی تجویز نے سر اٹھایا۔ ''پھر کیا ہے اگر ملزم بھاگ گیا ہے، اس کے بدلے میں ہمیں ایک بندہ تو مل گیا ہے، پھر اسے ہی کیوں استعمال نہ کیا جائے''۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میں اچھل کر اُس مہربان شخص پر حملہ آور ہو گیا اور مکوں اور تھپڑوں سے اسے پیٹنے لگا۔ میرا ساتھی کانسٹیبل حیران ہو گیا لیکن میں نے اسے ڈانٹا کہ یہی ہمارا ملزم ہے، پکڑ لو اور اس کی خوب ٹھکائی کرو۔ چنانچہ ہم دونوں نے مل کر اسے خوب خوب مارا۔ وہ بے چارہ تیورا کر گر پڑا۔ پہلے اس نے کچھ آہ و بکا کی مگر پھر اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ سرگھٹنوں میں دبا کر نیم مدہوش زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے پاس ایک فالتو ہتھکڑی موجود تھی، اس میں اُس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے اور کھینچتے ہوئے کچہری کی طرف چل پڑے۔ اس کشمکش میں ہم خاصے لیٹ ہو گئے۔ جج نے پوچھا کہ لیٹ کیوں ہوئے اور ملزم کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے تو ہم نے بتایا کہ اس نے ہمیں دھوکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی، اس لئے اسے قابو کرنے میں کچھ وقت صرف ہو گیا اور اس کی مرمت بھی کرنی پڑی۔ وہ مظلوم شخص ہماری بے رحمانہ مار سے اس قدر ہراساں ہو گیا تھا کہ عدالت میں اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور وہ خوفزدہ نظروں سے فضا میں بٹر بٹر دیکھتا رہا۔

سچ ہے قانون اندھا ہوتا ہے، جج نے اس روز مقدمے کا فیصلہ سنانا تھا چنانچہ اس نے کوئی تحقیق نہ کی اور تھوڑی دیر میں اس بے چارے کو موت کی سزا سنا دی۔ اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور ہم اُسے کھینچتے ہوئے جیل میں چھوڑ آئے''۔

ریٹائرڈ سب انسپکٹر مختار احمد آج اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ وہ روتا رہا اور ظلم کی داستان کی ساری جزئیات سناتا رہا۔ اس نے بتایا۔ ''ماسٹر صاحب! یہ ٹھیک

ہے کہ میری نوکری بچ گئی، مجھ پر کوئی مقدمہ بھی نہ بنا لیکن خدا کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ میرے ضمیر نے میرا جینا حرام کر دیا اور رات سونے کے لئے جب میں چارپائی پر لیٹا تو نیند کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر اس مظلوم دیہاتی کی شکل نظروں کے سامنے گھوم جاتی جسے میں نے کسی قصور کے بغیر پہلے بے رحمی سے مارا اور پھر پھانسی کی سزا دلوا دی۔ اور اس کی شکل مجھے ایسے کرب میں مبتلا کرتی کہ میں اٹھ کر بیٹھ جاتا...... پھر نیند غلبہ کرتی اور لیٹتا تو دوبارہ یہی صورت پیدا ہو جاتی...... آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں...... لیکن نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی...... ساری رات اسی کیفیت میں مبتلا رہا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی سکون کی نیند نہ سو سکا...... اور مسلسل بے خوابی اور شدید ذہنی و اعصابی دباؤ نے مجھے کئی بیماریوں میں مبتلا کر دیا...... معدہ خراب ہو گیا اور ٹانگوں میں درد رہنے لگا...... زندگی سے سکون اور راحت جیسے رخصت ہی ہو گئے۔

اللہ کی شدید ترین ناراضگی اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ اس واقعے کے چند ہی ماہ کے بعد میری بیوی یکایک فوت ہو گئی۔ وہ بظاہر بھلی چنگی تھی، چھوٹی موٹی عام تکالیف کے سوا اسے کوئی بیماری نہ تھی مگر اسے چند روز تک سر میں شدید درد ہوا اور اسی حالت میں ایک روز وہ دم توڑ گئی۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی، گھر کا سارا نظام ہی برباد ہو گیا۔ زچ ہو کر میں نے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنے آبائی شہر نواب شاہ میں آ گیا۔ یہاں میں نے کریانے کی ایک دکان کر لی۔ ایک بیٹا تھا وہ پڑھتا تھا...... سکول سے آ کر وہ دکان پر بیٹھ جاتا۔ مجھے کچھ آرام مل جاتا اور ساری ذہنی و جسمانی تکلیفوں کے باوجود زندگی کسی نہ کسی طرح گزرتی چلی گئی۔

لیکن لگتا یہ ہے کہ میں نے بھیانک قسم کے جس ظلم کا ارتکاب کیا تھا اللہ اس کے نتیجے میں مجھے آخری حد تک سزا دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک ہفتہ قبل میرے بیٹے کے پیٹ میں درد اٹھا اور شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ بہت علاج کیا، ڈاکٹروں، حکیموں کے ہاں دوڑتا رہا لیکن افاقے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ درد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، وہ تین دن تک تڑپتا رہا اور آخر کار مجھے یک و تنہا چھوڑ کر انتقال کر گیا۔ وہی میرا واحد سہارا تھا اور اسی کو میں دیکھ دیکھ کر جیتا تھا''۔

یہ عبرت ناک کہانی سناتے ہوئے مختار احمد زار و قطار روتا رہا، اُس نے بتایا۔ ''میری زندگی جہنم سے بدتر ہو گئی ہے۔ معدہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا، بھوک لگتی ہے، کچھ زہر مار کرتا ہوں تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ کھایا پیا حلق کو چڑھنے لگتا ہے اور پیٹ میں شدید مروڑ اٹھنے لگتے ہیں۔ پُرسکون نیند ایک عرصے سے خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہے۔ کبھی آنکھ لگتی ہے تو وہ دیہاتی جسے میں نے پھانسی تک پہنچایا تھا، آ دھمکتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کرتا ہے اور میں چیخ مار کر بیدار ہو جاتا ہوں اور تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔ موت کا خوف ہمہ وقت میرے سر پر سوار رہتا ہے۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ مر جاؤں تاکہ ہر وقت کی اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں لیکن بدقسمتی سے موت بھی نہیں آتی...... اور خودکشی کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے''۔

ماسٹر علی احمد صاحب نے بتایا کہ مختار احمد ایک عرصے تک عذاب کی اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ میں جب بھی اُسے ملتا، وہ حزن و ملال اور کرب کی شدید ترین کیفیت سے دوچار نظر آتا...... اور کم و بیش ڈیڑھ دو سال تک انتہائی عبرت ناک زندگی گزار کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔

(مصنف کی کتاب ''مکافاتِ عمل'' سے ماخوذ)

مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

پاکستانی اور کشمیری قوم کو آسیہ اندرابی پر فخر ہے کہ اس نے مقبوضہ کشمیر کی سرزمین پر پاکستان کا پرچم لہرایا اور پاکستانی قومی ترانہ بھی پڑھا۔

☆ گلزار اختر کاشمیری

23 مارچ کا دن پاکستان کی تاریخ میں اہم دن ہے۔ 23 مارچ 1940ء کو مینار پاکستان کے میدان میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام جلسہ عام میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئی راہ مل گئی۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک حاصل کرنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ جن علاقوں کے لوگوں کے معلوم تھا کہ یہ علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ ان علاقوں کے لوگوں نے بھی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بالآخر 14 اگست 1947ء کو برصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں ایک الگ مملکت مل گئی۔ تقسیم کے اصول کے مطابق کشمیر کو بھی پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہئے تھا۔ مگر ہندوؤں کی مکاری اور انگریز کی منافقت کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ پاکستان بننے کے بعد کشمیریوں کا بھی حوصلہ بڑھا کہ جدوجہد اور کوشش کرنے سے آزادی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

پاکستان کے قریب علاقے کے لوگوں نے نہتے ہوتے ہوئے بھی ڈوگرہ فوج کے خلاف بغاوت کی لاٹھیوں اور ٹوپی دار بندوقوں کی مدد سے شروع ہونے والا جہاد منظم ہوتا گیا۔ پونچھ، مظفر آباد، میرپور اور کوٹلی کے لوگوں نے اپنے علاقوں سے ڈوگرہ فوج کو مار بھگایا۔ اسی طرح گلگت اور بلتستان کے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اس طرح گلگت، بلتستان، کارگل اور لیپا کے دو اضلاع کے علاوہ باقی علاقہ آزاد ہو گیا مگر ہندوؤں نے مکاری کرتے ہوئے سری نگر ائرپورٹ پر بھارتی فوج اتار دی اور پھر بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے اقوام متحدہ میں دہائی دی کہ قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا ہے، فوری طور پر سیز فائر کر دیا جائے اور اقوام متحدہ کشمیریوں سے رائے لے کر کشمیر کا فیصلہ کر دے۔ پاکستانی حکومت نے بھی اس مؤقف کی حمایت کی۔ اس طرح جہاد رک گیا۔ جہاں تک قدم بڑھے تھے وہیں رک گئے۔

بھارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے قدم مضبوط کرنے شروع کئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد کشمیریوں کے حق خودارادیت سے انکار کر دیا کہ کشمیر تو بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، یہ الگ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کشمیریوں پر ایک نئی تاریک رات شروع ہو گئی۔ 1947ء اور 1948ء میں تین لاکھ سے زیادہ لوگوں کو شہید کیا گیا۔ بھارت کا مؤقف تھا کہ مسلمانوں کی تعداد کشمیر میں زیادہ ہے، لاکھوں لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ تین لاکھ سے زیادہ

لوگوں کو شہید کر کے مسلمانوں کی تعداد کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ کشمیریوں کی امید بن گئی تھی کہ شاید ان کی آزادی کے دن قریب آ گئے ہیں مگر آزادی دور ہوتی گئی۔ 1989ء میں پھر ایک امید بنی پورے کشمیر میں جہاد کی لہر اٹھی وادی اور جموں میں یکساں تحریک اٹھی مگر 9/11 کے بطن سے کئی مصلحتیں اور ضرورتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ پھر صدر پاکستان نے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ لگایا۔ اس نظریہ ضرورت کے بوجھ تلے سارا منظر ہی ڈوبتا چلا گیا۔ سارے منظر نامے پر دھند چھا گئی۔ کشمیریوں کی آہیں، امیدیں، آسیں اور تمنائیں ڈوبتی چلی گئیں۔ ایک بے مثال تحریک ہماری ضرورتوں اور مصلحتوں کے پہاڑ تلے دب گئی۔ اس وقت کی حکومت نے آزادی کے متوالوں کی طرف دیکھنے کے بجائے ان کے راز اور مجاہد کمانڈروں کی نشاندہی بھارت کو کر دی۔ پھر حریت کانفرنس کو دو ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا۔ کشمیریوں کے مقبول رہنما اور الحاق پاکستان کے داعی سید علی گیلانی کو چیئرمین شپ سے ہٹا دیا گیا۔ ہم نے کشمیریوں کو آسمان پر اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا۔

ہماری غفلت کی وجہ سے بھارت نے موقع جان کر سیز فائر لائن پر باڑ لگا دی۔ بھارت نے اپنی طرف سے ایک طرح گزرنے کا راستہ بالکل بند کر دیا ہے۔ کشمیری قیادت نے حالات کو دیکھتے ہوئے عسکری جدوجہد کم کر کے انتفادہ کی تحریک شروع کی۔ چھ سات سال انتفادہ کی تحریک چلائی گئی۔ ابھی پھر کشمیر میں ایک نئی تحریک اٹھ رہی ہے۔ 23 مارچ 2015ء کو مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کا یوم آزادی منایا گیا۔ پاکستان کا پرچم لہرایا گیا۔ کشمیر کی بیٹی آسیہ اندرابی کے والہانہ کردار پر پوری پاکستانی قوم اور کشمیری قوم کو فخر ہے جبکہ ہندوستانی انتہا پسند قیادت اور میڈیا پوری قوت سے چیخ و پکار کر رہا ہے۔ نریندر مودی اور اس کے ایجنٹ خون کے آنسو پی کر رہ گئے ہیں۔ آسیہ اندرابی نے خواتین کے جلسے میں پاکستانی جھنڈے لہرا کر پاکستانی قومی ترانہ ادب اور احترام سے پڑھا۔ ان پر مقدمات قائم ہو گئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں آسیہ اندرابی نے بیان دیا میں نے بھارت کی سرزمین پر پاکستانی قومی ترانہ نہیں پڑھا اور نہ پاکستانی جھنڈا لہرایا بلکہ میں نے یہ سارا کام کشمیر کی سرزمین پر کیا۔ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے، بھارت کا حصہ نہیں ہے۔ کشمیر کی بیٹی نے اپنے حصہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی طرح سید علی گیلانی، مسرت عالم اور دیگر کشمیری رہنماؤں نے ایک بڑے اجتماع میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے عزم کا اعادہ کیا۔ پاکستانی جھنڈے لہرائے اور ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے لگوائے۔

بھارت نے جموں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے جلسے میں ''جے ہنومان جی'' کے نعرے لگوائے تھے۔ مودی سرکار نے کشمیر میں بھی نقب لگا کر حکومت حاصل کر لی تھی۔ اپنی دانست میں نام جہاد حکومت میں حصہ داری حاصل کرنے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید کشمیری اب سر نہیں اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ ان کی نسل کشی جس بے رحمی سے ماضی قریب میں ہوئی اس کی مثال انسانی ظلم و ستم کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ مقبوضہ کشمیر میں ریلی کے دوران پاکستانی پرچم لہرانے اور پاکستان کے حق میں نعرے بازی کرنے پر حریت رہنما مسرت عالم کو گرفتار کیا گیا جبکہ علی گیلانی اور شبیر شاہ کو نظر بند کر دیا گیا۔ بھارتی فوج نے مشتاق الاسلام کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان رہماؤں اور کارکنان کی گرفتاریوں کے خلاف سری نگر میں میر واعظ عمر فاروق کی قیادت میں ایک اور ریلی نکالی گئی جس پر بھارتی فوج نے فائرنگ کر دی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں چودہ کشمیری زخمی ہو گئے۔

دنیا دیکھ رہی ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج ریاستی دہشت گردی کر رہی ہیں۔ وہاں پاکستان کے پرچم

لہرانا کشمیریوں کے جذبات ہیں جنہیں طاقت کے زور پر دبایا نہیں جا سکتا۔ مودی حکومت طاقت کے زور پر کشمیریوں کو دبانا چاہتی ہے۔ حریت قیادت نے اعلان کیا ہے کہ انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مقبوضہ کشمیر میں ترال کے مقام پر بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہونے والے طالب علم خالد مظفر کی شہادت کی فوری اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کروائے اور واقعے میں ملوث اہلکاران کے خلاف سول کورٹ میں مقدمہ چلایا جائے۔ سری نگر میں مظاہرے میں بھارتی پرچم کو آگ لگا کر کشمیریوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

کشمیر سے پاکستان کا ایک روحانی تعلق ہے۔ کشمیری پاکستان سے صرف دلی پیار ہی نہیں کرتے بلکہ پاکستان کو مکہ اور مدینہ کے بعد بڑی مقدس سرزمین سمجھتے ہیں۔ کشمیریوں کی فطرت میں ہی پاکستان سے محبت ہے۔ آج پھر مقبوضہ کشمیر میں عوام پاکستان کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ سات لاکھ بھارتی فوج کی موجودگی میں یہ ہو رہا ہے۔ وہ بھارتی فوجیوں کی موجودگی میں بھارت کا پرچم نذر آتش کر رہے ہیں۔ کسی کشمیری نوجوان پر جب کوئی بھارتی فوجی تشدد کرتا ہے تو وہ نوجوان پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ آج ایک نوجوان مسرت عالم کو بھارتی ہدایت پر مفتی حکومت نے ایک دفعہ پھر گرفتار کیا ہے۔ ان کا قصور بھی یہ ہے کہ انہوں نے سری نگر میں جلسے میں پاکستان کا پرچم لہرایا اور جیوے جیوے پاکستان اور کشمیر بنے گا پاکستان کے نعرے لگائے۔ جب سے پاکستان بنا ہے کشمیری یہ نعرے لگا رہے ہیں۔ وہ کشمیر میں بھارتی فوج کی بندوق اور گولی کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے ہیں۔ بھارت یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ کشمیر پاکستان کو دے دے۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق مقبوضہ کشمیر کرۂ ارض کا سب سے بڑا فوجی علاقہ ہے جہاں اسی لاکھ نہتے مسلمان عوام کے خلاف آٹھ لاکھ سے زائد باقاعدہ بھارتی فوج موجود ہے۔ بارڈر سکیورٹی فورس پولیس اور ہندو تنظیموں کے مسلح دستے اس کے علاوہ ہیں۔ جو قتل و غارت، عصمت دری لوٹ مار کے علاوہ گھروں اور بستیوں کو جلانے میں مصروف ہیں۔

یہاں بھارتی فوجیوں کو کشمیری مسلمانوں کو غیر انسانی اور غیر قانونی قتل عام کے تحفظ کے لئے سیاہ ترین قانون ''ٹاڈا'' اور ''پوٹا'' موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک و دہشت گرد قانون ''انڈین آرمڈ فورسز اسپیشل پاور ایکٹ'' ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جس کو چاہو مار دو اور جس کی چاہو عزت لوٹ لو۔ جس کو چاہو گرفتار کر لو یا زندہ قبر میں دفن کر دو۔ جس گھر یا بستی کو چاہو جلا دو یا بستیاں لوٹ لو۔ تمہیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ بھارتی آرمی چیف نے دو سال پہلے سری نگر یونیفائیڈ ہیڈ کوارٹر میں ہندوستانی اعلیٰ حکام کو بریفنگ دیتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ اگر اس قانون کو ختم کر دیا گیا تو ہندوستان کو مجبوراً 2016ء تک کشمیر کو آزاد کرنا پڑے گا۔ مقبوضہ کشمیر میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کسی گھر سے کسی بے گناہ کا جنازہ نہ اٹھتا ہو نوجوانوں پر گولیاں نہ چلائی جاتی ہوں۔ گھروں کو نہ جلایا جاتا ہو۔ مسلمان خواتین کی عزتیں نہ پامال کی جائیں اور نوجوانوں کو گمنام قبروں میں نہ گاڑا جاتا ہو۔ اس خون آشام ظلم کے باوجود کشمیریوں کا عزم اور جذبہ آزادی روز بروز جواں ہوتا جا رہا ہے۔ وہ آئندہ نسلوں کے لئے آزادی کے پودے کو اپنے سرخ تازہ خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ ان کا نعرہ ہے ''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے''۔

کشمیری مسلمان تو اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں، اس امید پر کہ آخر پاکستان سے کوئی تو ہمیں آزادی دلوانے آگے بڑھے گا۔ جن لوگوں سے وہ ملنا چاہتے ہیں ان پر بھی کچھ ذمہ داریاں بن رہی ہیں۔ بھارت کبھی بھی نہیں چاہے

گا کہ کشمیر پاکستان کے حوالے کردے۔اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ بھارت پر سیاسی، معاشی، سفارتی اور عسکری دباؤ ڈالا جائے۔اخلاقیات ہندو کی سمجھ سے بالاتر بات ہے۔دنیا بھر میں مہم چلائی جائے، جنگ بندی لکیر پر تعینات اقوام متحدہ کے مبصرین کو متحرک کیا جائے۔اسلام آباد میں دنیا بھر کے سفارتی مشنز میں سفارتی ڈیسک قائم کئے جائیں۔ان کے ذریعے سفارت خانوں کو ہفتہ وار بریفنگ دی جائے۔اسی طرح دنیا میں جہاں جہاں بھی پاکستانی سفارت خانے ہیں ان میں کشمیریوں کے ڈیسک بنائے جائیں۔ان میں کشمیریوں کو شامل کیا جائے اسی طرح مقبوضہ کشمیر سے آنے والے مہاجرین کے ذریعے جہاں وہ غیر محسوس طریقے سے دنیا کی اہم شخصیات کو براہ راست بھارت کے ظلم وستم سے آگاہ کرسکیں۔ورنہ کشمیری مرتے رہیں گے ان کی بستیاں اجڑتی رہیں گی۔وہ بھارتی جیلوں میں اور انٹروگیشن سینٹروں میں معذور ہوتے رہیں گے۔وقت جیسے پہلے گزر رہا تھا ایسے ہی گزر جائے گا۔سید علی گیلانی، مسرت عالم اور آسیہ اندرابی جیسے لوگ ضائع ہو جائیں گے۔یہاں اور وہاں اقتدار کا کھیل اسی طرح جاری رہے گا۔خالی بیان بازی سے کام نہیں چلے گا۔بھارت کشمیر سے نکلنے والے دریاؤں پر متعدد ڈیم بنا کر اور سرنگیں بنا کر پاکستان کی طرف آنے والے پانیوں کا رخ بدل رہا ہے۔اگر کشمیر جلد ہمیں نہ مل سکا تو بھارت پاکستان کو بنجر بنانے کا پورا بندوبست کررہا ہے۔وہ ضرورت کے وقت پاکستان کی طرف پانی نہیں آنے دے گا اور بارشوں اور سیلاب کے دوران سارا پانی پاکستان کی طرف کھول کر مصنوعی سیلاب پیدا کرکے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

بھارتی عدلیہ کا کردار

بھارت میں جہاں انتہا پسند حکومت مسلمانوں کے خلاف منصوبے بناتی رہتی ہے شیوسینا اور جنتا دل جیسی تنظیمیں مسلمانوں کے خلاف منصوبے بناتی رہتی ہیں وہاں ہندوستانی عدلیہ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ہندوستانی عدلیہ کا شرمناک کردار ملاحظہ ہو۔گزشتہ سالوں میں جب بین الاقوامی دباؤ پر کشمیر میں کچھ فوجیوں کو گرفتار کیا گیا اور عدالتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔سنگین جرائم ثابت ہونے کے باوجود ان فوجیوں کو باعزت رہا کردیا گیا۔یہ وہی فوجی ہیں جن کے بارے میں انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' کے سابق جنرل سیکرٹری نے بھارتی وزیر خارجہ کو خط لکھا کہ ان فوجیوں کے گھناؤنے جرائم پر سخت سے سخت سزا دی جائے۔بھارت نے حسب عادت تاخیری حربے استعمال کرتے ہوئے آج تک اس پر عمل نہیں کیا بلکہ بھارتی افواج نے پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ مظالم میں اضافہ کردیا ہے۔

بھارتی عدالتوں نے اپنا گھناؤنا کردار ادا کرتے ہوئے کشمیری رہنما افضل گورو کی سزائے موت کے فیصلے میں لکھا کہ چالان کے مطابق بھارتی حکومت اور پولیس افضل گورو پر الزامات ثابت نہیں کرسکی ہے مگر چونکہ بھارتی عوام افضل گورو کو موت کی سزا دلوانا چاہتے ہیں اس لئے اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جرم ثابت تو نہیں ہوا مگر سزائے موت کو عوام کی مرضی سے جوڑ کر اسے سزا دے دی۔

بھارتی گجرات میں سابقہ وزیراعلیٰ موجودہ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کے ہاتھوں ہزاروں مسلمانوں کے قتل عام کیس کو بے اثر کردیا۔مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگنے والے کو بری کردیا۔

آزادی کشمیر کے ہیرو مقبول بٹ کو پھانسی دے کر تہاڑ جیل میں دفن کروادیا۔

شیخ عبدالعزیز کشمیری رہنما کو بھارتی فوج نے لاکھوں کشمیریوں کے ساتھ آزاد کشمیر کی طرف مارچ کرتے ہوئے شہید کردیا مگر مقدمہ گول ہوگیا۔اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی عدالتوں میں سزا کے لئے مسلمان ہونا ہی کافی ہے۔خواہ اس کی بے گناہی کی گواہی پوری دنیا دے۔ ان عدالتوں کا تعصب اس بات سے نمایاں ہے کہ دہلی کی ایک خاتون سے زیادتی کرنے والے لوگوں کو انتہائی تیزی سے کارروائی کرتے ہوئے سزا دی کیونکہ وہ لڑکی ہندو تھی اور مجرم زیادہ تر نچلی ذات کے تھے اور یہی عدالتیں مقبوضہ کشمیر میں پورے گاؤں کی مسلمان عورتوں کی انسانیت سوز بے حرمتی کرنے والے فوجیوں کے ... ف عینی گواہ موجود ہونے اور پوری نشاندہی کرنے کے باوجود آج تک کسی فوجی کو سزا نہیں دی گئی۔ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کے قتل عام میں گلاب سنگھ سے لے کر آج تک جتنی بھی ہندوستان کی حکومتیں خواہ کانگریس ہو یا بھارتیہ جنتا پارٹی فوج ہو یا ایجنسیاں وہشت گرو تنظیمیں انتہا پسند ہندو جیسے نریندر مودی، بال ٹھاکرے اور عدلیہ سب برابر کے شریک ہیں۔ ہندو عدلیہ کا کردار کشمیر میں 1910ء میں بھی ہندو کے لئے اور تھا اور مسلمان کے لئے اور، آج بھی ہندو کے لئے اور ہے اور مسلمان کے لئے اور ہے۔ افضل گورو کی موت کا فیصلہ تاریخ میں ان کی عدلیہ کے سیاہ کردار کو نمایاں کرتا رہے گا۔

بھارتی مسلمانوں کے لئے عذاب کا مہینہ

5 مارچ 2015ء بھارت کی ریاست ناگالینڈ میں دارالحکومت دیما پور شہر میں 10 ہزار سے زائد ہندو بلوائی جمع ہوئے۔انہوں نے پہلے بنگلہ زبان بولنے والوں کے خلاف مظاہرہ کیا پھر اچانک دیما پور جیل میں حملہ کیا۔ جیل کی سکیورٹی پر مامور CRPF نے بلوائیوں کو راستہ دے دیا۔ بلوائی مین گیٹ کھول کر اندر گئے اور لاک اپ میں بند ایک مسلم نوجوان کو نکال لائے۔ باہر نکال کر اس نوجوان کے سب سے پہلے کپڑے پھاڑے گئے، ہزاروں لوگ اسے مارتے ہوئے رسی سے باندھ کر سڑک پر گھسیٹتے رہے۔ اس طرح آٹھ کلومیٹر تک اسے مارتے ہوئے بھگاتے رہے۔ اس کی تصویریں بناتے رہے اور انٹرنیٹ پر بھیجتے رہے۔ نوجوان نڈھال ہو کر گر پڑا تو ہجوم نے اسے کچل ڈالا اور اس کی لاش کو درخت کے ساتھ لٹکا یا گیا۔

معلوم ہوا اس نوجوان کا نام محمد فرید تھا، وہ ضلع کریم گنج کا رہنے والا تھا، اس پر الزام تھا کہ اس نے ایک بیل ذبح کیا ہے۔ 7 مارچ کو ریاست کے ایک پولیس آفیسر نے تسلیم کیا کہ محمد فرید خان تک پہنچنے کے لئے پولیس نے بلوائیوں کی رہنمائی کی تھی مگر ہندوستان میں ایسی سینکڑوں کارروائیوں کی طرح پولیس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ سات مارچ کو محمد فرید خان کا نماز جنازہ ہوا تو ہندوؤں نے مسلمانوں کی املاک تباہ کرنا شروع کر دیں اور پولیس پھر تماشائی بنی رہی۔

7 مارچ بھارتی شہر حیدر آباد بابن صاحب پہاڑی علاقہ میں واقع ہاشمی کالونی میں رات نو بجے ہندو بدمعاش شراب کے نشے میں بدمست راہ چلتے مسلمان میاں بیوی پر پل پڑے۔ یہ مسلمان جن کا نام شیخ مستان تھا، نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو بدمعاشوں نے انہیں زخمی کر دیا۔ قریبی قلعہ مسجد سے نمازی فارغ ہو کر نکلے، امام مسجد مفتی محمد محمود اور مؤذن سہیل احمد نے شیخ کو بچانے کی کوشش کی تو انہیں بھی بری طرح ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ پولیس نے ان کی ایف آئی آر تک درج نہیں کی۔ 6 مارچ کو ہندوستان میں ہولی کا تہوار تھا۔ بمبئی میں ہندوؤں نے ایک مسجد سے نماز ظہر پڑھ کر فارغ ہونے والے مسلمانوں پر رنگ پھینکا جس پر جھگڑا ہوا۔ اس دوران تین مسلمان نوجوانوں کو چھرا گھونپ کر شہید کر دیا گیا۔

▲

تلخیص

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

اسمٰعیل سوان === خود آپ اپنے جال میں

قسط:15 ☆ ------------------0300-4154083------------------ میاں محمد ابراہیم طاہر

ناہوم ایڈمونی (Nahum Admoni) کے بطور ڈائریکٹر جنرل موساد خاتمے کا آغاز جولائی 1986ء کی سہ پہر بون، جرمنی کی ایک سڑک پر پیش آنے والے معمولی واقعہ سے ہوا۔ یہ گلیاں اور سڑکیں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے فوراً بعد جرمنی کی تعمیر نو کے دوران تعمیر کی گئی تھیں۔ چالیس سال گزرنے کے بعد یہ سڑک معروف شاہراہ کا روپ دھار چکی تھی جس پر خوبصورت گھروں کے سامنے پھولوں کے باغیچے اور عقب میں سرسبز گھاس کے قطعات جنم لے چکے تھے لیکن ان گھروں کے سکیورٹی سسٹم خفیہ طریقے سے سامنے کے آہنی گیٹوں اور نچلی کھڑکیوں کے پیچھے چھپایا گیا تھا اور دیواروں کے اوپر حفاظت کے لئے ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے شیشے استعمال کئے گئے تھے۔

گلی کے کسی رہائشی نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو گلی کی نکر پر بنے ٹیلیفون بوتھ میں ایک پلاسٹک بیگ چھوڑ گیا تھا۔ پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے اچانک اسے دیکھ لیا اور اسے چیک کرنے کے لئے رک گئی۔ بیگ میں تازہ تیار کردہ آٹھ خالی برٹش پاسپورٹ تھے۔ مقامی تحقیقاتی ادارہ ''بندس کریمنال ایمت، بی کے اے (BKA)'' جو امریکہ کی ایف بی آئی کے برابر کی حیثیت رکھتا تھا، اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پاسپورٹ دہشت گرد گروپوں کے استعمال کے لئے تھے جو ان دنوں یورپ کے شہروں کی گلیوں اور بازاروں کو دہشت گردی کا نشانہ بنائے ہوئے تھے اور ایک تسلسل کے ساتھ بم دھماکے اور اغوا کی وارداتیں کر رہے تھے۔

دنیا بھر کی اقلیتوں کے یہ دہشت گرد بزور طاقت اپنے اپنے مقاصد کے حصول اور بین الاقوامی سطح پر اپنا ایجنڈا منوانے کے لئے مصروف کار تھے۔ انہیں طلباء کی رجعت پسند سیاست سے تعاون اور مدد مل رہی تھی جو برطانیہ اور براعظم کے دیگر ممالک میں زیر تعلیم تھے۔

1968ء سے، جب ایک فلسطینی انقلاب پسند نوجوان خاتون لیلیٰ خالد (Leila Khalid)، جس نے لندن جانے والا ایک مسافر بردار جیٹ طیارہ اغوا کر لیا تھا اور جسے جلد ہی رہا کر دیا گیا تھا کیونکہ برطانوی حکومت مزید ایسے حملوں سے خوفزدہ تھی۔ معصوم طلباء نے پی ایل او کے حق میں اور حکومت کے خلاف نعرے ایجاد کر لئے تھے۔ ان متوسط طبقے کے بنیاد پرست طالب علموں کو پی ایل او سے عشق ہو گیا تھا اور اسے حقیقی معنوں میں آزادی کے لئے لڑنے والی تنظیم سمجھنے لگے تھے۔ وہ نشہ آور ڈرگ لینے کی بجائے بورژوا طبقے کی جانیں لینے لگے اور احتجاجاً دھرنے دینے کی بجائے یرغمال بنانے لگے تھے۔

جرمن تحقیقاتی ایجنسی بی کے اے نے یہ فرض کر لیا کہ پاسپورٹوں والا بیگ کسی ایسے سٹوڈنٹ سے رہ گیا ہے جو اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا ذمہ دار تھا اور کسی دہشت گرد گروپ کے لئے کام کر رہا تھا۔ دہشت گرد گروپوں کی فہرست تکلیف دہ حد تک طویل تھی جس میں آئی ار اے سے لے کر جرمن کے اپنے ریڈ آرمی (Red Army) گروپ اور غیر ملکی گروپ جیسے آئی این ایف ایس اسلامک نیشنل فرنٹ آف سوڈان، ای ایل این نیشنل لبریشن آرمی آف کمبوڈیا، ایم ڈی آر اے دی انگولا لبریشن موومنٹ یا ایل ٹی ٹی ای دی تامل ٹائیگرز (آف سری لنکا)۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی تنظیمیں وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اپنے گروپ اور شاخیں قائم کئے ہوئے تھیں۔ ان میں سے کوئی ان پاسپورٹوں کو استعمال کر کے جرمنی میں برطانوی ملٹری ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتا تھا یا برطانیہ کا سفر اختیار کر کے وہاں خون خرابہ کر سکتا تھا۔

مغربی یورپ کی ایک بڑی شاہی طاقت ہونے کے باوجود بنیادی طور پر برطانیہ کو اب تک صرف آئی آر اے کے دہشت گردوں سے ہی لگاتار واسطہ پڑتا تھا لیکن اس کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے حکومت کو وارننگ دے رکھی

تھی کہ ممکنہ طور پر کسی وقت لندن سے اپنے ملکوں کے خلاف دہشت گرد گروپ کارروائیاں شروع کر کے برطانیہ کو اپنی خفیہ کارروائیوں اور مہم پردازیوں میں گھسیٹ سکتے تھے۔ اس کی ایک جھلک تو اس وقت نظر آ گئی جب 1980ء میں تہران حکومت کے ایک مخالف گروپ نے ایرانی سفارتخانے پر قبضہ کر لیا۔ جب مذاکرات ناکام ہو گئے تو تھیچر گورنمنٹ نے قبضہ چھڑانے کے لئے ایس اے ایس کے جوان بھیج دیئے جنھوں نے دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعے کی پبلسٹی اور تشہیر نے لندن میں بیٹھ کر مڈل ایسٹ کے منصوبہ بندی کرنے والے گروپوں کی حوصلہ شکنی کی اور اس کی بجائے مختلف متحارب گروپوں کی آپس کی لڑائیوں اور چپقلش کے لئے پیرس (Paris) میدان جنگ بن گیا، خصوصاً یاسر عرفات کی پی ایل او اور ابوندال (Abu Nidal) اور اس کے بندوق برداروں کے درمیان موساد نے بھی پیرس کی سڑکوں اور گلی محلوں میں اپنے عرب دشمنوں کو قتل کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔

جرمن خفیہ ایجنسی بی کے اے کو یقین تھا کہ ٹیلیفون بوتھ سے پاسپورٹوں کا ملنا مزید قتل و غارت کا ثبوت تھا۔ اس ایجنسی نے اپنی بالاتر انٹیلی جنس ایجنسی بی این ڈی بندلیس نافریٹن ڈینسٹ، جو امریکن سی آئی اے کے برابر ہے، کو اطلاع دی جس نے برطانوی ایم آئی-6 کے رابطہ افسر کو، جو بی این ڈی کے ہیڈ کوارٹر پلاخ جو شمالی جرمنی میں واقع دفتر سے منسلک تھا، مطلع کر دیا۔ لندن میں ایم آئی-6 نے ثابت کیا کہ یہ پاسپورٹ انتہائی مہارت سے جعلی تیار کئے گئے تھے۔ انہوں نے اس کام کے سلسلے میں آئی آر اے اور دوسرے گروپوں کو فہرست سے خارج کر دیا کیونکہ ان کے پاس اتنے اعلیٰ درجے کے کاغذات و دستاویزات تیار کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اب توجہ کے جی بی (KBG) کی طرف مبذول ہو گئی۔ ان کے ماہرین دنیا کے بہترین جعلساز تھے۔ یقینی طور پر روسیوں کے پاس بے حساب پاسپورٹ (جعلی) موجود تھے لیکن ان کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ ٹیلیفون بوتھ ان کے لینے دینے کے لئے استعمال کئے جائیں۔ جنوبی افریقہ کی سیکورٹی ایجنسی ''باس'' (BOSS) کو بھی فہرست سے نکال دیا گیا۔ اس نے عملاً یورپ میں اپنی سرگرمیاں بند کر دی تھیں اور افریقی ممالک میں پیچیدہ برٹش پاسپورٹ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتے تھے، جہاں اب BOSS کی سرگرمیاں محدود ہو گئی تھیں اب ایم آئی-6 کی توجہ ایک اور انٹیلی جنس ایجنسی کی طرف چلی گئی جو ان پاسپورٹوں کو کامیابی سے بنا اور استعمال کر سکتی تھی۔۔۔ ''موساد''۔

اسرائیلی سفارتخانے کے ایک سینئر افسر اری ریگیف (Ari Regeve) جو لندن میں موساد کا ایجنٹ بھی تھا، کو ایم آئی-6 نے اس معاملے پر گفتگو کے لئے اپنے دفتر بلایا اور ایک سینئر افسر سے ملاقات کی دعوت دی۔ ریگیف نے کہا کہ وہ پاسپورٹوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ یہ معاملہ تل ابیب کے ساتھ اٹھائے گا۔ وہاں سے ناہوم ایڈمونی کا بڑا سخت جواب آیا کہ پاسپورٹوں کا موساد کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ یہ کام مشرقی جرمنی کی خفیہ ایجنسی کا ہو سکتا ہے۔ موساد نے کچھ ہی عرصہ پہلے سراغ لگایا ہے کہ سٹاسی (STASI) مشرقی جرمنی کی خفیہ ایجنسی، ان مایوس یہودیوں کو جو اسرائیل کا سفر کرنا چاہتے تھے، نقد رقم کے بدلے جعلی پاسپورٹ فروخت کر رہی تھی۔ ایڈمونی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جعلی پاسپورٹ موساد کے جعلسازوں کی ایجاد تھے اور ان ایجنٹوں کے استعمال کے لئے جو یورپ میں خفیہ کارروائیوں میں مصروف تھے تاکہ وہ آسانی سے برطانیہ میں آ جا سکیں۔

جب رافی ایتان (Rafi Eitan) موساد کا ڈائریکٹر جنرل تھا تو اس نے ایم آئی-5 (MI-5) کے

ساتھ سمجھوتہ کیا تھا کہ موساد برطانیہ کے اندر جو بھی آپریشن کرے گی ای آئی-5 کو باخبر رکھے گی لیکن اس کے باوجود اسرائیلی خفیہ ایجنسی نے پُراسرار طریقے سے انگلینڈ کے اندر ایک خفیہ ایجنٹ اس مقصد کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ شاید موساد کو پی ایل او کے کمانڈر، الائٹ سپیشل فورس یونٹ 17 کو قتل کر کے یاسر عرفات کو تھیچر حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھانے سے باز رکھا جا سکے۔

لندن میں اب یاسر عرفات کا نام دہشت گردی سے وابستہ نہیں تھا۔ تھیچر آہستہ آہستہ اس بات کی قائل ہو گئی تھی کہ وہی مشرق وسطیٰ میں منصفانہ اور مستقل امن لا سکتا ہے جس سے فلسطینیوں کے حقوق اور اسرائیل کے تحفظ کی ضمانت مل سکے گی لیکن یہودیوں کو اس میں بہت زیادہ شک تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ صرف دہشت گردی ہے جو پی ایل او کو موجودہ مقام تک لائی ہے اور یہ تنظیم آئندہ بھی اپنی دہشت گردانہ کارروائیاں جاری رکھے گی تاوقتیکہ اس کی تمام ڈیمانڈز پوری نہ کر دی جائیں۔ یہ کوئی پہلی دفعہ نہ ہوا تھا کہ لندن نے تل ابیب کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ موساد لگاتار برطانیہ کو ایسے ملک کے طور پر دیکھ رہی تھی جو ایرانی سفارتخانے پر قبضے کے باوجود فلسطینیوں کے حقوق کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا جا رہا تھا۔ موساد کے اندر پہلے ہی اس بات پر ناراضگی پائی جا رہی تھی کہ پی ایل او نے کس طرح امریکن سی آئی اے کے اندر اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔

امریکہ اور پی ایل او کے درمیان روابط کے بارے میں بعد ازاں امریکہ کے سابقہ سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کسنجر نے اپنی یادداشت بعنوان ''ییرز آف اپ ہیول'' (Years of Up-Heaval) (طوفانی انقلاب کے سال) میں لکھا تھا کہ سوڈان میں امریکہ کے سفیر کے خرطوم میں گولی مار کر قتل کئے جانے کے چھ ہفتے بعد جو بلیک ستمبر نامی تنظیم نے کیا تھا، 3 نومبر 1973ء کو ایک خفیہ میٹنگ سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ورنن والٹرز (Vernon Walters) اور یاسر عرفات کے درمیان ہوئی تھی جس کے نتیجے میں امریکہ اور پی ایل او کے مابین ایک عدم جارحیت کا معاہدہ ہوا تھا۔ آگے چل کر کسنجر نے لکھا۔ اس کے بعد امریکیوں پر حمل، یاسر عرفات کے گروپ کی حد تک بند ہو گئے۔

موساد کے اس وقت کے سربراہ یزہاک ہوفی کو جب اس معاہدے کا پتہ چلا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس نے کہا اس کی زندگی بھر کے تجربے میں اس سے بُری مثال نہیں گزری۔ اس نے اپنے خفیہ ذرائع سے سی آئی اے والٹرز سے کہا کہ وہ معاہدہ منسوخ کر دے۔ سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے جواب دیا کہ یہ ممکن نہیں اور ہوفی کو انتباہ کیا کہ اگر موساد نے اس انتہائی خفیہ معاہدے کی خبر کو افشاء کرنے کی کوشش کی تو واشنگٹن اسے غیر دوستانہ اقدام سمجھے گا۔ یہ اشارہ موساد کے نفسیاتی شعبہ جنگ کی طرف تھا جو اپنے پروردہ صحافیوں کے ذریعے بلیک میلنگ کا عادی تھا۔

ہوفی کا غصہ اس وقت پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یاسر عرفات نے اس معاہدے پر عمل درآمد اور نگرانی کے لئے کس کو مقرر کیا ہے۔ علی حسن سلامح (Ali Hassan Salameh) المعروف ''ریڈ پرنس'' بلیک ستمبر نامی تنظیم کا گروپ لیڈر جس نے اولمپک گیمز کے دوران میونخ میں اسرائیلی کھلاڑیوں کے قتل کی منصوبہ بندی کی تھی اور جس نے امریکی سفیر کو خرطوم (سوڈان) میں قتل کروایا تھا۔ سلامح جس کی زندگی بعد میں موساد کے نئے سربراہ رافی ایتان کی منصوبہ بندی سے ایک زوردار بم دھماکے کے نتیجے میں ختم ہو گئی تھی۔

1973ء میں سلامح پی ایل او کا سب سے معزز اور قابل احترام شخص تھا لہٰذا یاسر عرفات کو اسے سی آئی اے

سے رابطہ کار مقرر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔ دراصل جس چیز نے موساد کو چکرا کے رکھ دیا وہ یہ تھی کہ سی آئی اے نے ریڈ پرنس (Red Prince) کو میونخ کے قتل عام اور خرطوم (سوڈان) میں اپنے سفیر کے قتل کے صرف ایک سال بعد ہی اسے ابطہ کار تسلیم کرلیا۔

جلد ہی سلامہ لینگلے (Langley) (ورجینیا) میں واقع سی آئی اے کے ہیڈکوارٹرز کا باقاعدگی سے آنے جانے والا مہمان تھا۔ ریڈ پرنس اکثر ورنن والٹرز کی معیت میں ایجنسی کے ماربل کے فلور پر چہل قدمی کرتا ہوا ہیڈ کوارٹرز میں داخل ہوتا، سیکیورٹی گارڈز کے قریب سے گزرتا اور لفٹ میں سوار ہوکر عمارت کی ساتویں منزل پر، جہاں والٹرز کا وسیع دفتر واقع تھا، پہنچا کرتا تھا۔ ان کی ملاقاتیں کبھی کبھار دفتر کے خصوصی طعام کے کمرے میں سینئر افسروں کے ساتھ کھانے میں شمولیت کے لئے ملتوی ہوتی تھیں۔ ریڈ پرنس کے کھانے کا بل باقاعدگی سے والٹرز ہی ادا کیا کرتا تھا۔ لینگلے میں فری لنچ کا کوئی تصور نہ تھا۔

سلامہ اور سی آئی اے کے درمیان کیا بات چیت ہوتی اور کون کون سے معاملات زیر بحث آتے تھے۔ اب تک ایک راز ہی ہے۔ بل بکلی (Bill Buckley) جو بیروت (لبنان) میں سی آئی اے کا سیشن چیف تھا اور بعدازاں دہشت گردوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا، کہا کرتا تھا کہ امریکنوں کے دلوں اور دماغوں کو پی ایل او کے حق میں تبدیل کرنے میں سلامہ کا بنیادی کردار تھا۔ وہ ایک کرشماتی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دوسروں کو قائل کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس وقت بحث میں پڑنا ہے اور کب دوسرے کی بات سننی ہے اور انٹیلی جنس کے نقطہ نظر سے وہ نہایت اونچے درجے کا مخبر تھا۔

اس کی پہلی مثال اس وقت سامنے آئی جب امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کسنجر کے امن مشن کے بیروت کے دورے سے پہلے اس نے سی آئی اے کو انتباہ کیا کہ ایران نے کسنجر کے جہاز کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ دوسری مثال یہ سامنے آئی کہ ایک معاہدے کے تحت سلامہ نے 263 مغربی ممالک کے شہریوں کو مغربی بیروت سے بحفاظت انخلاء میں پی ایل او کی سکیورٹی فراہم کی جبکہ لبنان کی باہمی خانہ جنگی عروج پر تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ریڈ پرنس نے سی آئی اے کو بیروت میں امریکی سفیر پر حملے بارے انتباہ کیا۔ اس کے بعد سی آئی کے ساتھ ایک میٹنگ میں ریڈ پرنس نے ایک یادداشت لکھی اور اس پر دستخط کیے جس میں اس نے تمام امریکی سفارتی عملے کو ہلاکتوں اور قاتلانہ حملوں کے خلاف تحفظ کی ضمانت دی۔ بیروت میں یہ لطیفہ مشہور تھا کہ امریکن سفارتکاروں کو اپنی عمارت میں محفوظ رہنے کے لئے ادائیگی کرنا پڑتی ہے کیونکہ پی ایل او کی سکیورٹی سب سے بہترین ہے۔

موساد کے اس وقت کے سربراہ یزہاک ہوفی نے سی آئی اے سے مطالبہ کیا کہ وہ ریڈ پرنس سے اپنے تمام رابطے ختم کرلے۔ اس کا مطالبہ نہیں مانا گیا۔ سی آئی اے کے ہیڈکوارٹرز میں یہ بات کہی جارہی تھی ''ایک برا آدمی جو ہمارے لئے مفید ثابت ہوا ہے''۔ سلامہ نے خفیہ معلومات اور کارروائیوں کی تفصیلات سی آئی اے کو مہیا کرنا جاری رکھا جس سے سی آئی اے کو اپنی مشرق وسطیٰ کی پالیسی بارے چوکنا رکھا اور وہ سی آئی اے کے لئے ریگن کا ایک اچھا سرمایہ بن گیا۔ جب وہ آخرکار مارا گیا تو سی آئی اے کو بہت دکھ پہنچا اور اس کے موساد کے ساتھ تعلقات ایک عرصے تک سردمہری کا شکار بنے رہے۔

اب چھ سال بعد پی ایل او ایک دفعہ پھر مارگریٹ تھیچر کی حکومت کو دھوکہ دے رہی تھی جبکہ اس کی فورس 17، ایک نئے رہنما کے زیر قیادت اسرائیلیوں کو قتل کرنا جاری رکھے ہوئے تھی۔ ناہوم ایڈمونی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر اس جگہ کامیاب رہے گا جہاں اس کے پیشرو ناکام رہے تھے۔

وہ نہ صرف پی ایل او کے تمام گورنمنٹ کے ساتھ تعلقات کا خاتمہ کرا دے گا بلکہ فورس 17 کے کمانڈر کو بھی قتل کرا دے گا۔ اس آپریشن کی کامیابی کا انحصار اس نوجوان عرب لڑکے پر رکھا گیا جو بچپن میں اپنے گاؤں کی مسجد میں دعا مانگا کرتا تھا کہ اللہ اسے زیادہ سے زیادہ یہودیوں کو قتل کرنے کی توفیق دے۔

اسمٰعیل سوام (Ismail Sowan) کی صلاحیتوں کا اندازہ دس سال پہلے لگایا گیا تھا۔ 1977ء میں جبکہ سوان ایک بچہ ہی تھا اور مغربی کنارے کے ایک گاؤں میں رہتا تھا، ایک اسرائیلی انٹیلی جنس افسر نے روایتی طور پر اس کا انٹرویو کیا تھا جو علاقے کی آئی ڈی ایف پروفائل مکمل کرنے کے لئے معمول کا حصہ تھا۔

سوان خاندان وہاں 1930ء سے آباد چلا آ رہا تھا، جب برطانیہ کے حکمرانوں اور یہودیوں کے خلاف عربوں کا خون گرم ہو رہا تھا، ہر طرف تشدد، خون خرابہ اور جوابی قتل و غارت جاری تھی۔ اسمٰعیل کے باپ نے فلسطین عرب پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور وہ احتجاجی مظاہروں کو منظم کرنے اور قومی جذبات کو بھڑکانے میں مصروف رہتا تھا۔ پہلے پہل تو اس کا غم و غصہ برطانیہ کے خلاف تھا لیکن وہ فلسطین سے 1948ء میں نکل گیا، نئی یہودی مملکت اس کا بنیادی ہدف بن گئی۔ اسمٰعیل کو ابتدائی طور پر جو کچھ سکھایا گیا وہ یہودیوں کے خلاف نفرت اور نعرہ بازی تھا۔

اپنے بچپن کے دوران اس نے جو لفظ سب سے زیادہ سنا وہ تھا "ناانصافی"۔ یہی سکول میں پڑھایا گیا، گھر میں کھانے کے دوران خاندان کی گفتگو اسی لفظ کے گرد گھومتی رہتی تھی کہ اس کے لوگوں خاندان اور خود اس کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی تھی۔

پھر اس کی 15ویں سالگرہ کے فوراً بعد اس نے یہودی زائرین، جو یروشلم (Jerusalem) کو جا رہے تھے، کی بس پر وحشیانہ حملہ ہوتے دیکھا۔ عربوں نے عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیا۔ اس رات اسمٰعیل نے اپنے آپ سے ایک سوال پوچھا، جس نے اس کی زندگی کا لائحہ عمل بالکل، ہمیشہ کے لئے، تبدیل کر دیا۔ فرض کیا یہودیوں کو اپنی مدافعت کا حق ہوتا، جو کہ ہونا چاہئے تھا، تو کیا ہوتا؟ اس لمحے سے اس کی سوچ تبدیل ہونے لگی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کرنا شروع کر دیا اور تشدد اور خون ریزی سے نفرت کرنا شروع کر دی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہودی اور عرب اکٹھے نہیں رہ سکتے، لازماً اکٹھے رہنا چاہئے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سلسلے میں جو بھی ممکن ہوا، کرے گا۔

دو سال بعد جبکہ وہ بمشکل 17 سال کا تھا، اس نے آئی ڈی ایف کے انٹیلی جنس افسر کو بتایا کہ اس کے احساسات کیا تھے۔ افسر نے اس کی باتیں نہایت توجہ سے سنیں، پھر اس سے کئی سوال و جواب کئے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کس طرح اسمٰعیل نے اپنے لوگوں کی سوچ کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا تھا یہ ان لوگوں کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی جو عرب یہ غلط سوچ اپنائے ہوئے تھے کہ اپنے حقوق کے لئے تاحیات لڑتے رہنا ان کا حق تھا۔ انٹیلی جنس افسر نے اسمٰعیل سے بے شمار سوال پوچھے اور اس نے تفصیلاً جواب دیئے۔

افسر نے اس بات کو محسوس کیا کہ دوسرے عرب نوجوانوں کے برعکس، جو اسرائیل کے زیر تسلط رہ رہے تھے، اسمٰعیل کو آرمی کی طرف سے سخت حفاظتی اقدامات پر کچھ اعتراضات بھی تھے۔ تر و تازہ چہرے والے دبلے پتلے نوجوان نے مسکراتے ہوئے افسر کو باور کرایا کہ اسرائیلی فوجی یہ سب سختیاں کیوں کر رہے تھے۔ اس کی سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ آرمی کی رکاوٹوں کی وجہ سے وہ مشرقی یروشلم میں واقع اپنے سکول جانے سے محروم تھا اور اپنے پسندیدہ مضمون سائنس کا مطالعہ نہیں کر سکتا

تھا۔

اسمٰعیل کو دعوت دی گئی کہ وہ تل ابیب آئے تا کہ بظاہر اس کی آئندہ تعلیم کے بارے میں بات چیت کی جا سکے کیونکہ اس نے کچھ عرصہ قبل ہی حصول تعلیم کے لئے یروشلم جانے کے لئے درخواست گزاری تھی۔ اسمٰعیل سے تمام سہ پہر سوال و جواب کئے جاتے رہے۔ پہلے اسمٰعیل کے تفتیش کنندہ افسر نے اس کے سائنس کے علم بارے جرح کی اور اسمٰعیل نے اپنے جوابات سے اس کی تسلی کرا دی۔ پھر سوان خاندان کی تمام تاریخ اس کے سامنے کھول کر رکھ دی گئی اور اسمٰعیل نے آئی ڈی ایف انٹیلی جنس افسر کے سامنے جو جواب دیئے تھے، انہیں ملا کر چیک کیا گیا۔ آخر میں اسمٰعیل کو بتایا گیا کہ اس کے لئے کیا پیشکش ہے۔ موساد اس کے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کرے گی بشرطیکہ وہ اس کے تربیتی کورس پاس کرے۔ وہ یہ بھی یاد رکھے کہ اگر اس نے اس انٹرویو بارے کسی سے ایک لفظ کا بھی اظہار کیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

موساد کی طرف سے جو بھی عرب نوجوان جاسوسی کے لئے بھرتی کئے جاتے تھے، ان کے لئے یہ ایک سٹینڈرڈ وارننگ ہوتی تھی لیکن اصول پرست اسمٰعیل سوان کے لئے یہ ایک ایسا موقع تھا جس کا وہ انتظار کر رہا تھا کہ یہودیوں اور عربوں کو متحد کر سکے۔

اسمٰعیل سوان موساد کے ایک محفوظ ٹھکانے پر انٹرویو کے تمام مراحل سے گزرا، قبل اس کے کہ اسے عملی ٹریننگ کے لئے تل ابیب کے نواح میں تربیتی سکول میں بھیجا جا سکے، اس نے چند مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کی، خصوصی طور پر کمپیوٹر کے علوم میں دلچسپی کا اظہار کیا اور مہارت کا ثبوت دیا۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہ تھی کہ اس نے اسلام کے بارے میں مضامین میں بہترین پوزیشن حاصل کی اور اس کا وہ پیپر تو خصوصی طور پر بہت دلچسپ تھا جو مڈل ایسٹ کے تنازعے میں پی ایل او کردار بارے تھا، چنانچہ وہ پیپر موساد کے سربراہ یزہاک ہوفی کو بھی دکھایا گیا۔

اپنی تربیت مکمل ہونے کے بعد سوان کو بودل (Bodel) (پیغام رساں) بنا دیا گیا۔ جس کا کام موساد کے ہیڈ کوارٹر اور اسرائیلی سفارتخانوں تک پیغامات پہنچانا تھا، جہاں سے موساد کے ایجنٹ سفارتی عملے کے بھیس میں اپنی کارروائیاں کرتے تھے۔ اس نے میڈیٹرین (Mediterranean) سمندر کے کنارے کے ممالک میں اپنی تیز رفتار آمدورفت شروع کر دی، جیسے ایتھنز، میڈرڈ اور روم، جہاں وہ سفارتی بیگوں میں دستاویزات لے کر جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بون لندن اور پیرس بھی جایا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف دنیا کا سیر سپاٹا کر رہا تھا بلکہ پیسے بھی کما رہا تھا۔ اسے پانچ سو ڈالر ماہانہ ادا کئے جاتے تھے۔ ایک ایسے نوجوان کے لئے جس کی ابھی مسیں نہ بھیگی ہوں، یہ ایک پُرکشش نوکری تھی۔

جس چیز کا سوان نے احساس نہیں کیا کہ دستاویزات کوئی اہم نہ تھیں، یہ بھی اس کا ایک اور ٹیسٹ تھا کہ وہ یہ دستاویزات کسی ایسے عرب کو دکھانے کی کوشش تو نہیں کرتا، جس کا ان شہروں میں اس سے رابطہ ہو۔ اس کے ہر سفر کے دوران سوان کے پیچھے موساد کے لئے بھرتی کئے اور تربیت یافتہ افسر، جو اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے، لگے رہتے تھے تا کہ وہ اپنی جاسوسی کی عملی تربیت مکمل کر سکیں۔ اسمٰعیل جن لوگوں کو پہلے سے مقرر کردہ جگہ یا کیفے یا کسی ہوٹل کی لابی میں دستاویزات پہنچاتا تھا، وہ کوئی سفارتی افسر نہیں بلکہ موساد کے ہی افسر ہوتے تھے۔

اپنا کئی ہفتوں کا آزادانہ وقت بیرون ملک روم کی سیر گاہوں، لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ کی گہما گہمی اور پیرس کے سسٹائن چرچ کی زیارت کے بعد اسے حکم ملا کر وہ بیروت جا کر پی ایل او میں شامل ہو جائے۔

یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ آرام سے مغربی بیروت

کے بھرتی کے دفتر میں چلا گیا۔ بھرتی افسر نہایت ذہن اور سیاسی معاملات پر گہری نظر رکھنے والا افسر تھا۔ اس نے اسمٰعیل کے رویئے کو جانچنے کے لئے کچھ وقت صرف کیا کہ اس کا تشدد اور تخریب کاری کی طرف کتنا رجحان ہے اور آیا کہ اس نے پرانے عہد و پیمان ترک کر دیئے ہیں۔ خاندان اور دوستوں سے ناطہ توڑ لیا ہے اور جذباتی طور پر پی ایل پر انحصار کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ اگر اسے بھرتی کر لیا گیا تو اس کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئے گی اور صرف تنظیم ہی اسے مخالف دنیا سے محفوظ رکھ سکے گی۔ اس کے بدلے میں پی ایل او چاہے گی کہ اپنی وفاداری ثابت کرے۔

اس کو موساد کے ہینڈلر نے پہلے ہی صحیح اور درست جواب دینے کے لئے پختہ کیا ہوا تھا، لہٰذا انٹرویو میں کامیابی کے بعد اسے مزید تعلیم و تربیت اور ٹریننگ کے لئے لیبیا کے تربیتی مرکز میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اسے اسرائیل سے نفرت کی تعلیم دی جاتی رہی اور بتایا جاتا رہا کہ اسرائیل، پی ایل او کو ختم کرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس کے اساتذہ نے اسے ہر چیز اور ہر شخص کے خلاف انتہائی نفرت کی تعلیم دی، جس کا تعلق پی ایل او سے نہ ہو۔ اس نے موساد کے تربیتی مراکز میں جو سبق پڑھ رکھے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھے۔ سوان موساد کے استادوں سے دہشت گردوں کے طریق کار، طرز عمل اور رویوں کو یاد کرنے میں گھنٹوں صرف کیا کرتا تھا۔ لیبیا میں اسے پُر جوش تقریروں اور خطبات کے ذریعے باور کرایا جا رہا تھا کہ قتل کی اہمیت آزادی کے حصول کے ایک ذریعے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایک کار بم بھی آزادی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔ اغوا انصاف حاصل کرنے کا متبادل ذریعہ تھا۔ اسمٰعیل اپنی اس مہارت کا اظہار کرتا رہا جو موساد نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی۔ اس نے پی ایل او کی تمام تربیت مکمل کی لیکن اپنے بنیادی ایمان کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ اس نے بہت زیادہ مستقبل مزاجی، استقبال اور جسمانی مضبوطی کا اظہار کیا تا کہ اسے ایک عام پیادے سے زیادہ اہمیت مل سکے۔ جب اس نے اپنی تربیت مکمل کر لی تو اس کو آپریشن کے شعبے میں جگہ مل گئی جہاں سے وہ ترقی کرتے ہوئے چین آف کمانڈ (Chain of Command) تک پہنچ گیا۔

اس کی ملاقاتیں تنظیم کے اعلیٰ عہدیداروں سے ہوئیں جن میں یاسر عرفات بھی شامل تھے۔ اس نے پورے مڈل ایسٹ میں پی ایل او تربیتی کیمپوں کے دورے کئے۔ بیروت واپس پہنچ کر اس نے اسرائیلی ائرفورس کے ہوائی حملوں کے دوران پناہ گاہوں میں چھپنے کی بجائے سطح زمین پر اسرائیلی بموں سے بچنا سیکھا۔ کسی بلڈنگ میں اس لئے پناہ نہیں لیتا تھا کہ اسے خطرہ تھا کہ جب بلڈنگ پر بمباری ہو گی تو اس کے اوپر آ گرے گی۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اپنے موساد کے نگران سے جو وقتاً فوقتاً سوان سے تازہ ترین معلومات اور خبریں حاصل کرنے کے لئے خفیہ طور پر لبنان آتا جاتا رہتا تھا، سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس نے ہمیشہ اپنا پردہ برقرار رکھا۔ جب علی حسن سلامہ قتل ہوا تو اسمٰعیل نے اسرائیل کے خلاف نفرت سے نعرہ بازی کی تھی۔ جب کبھی پی ایل او کا کوئی بندوق بردار، اسرائیلی ڈیفنس فورس (IDF) کے کسی فوجی کو قتل کر دیتا تھا تو خوشی کا جشن منانے والوں میں وہ بھی شامل ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ کہتا اور کرتا تھا اس سے سچا اور پکا جنگجو ثابت ہوتا تھا۔

پیرس کے اٹھارویں اور بیسویں رہائشی علاقے عرب مہاجرین کے گڑھ اور دہشت گردوں کی جنت بنے ہوئے تھے۔ جہاں لوگ غیر قانونی طور پر رہائش اختیار کئے ہوئے تھے وہاں بندوق برداروں کو آسانی سے پناہ اور چھپنے کی جگہ مل جاتی تھی۔ ان میں بمبار بھی شامل تھے۔

یٹیکس سے یہودیوں کے ریسٹورانوں، دکانوں اور عبادت گاہوں پر حملے کئے جاتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مختلف دہشت گرد تنظیموں کے درمیان پہلا معاہدہ ہوا تھا جس میں پورے یورپ کے اندر اسرائیلی مفادات پر حملوں کی حمایت کی گئی تھی۔

موساد نے جوابی کارروائی کے طور پر نہایت بے رحمانہ اور وحشیانہ اپنے روایتی تشدد کے طریقے اپنا لئے تھے۔ موساد کے قاتل دستے عربوں کے علاقے میں گھس کر مشتبہ دہشت گردوں کو ان کے بستروں کے اندر ہی ہلاک کر دیتے تھے۔ ایک کا گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹا گیا تھا۔ ایک کی گردن اس طریقے سے مروڑ دی گئی تھی جیسے کسی مرغے کی مروڑی گئی ہو۔ موساد کو پتہ تھا کہ دہشت گردوں کا پلہ اب بھی بھاری ہے کیونکہ ان کی رہنمائی پی ایل او کرتی تھی۔ پیرس میں پی ایل او کے اندر ایڈمونی کے لئے اپنے ایجنٹ کا ہونا اس کے لئے پُر جوش خوشی کا باعث تھا جو عین پی ایل او کے آپریشنل ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔

پیرس آمد کے کچھ ہی دنوں بعد سوان نے اپنے کیس افسر سے رابطہ کیا جو اسرائیلی سفارتخانے میں کام کرتا تھا اور جو صرف آدم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسرائیلی سفارتخانہ 3 رورابلے لائس (2 Rue Rabelais Cafe) شاہراہ پر واقع تھا۔ دونوں نے اپنی ملاقاتوں کے لئے مختلف کیفے اور میٹرو سٹیشنوں کا انتخاب کیا۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ سوان کے ہاتھ میں اس روز کے اخبار کا پرچہ ہوتا تھا جس کے اندر اس نے اپنی اطلاع یا خبر پوشیدہ رکھی ہوتی تھی۔ اسی طرح آدم کے ہاتھ میں بھی اخبار ہوتا تھا جس کے اندر سوان کے لئے موساد کی طرف سے نئی ہدایات اور اس کی تنخواہ جو بڑھا کر اب ایک ہزار ڈالر ماہوار کر دی گئی تھی، پوشیدہ ہوتی تھی۔ ایک تکنیکی مہارت جس کی انہوں نے ٹریننگ سکول میں اچھی طرح پریکٹس کی ہوئی تھی، راہ چلتے چلتے دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے، آپس میں انتہائی خلوصِ دل سے معذرت کرتے تھے اور اپنی الگ الگ راہ چل پڑتے تھے۔ دونوں کے اخبار تبدیل ہو چکے ہوتے تھے۔

21 اکتوبر 1967ء کی سہ پہر اسرائیل نے اپنے آپ کو جدید دور کی جنگ کے تقاضوں سے غیر محفوظ خیال کیا۔ اس کا ایک لڑاکا بحری جہاز جو برطانیہ کا دوسری جنگ عظیم کا تباہ کن جہاز تھا اور جس کا نام تبدیل کر کے ایلات رکھا تھا، مصری ساحل کے قریب گشت کر رہا تھا کہ اسے روس کے بنے ہوئے تین سٹکس (Styx) میزائلوں نے جو مصری بندرگاہ پورٹ سعید سے داغے گئے تھے، نشانہ بنا ڈالا۔ بحری جہاز پر تعینات 197 افسروں اور جوانوں میں سے 47 ہلاک اور 41 شدید زخمی ہوئے۔ ایلات (Eilat) ڈبو دیا گیا۔ یہ نہ صرف اسرائیل کے لئے پہلی سمندری تباہی تھی جس کا اسے آج تک سامنا ہوا تھا۔ بلکہ بحری لڑائی میں پہلی مرتبہ ہی دور مار میزائلوں سے کسی بحری جہاز کی تباہی ہوئی تھی۔

جب ابتدائی صدمے، رنج وغم اور افسوس کی کیفیت سے اسرائیل باہر نکلا تو لیوی اشکول (Levi Eshkol) کی حکومت نے ایک کریش پروگرام بنانے کا حکم دیا تاکہ پرائے کار از رفتہ ''ایلات'' بحری جہاز کی جگہ بحریہ کو نیا جدید ترین جہاز دیا جائے۔ چند ہفتوں میں ہی نئی، تیز رفتار، تیزی سے گھوم جانے والی الیکٹرونک آلات سے مزین اور چند سیکنڈ کے اندر ایکشن میں آ جانے والی گن بوٹ کا ڈیزائن تیار کر لیا گیا جو مستقبل میں میزائلوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسی سات کشتیوں کی تیاری کا ٹھیکہ چیئر برگ فرانس کی کمپنی ''چائیرز ڈی کنسٹرکشن میکانیق ڈی نارمنڈی، سی ایم شپ یارڈ کو دے دیا گیا۔

جب کشتیاں تیار ہو رہی تھیں اسرائیلی سائنسدان دیمونا میں اس میزائلوں کی تعمیر میں مصروف تھے جوان

کشتیوں میں، دیگر پیچیدہ آلات کے ساتھ، اسرائیل پہنچنے پر فٹ کیے جاتے تھے۔

معاملات بغیر رکاوٹ کے آگے بڑھ رہے تھے اور چیئر برگ میں کشتیوں کی تعمیر جاری تھی کہ صدر ڈیگال نے اس وقت اسرائیل کو اسلحے کی سپلائی پر مکمل پابندی عائد کر دی جب 26 دسمبر 1968ء کو اسرائیلی کمانڈوز نے بیروت ائرپورٹ پر حملہ کر دیا اور لبنان کے وہاں کھڑے 13 طیارے تباہ کر دیئے۔ یہ اس حملے کا بدلہ تھا جو دو روز قبل اسرائیلی ائرلائن کے جہاز بوئنگ 707 پر فلسطینیوں نے ایتھنز کے ہوائی اڈے پر کیا تھا۔ پابندی کا مطلب تھا کہ فرانس میں تیار کردہ کشتیاں اسرائیل کے حوالے نہیں ہوں گی۔

الجیریا (الجزائر) کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ڈیگال نے فوراً ہی دوسرے عرب ممالک سے روایتی تعلقات بحال کر لئے اور پی ایل او کو پیرس میں اپنا دفتر کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ اسرائیل کی طرف سے بیروت ائرپورٹ پر حملے کو ڈیگال نے عام لوگوں کی توہین خیال کیا اور مطالبہ کیا کہ اسرائیل اپنے عرب ہمسایوں پر منتقمانہ حملے بند کرے۔

فرانس کی اسرائیل کو اسلحے کی سپلائی پر پابندیوں کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ اسے نہ تو میراج طیاروں کے فالتو پرزے ملیں گے نہ وہ مڈل ایسٹ کی فضاؤں پر اپنی برتری برقرار رکھ سکے گا اور نہ ہی اچانک ہونے والے ہوائی حملوں کے خلاف مؤثر دفاع کر سکے گا۔ پھر یہ پابندیاں ایسے وقت لگیں جب اسرائیل چھ روزہ جنگ میں اپنی حیران کن فتح پر جشن منانے کے چکر میں تھا۔ اس چند روزہ 1967ء کی جنگ میں ہی مغربی کنارہ، مشرقی یروشلم اور غزا کی پٹی اسرائیل کے قبضے میں آ گئے تھے اور اس کے ساتھ تقریباً دس لاکھ باشندے جو اسرائیل سے شدید نفرت کرتے تھے، اپنے فاتح کے زیر تسلط آ گئے تھے۔

نئی اسرائیلی وزیراعظم (Golda Meir) گولڈا میئر نے میئر امیت سے کہا کہ وہ تیار شدہ گن بوٹس کو کسی طرح فرانس سے نکلوانے کا منصوبہ تیار کرے۔ اس کی یادداشت کے مطابق ”پہلی تجویز تو یہ تھی کہ ہم قابل ذکر تعداد میں مسلح بحریہ کے افراد کے ساتھ چیئر برگ کی بندرگاہ میں داخل ہوں، کشتیوں پر قبضہ کریں اور انہیں لے کر واپس اسرائیل بھاگ آئیں۔ اس وقت کا وزیر دفاع (یک چشم) موشے دیان (Moshe Dayan) اس منصوبے کا کٹر مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح اسرائیل کو بین الاقوامی سطح پر چور بنا کر پیش کیا جائے گا۔ جس سے بڑے عالمی مسائل پیدا ہوں گے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے قانونی طریقے سے کیا جانا چاہئے۔ ہمارے پاس فرانس کی سمندری حدود میں قانونی طور پر جہاز رانی کا حق ہونا چاہئے۔ بین الاقوامی پانیوں کا معاملہ الگ ہے“۔

قانونی طور پر کیا طریق کار اپنایا جانا چاہئے تھا، قانونی ماہرین کے اختیار میں تھا اور جس پر موشے دیان کا اصرار تھا، اس کے علاوہ باقی سب کچھ دھوکہ، فریب اور دغا ہی تھا۔

نومبر 1969ء تک میئر امیت نے آپریشن کے منصوبے کا پہلا مرحلہ طے کر لیا۔ نوح کی کشتی اپنی جگہ پر پہنچ گئی۔ لندن کی ایک لاء فرم کی اسرائیلی سب سے بڑی شپنگ کمپنی ”میری ٹائم فروٹ“ نے ایک نئی کمپنی سٹار بوٹ کے نام سے رجسٹر کرانے کی درخواست، لاء فرم کے ذریعے دی۔ نئی کمپنی کے نام میں سٹار ”ڈیوڈ سٹار“ (David Star) کی نمائندگی کرتا تھا۔ نئی کمپنی کی ملکیت کا سب سے بڑا حصہ دار میلہ برینز (Mila Brenner) تھا جو ”میری ٹائم فروٹ“ کا بھی ڈائریکٹر تھا۔ کمپنی دوسرے حصہ دار میئر امیت کے بے نامی لوگ تھے۔ آپریشن کا دوسرا مرحلہ بھی کامیابی سے طے کر لیا گیا۔ کئی ماہ سے اسرائیلی بحریہ کا گن بوٹ پروجیکٹ کا رابطہ

افسر ایڈمرل موردیخائی لی مون (Mordechi Limon) چیئربرگ میں شپ یارڈ انتظامیہ سے معاہدے کی خلاف ورزی پر معاوضے کا ادائیگی کے معاملے پر گفتگو کر رہا تھا۔ جب بھی فرانسیسی کسی معاہدے کے قریب پہنچنے لگتے رابطہ افسر کوئی نیا نکتہ نکال لاتا۔ 10 نومبر کو اس نے شپ یارڈ اتھارٹی کو بتایا کہ اسرائیل ایک دفعہ پھر مذاکرات کرنا چاہتا ہے۔

تل ابیب میں میلا بریزن سمندری تجارت کے سب سے بڑے اور قابل احترام مالک اولے مارٹن سٹیم سے رابطہ کیا، جس کا دفتر اوسلو میں تھا۔ اس نے اس بات پر آمادگی کا اظہار کر دیا کہ وہ سٹار بوٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں خصوصی مقصد گن بوٹس کی خریداری کے لئے شمولیت اختیار کرلے گا۔

لیمون (Limon)، تاش کے پتے کامیابی سے کھیلنے کا ماہر، نے اپنی چال چلی۔ 11 نومبر کو اس نے شپ یارڈ کے افسروں سے ملاقات کی۔ اس نے افسروں کی طرف بہتر معاوضے کی پیشکش کو سنا اور کہا کہ وہ اب بھی مطمئن نہ تھا۔ افسران حیران ہوئے کیونکہ ان کی پیشکش بڑی فراخ دلانہ تھی۔ قبل اس کے وہ غور و فکر کرتے کہ اب کیا کیا جائے لیمون فوراً ہی پیرس کو روانہ ہو گیا۔ وہاں اولے سیئم اس کا منتظر تھا۔ جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو لیمون نے شپ یارڈ کے افسروں کو فون کر کے بتایا کہ وہ چند روز میں ان سے رابطہ کرے گا۔ ایک گھنٹے بعد سیئم (Seim) فرانسیسی جنرل لوئیس بونشے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ سیئم نے کہا کہ اس نے سنا ہے کہ چند گن بوٹ برائے فروخت موجود ہیں جنہیں آسانی سے تیل کی تلاش کے کام میں ڈرلنگ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اپنی مداخلت کو تکمیل کا رنگ دینے کے لئے لیمون نے اس وقت بونشے کو بتایا کہ وہ پیرس اس لئے آیا ہے کہ شپ یارڈ کے افسروں کی طرف سے معاوضے کی پیشکش کو

قبول کر سکے۔ بونٹے نے اسے بتایا کہ وہ مذاکرات کر رہا ہے اور اسے بعد میں بتائے گا۔ جنرل نے تب سیئم سے رابطہ کیا اور اس پر اس رقم کا انکشاف کیا جو لیمون منظور کرنے کو تیار تھا اور ساتھ ہی بتایا کہ رقم بہت زیادہ ہے اور حکومت کے لئے اسے قبول کرنا مشکل ہوگا۔ سیئم نے فوراً ہی رقم میں پانچ فیصد کا اضافہ کر دیا۔ بونٹے نے واپس لیمون سے رابطہ کیا اور بتایا کہ اس کی پیشکش قابل قبول ہے۔ بونٹے کا خیال تھا کہ فرانس کو ایک پیچیدہ الجھن سے نکالنے کے لئے اس نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اسرائیل کو معاوضہ اور فرانس کو پانچ فیصد منافع مل جائے گا۔

اس نے اولے سیئم سے صرف دو سوال کئے۔ کیا گن بوٹس واقعی ناروے (Norway) ہی جائیں گی؟ کیا سیئم اس بات کی ضمانت دے گا کہ تیل کی تلاش کا کام ختم ہونے کے بعد یہ کشتیاں دوبارہ تو ایکسپورٹ نہیں کر دی جائیں گی؟ دونوں کی سیئم نے ناقابل تنسیخ گارنٹی دے دی۔ بونٹے نے گارنٹی منظور کر لی۔ ذرائع ابلاغ کی خبروں سے بچنے اور تیل کی تلاش کے مقام کو خفیہ رکھنے کے لئے جو کہ اکثر کمرشل کمپنیاں خفیہ رکھتی ہیں، چیئر برگ سے کشتیوں کو بھی خفیہ طریقے سے ہی نکالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کشتیوں کی روانگی کے لئے کرسمس 1969ء کے موقع کو مناسب سمجھا گیا جبکہ چیئر برگ میں کرسمس کی ابتدائی خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور چھٹیوں کے دن تھے۔

ابھی اس کام کے لئے ایک مہینہ باقی تھا اور میئر امیت فکر مند تھا کہ اس عرصے کے دوران کچھ بھی غلط ہو سکتا تھا۔ کشتیوں کو فرانس سے اسرائیل لانے کے تین ہزار میل کے سفر کے لئے 120 اسرائیلی بحریہ کے جوانوں کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ انہیں چلا کر چیئر برگ سے حیفہ (Haifa) کی بندرگاہ تک پہنچا سکیں۔ ایک دم اتنی زیادہ تعداد میں اسرائیلیوں کو فرانس بھیجنا یقیناً فرانسیسی خفیہ ایجنسیوں کے کان کھڑے کر دے گا۔ میئر امیت کے پاس اس مشکل کا حل بھی موجود تھا۔

اس نے فیصلہ کیا ایک وقت میں صرف دو سیلر اکٹھے یورپ کے مختلف شہروں کی طرف سفر کریں گے اور اس کے بعد چیئر برگ جائیں گے۔ ان کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ بندرگاہ کے ہوٹلوں میں ایک رات سے زیادہ نہ ٹھہریں اور پھر دوسرے ہوٹل شفٹ ہو جائیں۔ ان سب نے اسرائیلی اصلی پاسپورٹوں پر سفر کیا تاکہ اگر وہ پکڑے بھی جائیں تو ان پر جعلی دستاویزات کے استعمال پر مقدمہ نہ بنے۔ تاہم میئر امیت کو اب بھی یقین تھا کہ اس آپریشن میں خطرہ بہت زیادہ ہے۔ اگر کسی بھی فرانسیسی پولیس والے کو ذرا سا بھی شک پڑ جاتا کہ کرسمس کے موقع پر اتنے زیادہ یہودی بندرگاہ چیئر برگ میں کیوں آ رہے ہیں تو پورا آپریشن ہی بھک سے اڑ سکتا تھا۔

23 دسمبر تک سب سیلر چیئر برگ پہنچ چکے تھے اور پورے قصبے کے مختلف حصوں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور شہر میں مسلسل اور لگاتار دعائیہ نغمات سن رہے تھے اور یروشلم میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی تھی، کرسمس کے نغمے گانے والوں میں شامل بھی ہو جاتے تھے۔

ادھر تل ابیب میں اس طرف سے مطمئن ہو کر میئر امیت دوسرے مسائل کو نمٹانے میں جتا ہوا تھا۔ سمندری سفر کے آٹھ دنوں کی ضروریات کی سپلائی کا مسئلہ آپریشن کے سپلائی افسر نے اس طرح حل کیا کہ وہ خود چیئر برگ پہنچا اور ہر دکاندار سے ضرورت کا سامان خریدا۔ جب بھی کسی دکاندار نے اسے کرسمس ٹریٹ کی دعوت دی، اس نے نہایت نرمی سے معذرت کر لی۔ (یہودی بھی حلال کھاتے ہیں)۔ تقریباً چوتھائی ملین لیٹر پٹرول سمگل کر لیا گیا تھا جو ڈرموں اور عرشے کے نچلے حصے میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اب قابل گرفت چیز موسم تھا۔ کشتیوں نے سرد موسم میں بے آف بسکے (Bay of Biscay) کے

اوپر سے گزرنا تھا جو انہیں ڈبو بھی سکتا تھا۔ میئر امیت کے مطابق ہم تل ابیب میں بیٹھے دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہاں کا موسم ڈنکرک (Dunkirk) جیسا ہو۔ ہم نے محکمہ موسمیات کے ایک ماہر کو چیئر برگ بھجوا دیا تھا جو موسمی پیشنگوئیوں کو چیک کرتا رہتا تھا کہ انگلینڈ، فرانس، چیئر برگ اور سپین کا موسم کیسا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا، حتیٰ کہ کرسمس کا موقع آ گیا۔ چیئر برگ بارے موسمی پیشنگوئی کے مطابق جنوب مغربی ہواؤں کے زیر اثر بارش کا امکان تھا۔ تاہم رات 8:30 بجے بندرگاہ سے نکلنے کیا حکم دیا جا چکا تھا۔ 7:30 بجے تک تمام سیلر اپنی کشتیوں پر سوار ہو چکے تھے لیکن موسم اچانک خراب ہو گیا۔ لہٰذا روانگی کے لئے نیا وقت 10:30 بجے کا مقرر کیا گیا۔ یہ وقت بھی آیا اور گزر گیا اور موسم نے پھر رکاوٹ ڈال دی۔ تل ابیب سے خفیہ کوڈ میں اہم پیغام آ گیا۔ ''چل پڑو! خواہ موسم کیسا بھی ہو''۔

چیئر برگ میں تعینات اسرائیلی بحریہ کے افسر نے اس پیغام کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس کے خیال میں اس کے جوانوں کی زندگیاں زیادہ قیمتی تھیں۔ وہ اپنی کمانڈ بوٹ میں بیٹھا موسمیات کے ماہر کے چارٹوں پر خاموشی سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ آدھی رات کے وقت موسمیات کے ماہر نے اعلان کیا جبکہ ''آندھی اور بارش کا طوفان دو گھنٹے میں رک جائے گا اور ہوا کا دباؤ شمال کی طرف ہو جائے گا۔ اس وقت ہوا اتنی تیز نہیں ہو گی اور ہماری پشت پر ہو گی۔ ہم اس وقت روانہ ہو سکتے ہیں''۔

کرسمس کے روز ٹھیک صبح 2:30 بجے کشتیوں کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ سمندر کے کھلے پانیوں کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ نئے سال کے آغاز کے روز وہ اسرائیلی بندرگاہ حیفہ میں داخل ہو گئیں۔ ساحل پر انتظار کرنے والوں میں موساد کا سربراہ میئر امیت بھی موجود تھا۔ اس کے لئے نئے سال کا، اسرائیل کے لئے اس سے بہتر تحفہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ فرانس کے صدر چارلس ڈیگال (Charles Degaule) نے اس حرکت پر اسرائیل کو بھی معاف نہیں کیا۔

یہ فراڈ، چوری، دغا اور فریب کاری کا ثابت شدہ کیس تھا۔ لہٰذا جب مڈل ایسٹ سے پیرس آ کر پناہ حاصل کرنے والے دہشت گردوں کے تعاقب میں موساد کے ایجنٹ اور مخبر پیرس آنے لگے تو فرانسیسی خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے ان کی اسی طرح نگرانی کی جاتی تھی جس طرح کہ دہشت گردوں کی۔ بلکہ اکثر اوقات فرانس کی سیکورٹی ایجنسی ایس ڈی ای سی ای کے عربوں سے ہمدردی رکھنے والے ارکان پی ایل او کو پہلے سے اشارہ کر دیتے تھے کہ موساد ان پر حملہ آور ہونے والی ہے۔ اس طرح اکثر دہشت گرد بچ نکلتے تھے۔

ان دہشت گردوں میں سب سے زیادہ بدنام علچ رامیریز سانچیز (Illich Ramirez Chnchez) تھا جس کی سرگرمیوں نے اسے کارلوس دی جیکال کے نام سے شہرت دے دی تھی۔ پیرس میں وہ کرائے کی بندوق کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ پی ایل او کے اس گروپ کے تعلق رکھتا تھا جو تنظیم سے الگ ہو کر شام میں مقیم تھا۔ اس کے کارناموں نے اسے مارکسی زیر زمین پریس کی قابل تعریف شخصیت بنا دیا تھا اور پورے یورپ میں شہرت رکھتا تھا۔ عورتیں اس کی چلبلی حرکتوں پر فدا ہوتی تھیں۔ جب وہ بار بار موساد کے بچھائے ہوئے جال سے بچ کر نکلتا رہا تو موساد نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کبھی وہ ساحل سمندر پر کسی لڑکی کے ساتھ غسل آفتابی کرتے ہوئے دیکھا جاتا، اگلی دفعہ اس کی موجودگی لندن میں پائی جاتی، جہاں وہ مڈل ایسٹ کے دہشت گردوں کے گروپ کے ساتھ دوسرے مخالف عرب گروپوں اور

یقیناً اسرائیل کے خلاف منصوبہ بندی کرتا پایا جاتا۔ کارلوس اور اس کا گروپ برطانوی پولیس اور خفیہ اداروں کی مداخلت کے بغیر، آزادانہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ خفیہ اداروں سے ان کی اس بات پر مفاہمت ہو چکی تھی کہ یہ لوگ برطانوی شہریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جس وقت کہ موساد اس پوزیشن میں آئی کہ کارلوس کو قتل کر سکے وہ واپس مڈل ایسٹ یا دمشق یا بغداد اور دوسرے عرب ممالک کے درمیان محو پرواز تھا تاکہ دہشت گردی کے نئے منصوبوں پر عمل پیرا ہو سکے۔

موساد کی طرف سے کارلوس کے طویل تعاقب اور اس کے قتل کی کوشش کی ناکامی کے بعد اس کی سراغرسانی اور قتل کا کام بھی اسمٰعیل سوان کے ذمہ لگا دیا گیا، جبکہ پیرس میں مقیم تھا۔

جنوری 1984ء میں موساد کی طرف سے سوان کے ہینڈلر آرمز نے اسے بتایا اسے ایک ہوشیار طالب علم کی حیثیت سے انگلینڈ بھیجا جا رہا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو سائنس کی ڈگری کا سٹوڈنٹ ظاہر کرے گا۔ وہ پی ایل او لندن میں شامل ہو کر فورس 17 بارے ہر قسم کی سرگرمیوں کی معلومات حاصل کرے، جسے اب عبدالراجید مصطفیٰ چلا رہا تھا اور انگلینڈ کو اس نے مرکز بنایا ہوا تھا۔ مصطفیٰ موساد کی طرف سے قتل کیے جانے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔

اسمٰعیل سوان نے پیرس میں پی ایل او کے آفس منیجر کو بتایا کہ اس نے اپنی فرانسیسی زبان کی سٹڈی مکمل کرنی ہے۔ موساد ایک فرانسیسی ایجنٹ نے اسے ایک جعلی ڈپلوما بھی بنا کر دے دیا تھا تاکہ اگر اس سے ثبوت مانگا جائے تو وہ تیار ہو لیکن کسی نے اس کا سوال نہیں کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ انگلینڈ جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے اور سائنس انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ اس نے اشارتاً یہ بھی بتایا کہ یہ ڈگری بم سازی میں مزید مددگار ثابت ہوگی۔

پیرس میں پی ایل او کے منیجر کے لئے یہ خبر یقیناً خوشی کا باعث تھی کہ سوان اپنی انجینئرنگ سائنس کی ڈگری کو بم بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔ اسے خوشدلی سے لندن تک ٹرین کا کرایہ اور ایک ہفتے کے روزمرہ اخراجات کے لئے رقم دے دی۔ سوان کو ایڈمز نے بھی پانچ سو پونڈ دیئے اور ہدایت کی کہ وہ برطانیہ میں اپنے تعلیمی اخراجات کے لئے کوئی ملازمت ڈھونڈ لے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

اسمٰعیل فروری 1984ء کے ایک ہنگامہ خیز دن موساد کی طرف سے دیئے گئے اردن کے جعلی پاسپورٹ پر لندن پہنچا۔ اس کی سوٹ کیس کی خفیہ تہہ میں کینیڈا کا جعلی پاسپورٹ بھی موجود تھا۔ اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس پاسپورٹ کو اسی صورت میں استعمال کرے جب اسے ہنگامی طور پر انگلینڈ سے نکلنا پڑے۔ پاسپورٹ کے ساتھ ہی موساد کی طرف سے عبدالرحید اور اس فورس 17 بارے تفصیل چھپا کر رکھی گئی تھی جس کا وہ کمانڈر تھا۔

لندن آنے کے چند روز بعد سوان نے سمارا سے پہلا رابطہ قائم کیا۔ دونوں کی ملاقات ایروز کے مجسمے کے نیچے پیکاڈلی سرکس میں ہوئی۔ دونوں کے ہاتھوں میں اخبار ''ڈیلی مرر'' کے پرچے تھے جسے حال ہی میں رابرٹ میکسویل نے خریدا تھا۔ پرچے تبدیل کرنے کا وہی طریقہ جو پیرس میں استعمال ہوتا تھا۔ سوان نے اپنے پہلے مہینے کی تنخواہ کے چھ سو پونڈ اور ہدایات کہ لندن میں پی ایل او کے دفتر میں کام کس طرح حاصل کرنا ہے، حاصل کیں۔

پی ایل او کے لندن آفس میں جو لوگ بھی کام کرتے تھے ان میں سے اکثر کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایکشن کی انتہاؤں پر نظر آئیں۔ کسی کی تمنا ہوتی تھی کہ تمام یورپ میں پیغام رسانی کا کام کریں اور مختلف ممالک میں کام کرنے والے فلسطینی اداروں میں خدمات انجام

دیں۔ کئی چاہتے تھے وہ اہم معلومات لے کر تیونس میں واقع تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کریں اور گھنٹوں انتظار کے بعد یاسر عرفات کی ایک جھلک دیکھیں۔ ان پُر جوش نوجوانوں کو دفتری امور میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ کلرکی، فائلنگ، اخبارات کے مطالعے اور ٹیلیفون کالیں سننے سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ جب سوان نے دفتر کے لئے اپنی خدمات پیش کیں تو لندن آفس نے اسے فوراً قبول کرلیا۔

چند ہی دن میں اس کی مصطفیٰ سے ملاقات بھی ہو گئی۔ پودینے کی میٹھی چائے کے کپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان میں باہمی بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ دونوں کا ماضی ایک جیسا ہی تھا۔ دونوں کی زندگی بیروت پر اسرائیل کی بمباری کے زیر سایہ گزری تھی۔ وہ ایک جیسے خطرناک سڑکوں اور گلیوں سے جلدی جلدی، آنکھیں کھلی اور دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے گزرے تھے۔ ان کے شب و روز ایک جیسی تباہ شدہ عمارتوں اور بمباری سے چھلنی گھروں میں بسر ہوئے تھے۔ دونوں ہر رات اپنا بستر مختلف جگہوں پر لگا کر سوتے اور لاؤڈ سپیکروں پر صبح کی اذانوں کی آواز سے بیدار ہوتے تھے۔ جب مؤذن نماز کے لئے صدا لگاتا تھا۔ ہر ایک نے بیروت میں پی ایل او کے ناکوں پر خدمات انجام دی تھیں اور لوگوں کو روک کر ایمبولنسوں کو گزرنے کا راستہ دیا تھا جب اسرائیلی طیارے بم برساتے تھے اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکوں سے بچاؤ کے لئے بھاگ دوڑ کیا کرتے تھے۔ وہ بیروت کے پرانے دنوں کو یاد کر کے ہنس رہے تھے۔ ”ہمارے اردگرد بم پھٹ رہے تھے لیکن ہم پھر بھی زندہ رہے“۔ وہ ایک دوسرے کو یاد دلا رہے تھے۔ بے بہا تلخ یادیں، مرتے ہوؤں کی چیخ و پکار، عورتوں کا واویلا اور بے بسی اور نفرت سے آسمان کی طرف دیکھنا۔

سوان اور مصطفیٰ نے پورا دن اپنی پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے گزارا۔ آخر میں مصطفیٰ نے سوان سے سوال کیا کہ وہ لندن میں کیا کر رہا ہے۔

”اپنی علمی استعداد بہتر بنانے کے چکر میں لندن آیا ہوں تاکہ پی ایل او کی بہتر انداز میں خدمت کرسکوں“۔ اسمٰعیل نے جواب دیا۔ اب اس نے مصطفیٰ سے سوال کیا کہ اسے کیا چیز انگلینڈ لے آئی۔

اس سوال کے جواب میں مصطفیٰ نے انکشافات کی پٹاری کھول دی۔ اس نے بتایا کہ فورس 17 نے کس طرح جرمن سیاحوں سے بھرا ہوا اسرائیلی طیارہ اغوا کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن یاسر عرفات نے جرمنوں کی دشمنی کے خوف سے یہ منصوبہ منسوخ کر دیا تھا لیکن مصطفیٰ نے اسرائیل کے خلاف اپنی جنگ کو قبرص اور سپین تک پھیلا دیا تھا۔ اسمٰعیل کو پتہ تھا کہ اس کا ساتھی جو بھی لاف زنی کر رہا تھا، اس سے موساد پہلے سے زیادہ عزم کے ساتھ اسے ختم کرنے میں جت جائے گی۔

انہوں نے چند دن بعد لندن کے ہائیڈ پارک کے سپیکرز کارنر میں ملنے پر رضامندی ظاہر کی۔ پارک کا یہ وہ حصہ ہے جہاں ہر شخص آزادانہ طور پر اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ اسمٰعیل سوان نے اس سپیشل نمبر پر فون کال ملائی جو کسی ہنگامی اطلاع کے لئے اسے دیا گیا تھا۔ بشر سارا نے جواب دیا۔ انہوں نے ریجنٹ سٹریٹ میں ملنے کا فیصلہ کیا۔ لنچ ٹائم کے وقت دفتروں میں کام کرنے والوں کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے سوان نے اس بات چیت کی رپورٹ دی جو اس کے اور مصطفیٰ کے درمیان ہوئی تھی۔ سارا نے کہا کہ وہ سپیکرز کارنر میں موجود ہوگا تاکہ مصطفیٰ کی تصویر لے سکے۔ پھر جہاں کہیں بھی وہ جائے گا اس کا تعاقب کیا جائے گا۔

مصطفیٰ حسب وعدہ وقت مقررہ پر نہیں آیا۔ پھر سوان نے کئی ہفتوں کے بعد اسے دیکھا۔ اس دوران اسمٰعیل کو باتھ (Bath) کے ایک کالج میں بطور طالب علم

داخلہ مل گیا۔ یہ علاقہ غسل آفتابی کے لئے معروف تھا۔ ہفتے میں دو دفعہ پی ایل او کے دفتر میں کلرکی کا کام کرنے کے لئے وہ لندن کا سفر کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ دفتر گیا تو مصطفیٰ اسے وہاں مل گیا۔

ایک دفعہ پھر دونوں افراد نے پودینے کی چائے کے کئی کپ پیئے اور بے شمار باتیں کیں۔ اپنے بریف کیس سے مصطفیٰ نے ایک کتاب نکالی جس میں فورس 17 کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس نے گپ ماری کہ اس کتاب کی ایک لاکھ کاپیاں فلسطینیوں میں بانٹی جائیں گی۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اسمٰعیل نے اس میں مصطفیٰ کی ایک تصویر دیکھی جو لبنان میں کھینچی گئی تھی۔ نہایت خوش ہوتے ہوئے مصطفیٰ نے کتاب پر اپنے دستخط ثبت کر کے اسمٰعیل کو پیش کر دی۔ ایک دفعہ انہوں نے ملنے کے لئے جگہ مقرر کی لیکن مصطفیٰ پھر نہیں آیا۔

اس دوران سوان نے یہ کتاب سمارا کے حوالے کر دی۔ اب ان کی ملاقات کی جگہ ہاتھ کا ریلوے سٹیشن قرار پا چکی تھی۔ موساد کا ایجنٹ ایک ٹرین سے ہاتھ جاتا تھا اور دوسری سے لندن واپس آ جاتا تھا۔ اپنے ساتھ وہ تمام اطلاعات بھی لے آتا تھا جو سوان کو پی ایل کے دفتر سے حاصل ہوئی ہوتی تھیں اور ساتھ میں وہ اپنے مخبر کو اس کا معاوضہ چھ سو پونڈ بھی دے آتا تھا۔

تقریباً ایک سال تک ان کے تعلقات اسی طرح چلتے رہے۔ اسی دوران سوان کی ملاقات ایک انگریز لڑکی کارمل گرین سمتھ (Carmel Greensmith) سے ہو گئی۔ وہ لڑکی اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی لیکن شادی کے موقع تک سوان اپنے آپ کو مکمل طور پر بہترین انسان کے طور پر آباد نہیں کر سکا تھا۔

ایک دفعہ پی ایل او کے دفتر کے دورے کے دوران اس کی مصطفیٰ سے ملاقات ہوئی لیکن اس نے حسب معمول اسے یہ نہیں بتایا کہ اس دوران وہ کہاں رہا تھا۔ مصطفیٰ کے سامنے ایک عربی اخبار ''القبص'' کے تراشوں کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ اخبار لندن سے چھپتا تھا۔ ہر تراشے پر یاسر عرفات کے مزاحیہ کارٹون چھپے ہوئے تھے۔ یہ اخبار کویت کے شاہی خاندان کی مدد سے چھپتا تھا جس کو پی ایل او سے پرانی دشمنی تھی۔

یہ کارٹون عرب دنیا کے سب سے ہر دلعزیز سیاسی آرٹسٹ ناجی العلی (Naji Al-Ali) کی اختراع تھے۔ لندن میں بیٹھ کر اس یاسر عرفات کے خلاف تنہا جنگ شروع کر رکھی تھی۔ وہ اپنے کارٹونوں کے ذریعے یاسر عرفات کو دنیا کے سامنے بطور ضمیر فروش، خود غرض اور سیاسی طور پر احمق بنا کر پیش کرتا تھا۔ ان کارٹونوں کی وجہ سے ''القبص'' کو عرفات کے مخالفین کی آواز سمجھا جاتا تھا۔

مصطفیٰ نے اخبار کے تراشے اپنے سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''العلی سزائے موت کا مستحق ہے اور اس کے سرپرستوں کو سبق سکھایا جانا چاہئے''۔

سوان مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ موساد تو ہر اس اقدام کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھی جس سے عرفات کی حیثیت کو نقصان پہنچے۔ اس نے اپنا ذاتی مسئلہ جو فوری توجہ کا محتاج تھا، یعنی شہ بالے کا مسئلہ، مصطفیٰ کے سامنے رکھ دیا۔ مصطفیٰ اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ دونوں عربی رواج کے مطابق ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اسمٰعیل کو احساس ہوا کہ اسے کسی نہ کسی طرح سے موساد کے شکنجے سے باہر نکلنا چاہئے۔

تل ابیب میں موساد کا سربراہ ناہوم ایڈمونی اس بات پر تعجب کا اظہار کر رہا تھا کہ برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی ایم آئی 5 ان آٹھ برطانوی جعلی پاسپورٹوں کی اصلیت معلوم کرنے میں کتنا وقت لگائے گی جو جرمنی میں جولائی 1986ء میں ٹیلیفون بوتھ سے ملے تھے۔ شائمن پیٹرز، جو موساد کا ہمدرد نہ تھا، اپنی کولیشن حکومت کے آخری مہینے گزار

رہا تھا اور تلخ و ترش سوالات پوچھتا رہتا تھا۔ وزیراعظم کا کہنا تھا کہ یہ معاملہ تھیچر حکومت کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات کو تباہ کر کے رکھ دے گا لہٰذا صاف لفظوں میں اظہار جرم کر لینا چاہئے۔ اس کا یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا تھا۔ ”جتنی جلدی اعتراف گناہ ہوگا، اتنی ہی جلدی اس کی معافی بھی ہو جائے گی“۔

ایڈمونی اپنے وزیراعظم کے اس خیال کی مخالفت کرتا تھا اس کا کہنا تھا اس سے ایم آئی 5 اور برطانیہ کی سپیشل برانچ موساد کے بارے میں وسیع پیمانے پر ان تمام کارروائیوں کے بارے میں تحقیق و تفتیش شروع کر دیں گی جو موساد خفیہ طور پر برطانیہ میں اب تک کرتی رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں اسمٰعیل سوان کو وہاں سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ وہ خفیہ اطلاعات کی کان ثابت ہوتا رہا تھا۔ مزید براں پاسپورٹوں کے بارے میں سچ بول کر موساد کی تمام جعلسازیوں کا پردہ فاش ہو جائے گا۔

یہ جعلی برٹش پاسپورٹ اسرائیلی سفارتخانہ، بون کے لئے تھے۔ تل ابیب سے ان کو سفارتخانے پہنچانے کا کام ایک ایسے اناڑی اور نئے پیغام رساں کے سپرد کیا گیا تھا جو پہلے بون آیا ہی نہیں تھا۔ وہ شہر میں ادھر ادھر گاڑی گھماتا پھرا لیکن اس نے کسی سے ایمبیسی کا راستہ پوچھنے کی جرأت اس خوف سے نہ کی کہ کہیں وہ کسی کی نظر میں نہ آ جائے۔ آخرکار اسے پے فون استعمال کرنے کا خیال آیا تاکہ سفارت خانے سے رابطہ قائم کر سکے۔ ایمبیسی کے ایک افسر نے اسے جھاڑ پلا دی اور سخت سست کہا۔ یا تو گھبراہٹ کی وجہ سے یا عدم توجہی کی وجہ سے پیغام رساں اپنا دستی بیگ ٹیلیفون بوتھ میں چھوڑ گیا۔ ایمبیسی پہنچ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، جس سے وہ مزید گھبراہٹ کا شکار ہو گیا اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کس گلی یا سٹریٹ کے فون بوتھ سے اس نے فون کیا تھا۔ سفارتخانے کی سکیورٹی کے انچارج، جو غصے سے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا، کے ساتھ چل کر آخر وہ ٹیلیفون بوتھ، ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے لیکن بیگ جا چکا تھا۔ پیغام رساں کو واپس ناگو بھیج دیا گیا لیکن پاسپورٹوں کا معاملہ ایڈمونی کے لئے مستقل دردسر بن گیا۔

جب سوان لندن میں مقیم تھا تو وہ اپنے خاندان سے میل ملاقات کے لئے متعدد بار اسرائیل جا چکا تھا۔ یہ بھی اس کے انڈر کور فرض کا ایک حصہ تھا۔ ان کے خیال میں وہ ابھی پی ایل او کا متحرک رکن تھا۔ اس نے یہ کردار اتنی عمدگی سے ادا کیا کہ اس کے بڑے بھائی ابراہیم کو اسے وارننگ دینا پڑی کہ اسرائیلی اسے گرفتار کر لیں گے۔ اس نے مذاقاً یہ بھی مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ اسرائیلی اسے قابو کر لیں، اسمٰعیل کو ان کے لئے کام کرنے کی پیشکش کر دینی چاہئے۔ اسمٰعیل نے اس خیال سے اپنی بیزاری کی ڈرامہ بازی ظاہر کی اور اپنے معمول کی ڈیوٹی کے لئے واپس لندن چلا گیا۔

بہت سے دوسرے مخبروں کی طرح جو موساد کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ اسمٰعیل سوان ان خطرات سے خوفزدہ رہتا تھا جو اسے پیش آ سکتے تھے۔ اس کے شہ بالے کا کردار ادا کرنے کے بعد مصطفیٰ اس پر اور بھی زیادہ مہربان رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر اس کیگ حمرا سے اور اس کی بیوی کو دیکھنے آتا رہتا تھا اور مڈل ایسٹ سے واپسی پر ان کے لئے تحائف بھی لے کر آتا تھا۔ رات کے کھانے کی میز پر مصطفیٰ اسے بتاتا کہ اس نے پی ایل کے نئے دشمنوں سے کس طرح نبٹنا ہے۔ وہ یہ بھی لاف زنی کرتا رہتا کہ اس نے کس طرح اندرونی غداروں کا قلع قمع کیا ہے۔ سوان اس کے سامنے اس طرح بیکا ہوتا تھا جیسے اس پر دباؤ ڈالتا رہتا کہ سوان پی ایل کے کمپیوٹر تک رسائی حاصل کرے اور انتہائی اور خفیہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں لا کر دے۔ اسے یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ مصطفیٰ کے ساتھ چھٹیاں منانے کا پروگرام بنائے اور اسے قبرص لے جائے جہاں

موساد کے قاتلوں کی ٹیم اس کے انتظار میں ہو گی۔ اب تک تو سوان بہانہ بازی سے کام لیتا آ رہا تھا کہ کمپیوٹر روم میں وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا، اس کی پڑھائی کا دباؤ اسے چھٹیاں منانے کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس نے سارا کے مطالبوں کے پیچھے چھپی ہوئی دھمکی بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ ہل میں اس کا مصطفیٰ اور سارا سے کم از کم رابطہ رہے گا اور وہ قدرے پُرسکون زندگی گزار سکے گا اور جہاں اس پر کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ موساد کے پاس اس کے لئے بالکل ہی مختلف منصوبہ تھا۔

13 مارچ 1987ء کو جمعہ کے روز تل ابیب کے کنگ ساؤل (King Soul) بلیوارڈ پر واقع موساد کے ہیڈکوارٹر میں افواہ گرم تھی کہ ایڈمونی کے پاس کوئی اہم مہمان آنے والا تھا۔ دوپہر سے کچھ ہی دیر قبل ایم آئی 6 کے رابطہ افسر کو ڈائریکٹر جنرل کے 9 ویں منزل کے دفتر تک لے جایا گیا۔ ان کی ملاقات انتہائی مختصر تھی۔ ایڈمونی کو بتایا گیا کہ ایم آئی 6 کو تسلی ہو چکی تھی جعلی پاسپورٹ جو جرمنی سے ملے تھے موساد کے تیار کردہ تھے۔ اسپیشل برانچ کے ایک افسر نے جو اس انکوائری میں شامل رہا تھا، جون 1997ء میں بتایا کہ کس طرح ایم آئی 6 کا افسر ڈی جی کے دفتر میں داخل ہوا، گڈ مارننگ کہا۔ بیٹھنے یا ایک کپ چائے یا کافی پینے سے انکار کرتے ہوئے، اپنا پیغام سنایا۔ سر کو جنبش دی، واپس مڑا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس پیغام پہنچانے میں اسے غالباً ایک منٹ سے کم وقت لگا۔

ادھر لندن میں وزارت خارجہ میں اسرائیلی سفیر کو طلب کر کے سخت احتجاجی مراسلہ حوالے کیا گیا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا گیا آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں ہونی چاہئے۔ ایڈمونی کو جو تھوڑی بہت تسلی ہوئی وہ یہ تھی کہ کسی نے بھی اسمٰعیل سوان کا نام نہیں لیا تھا۔

ہل میں اپنے گھر 28 جولائی 1987ء کو شام کی خبریں سننے کے لئے بی بی سی ٹی وی آن کیا۔ اسمٰعیل سوان نے اپریل سے موساد کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں سنی تھی۔ جب بشر سارا نے ریلوے اسٹیشن ہل پہنچ کر اس سے ملاقات کی تھی اور ہدایت کی تھی کہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے زیادہ سے زیادہ چھپا کر رکھنے کی کوشش کرے، تاوقتیکہ اسے نئی ہدایت نہ ملے یا مصطفیٰ اس سے رابطہ قائم نہ کرے۔

اب ٹیلیوژن کے پردے پر اس شخص کا چہرہ دکھایا جا رہا تھا جس کے بارے میں مصطفیٰ نے کہا تھا کہ سزائے موت کا مستحق ہو چکا تھا۔ کارٹون بنانے والا نجی العلی، جسے اخبار ''القبص'' کے لندن آفس سے نکلتے ہوئے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ بندوق بردار نے صرف ایک ہی فائر کیا تھا اور غائب ہو گیا تھا۔ گولی کارٹونسٹ کے گال کو چیرتی ہوئی دماغ میں جا کر ٹھہر گئی تھی۔ سوان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ حملہ آور موساد یا فورس 17 سے نہیں تھا۔ دونوں تنظیموں کے قتل کا طریقہ ایک جیسا ہی تھا، یعنی سر اور جسم کے بالائی حصے میں کئی گولیاں اتارنا۔ یہ کسی اناڑی کا نشانہ لگتا تھا۔ ٹی وی رپورٹ کے مطابق پولیس کی طرف وسیع پیمانہ پر قاتل کی تلاش شروع کر دی گئی تھی اور کارٹونسٹ کے ساتھ کام کرنے ساتھی کسی ایسے طاقتور دشمن کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو نجی العلی نے بنا رکھے تھے۔

سوان کو مصطفیٰ کے ساتھ اپنی ایک گزشتہ گفتگو بھی یاد آ رہی تھی۔ اس کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ فائرنگ کا حکم یاسر عرفات نے دیا ہوگا۔ اچانک اسے حیرانگی ہونے لگی کہ کیا وہی ایک شخص تھا جسے مصطفیٰ نے اعتماد میں لے کر بتایا تھا کہ کارٹونسٹ کو مرنا تھا۔ اسمٰعیل نے سوچا کہ اس کے اور اس کی بیوی کے لئے بہتر یہ تھا کہ جہاز پکڑیں اور تل ابیب چلے جائیں۔ چنانچہ جب وہ پیکنگ کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سوان نے بعدازاں بتایا۔

''اس آدمی کے پاس دو سوٹ کیس تھے۔ اس نے بتایا کہ مصطفیٰ انہیں چھپانا چاہتا تھا۔ جب میں نے کہا کہ

میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان کے اندر کیا ہے، اس نے مسکراتے ہوئے مجھے کہا کہ فکر نہ کرو "وہ سوال جواب بھی نہیں کرتا اور جھوٹ بھی نہیں بولتا"۔ اتنا کہتے ہوئے وہ سوٹ کیس چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوٹ کیس اندر جھانکا تو وہ اسلحہ سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں اتنا دھماکہ خیز مادہ سیمٹیکس تھا جو پورے لندن ٹاور کوزمین بوس کردے۔ اس کے علاوہ اے کے 47، پستول، ڈیٹونیٹر اور دوسرا اسلحہ شامل تھا"۔

اسمٰعیل نے موساد کی طرف سے دیئے گئے سپیشل نمبر کا فون ملایا لیکن وہ بند کیا جا چکا تھا۔ اس نے اسرائیلی سفارتخانے میں کیا۔ اسے بتایا گیا کہ اری ریگیو اور جیکب براد موجود نہ تھے۔ اس نے کہا کہ اس کی بشرسمارا سے بات کرادی جائے۔ دوسری طرف سے انتظار کرنے کو کہا گیا۔ پھر ایک نئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ جب اس نے اپنا نام بتایا تو فون سے آواز آئی "سورج کے نیچے چھٹیاں منانے کے لئے یہ بہترین وقت ہے" اور لائن کٹ گئی۔ یہ گویا سوان کے لئے اشارہ تھا کہ وہ جہاز پکڑے اور تل ابیب پہنچ جائے۔

وہاں پہنچ کر اس کی ملاقات شیرٹن ہوٹل میں جیکب براد اور بشر سمارا سے ہوئی۔ اس نے ان کو سوٹ کیسوں کے بارے میں اور ان میں پائے جانے اسلحے کے بارے میں آگاہ کیا۔ انہوں نے اسے کچھ انتظار کرنے کو کہا تاکہ وہ یہ معاملہ اپنے افسروں کے علم میں لاسکیں۔ اسی رات سمارا واپس آیا اور سوان سے کہا کہ وہ اگلی پرواز سے لندن چلا جائے۔ جب وہ وہاں پہنچے گا تو ہر معاملہ صاف ہو چکا ہوگا۔

اس بات کا احساس کئے بغیر کہ آگے اسے کیا پیش آنے والا تھا، وہ 4 اگست 1987ء کو لندن پہنچا اور ہیتھرو ائرپورٹ مسلح سپیشل برانچ کے افسروں نے اسے گرفتار کرلیا اور اس پر ناجی العلی کے قتل کا جرم عائد کردیا گیا۔ جب اس نے احتجاج کیا اور بتایا کہ وہ موساد کا ایجنٹ تھا، تو افسر اس

پر ہنسے اور اس کا مذاق اڑایا۔ جب دو ہفتے تک ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد کارٹونسٹ مر گیا تو اسمٰعیل سوان کو قربانی کا بکرا بنا کر موساد کی طرف سے برطانیہ کو پیش کر دیا گیا۔ تیجر کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سوان کو قربان کر دیا گیا۔ اس کے اپارٹمنٹ سے ملنے والے اسلحے کے انبار نے اس کے موساد کا ایجنٹ یا ملازم ہونے کی ہر کوشش غلط ثابت کر دی۔ اس کے اپارٹمنٹ میں اسلحہ موساد کے ایک مخبر نے پہنچایا تھا۔ اری ریگیو نے سوان کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کے اکٹھے کئے ہوئے تمام ثبوت ایم آئی 5 کو دے دیئے جس نے آگے مزید تفتیش کے لئے سکاٹ لینڈ یارڈ کے حوالے کر دیئے۔ فائل میں مکمل تفصیل تھی کہ کس طرح موساد مڈل ایسٹ، یورپ اور برطانیہ میں اس کے تعاقب میں رہی لیکن اب تک اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکے تھے (جیسا کہ اب اسلحہ پکڑے جانے سے ملے ہیں) لہٰذا موساد نے سب کے تحفظ کی خاطر اسے قانون کے کٹہرے میں لانے کا فیصلہ کیا۔

یہ فیصلہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ موساد ایک ایسے غیر تحریری قانون پر عمل پیرا تھی جس میں اپنے مطلب، مفاد اور وقار کی خاطر کسی کو بھی قربانی کا بکرا بنانا جائز سمجھا جاتا تھا۔ میدان عمل میں بھیجنے سے قبل سوان کی تعلیم و تربیت اور ٹریننگ پر بہت سا وقت اور روپیہ خرچ کیا گیا تھا لیکن جب برا وقت آیا، ان میں سے کسی بھی کو اہمیت نہ رہی۔ جب برطانیہ میں اپنے گھناؤنے جرائم کا کھرا چھپانے کی ضرورت پڑی تو سوان کو مجرم بنا کر پیش کر دیا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ موساد کس قسم کی دہشت گرد تنظیم تھی۔ سوان نے پی ایل او کی جاسوسی کرنے میں اگرچہ بہترین کام کئے تھے اور اسے قربان کرنا موساد کے لئے گھاٹے کا سودا تھا لیکن اس کے اپارٹمنٹ سے اسلحہ کی برآمدگی ایک ایسا سنہری موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ کی نظروں میں پی ایل او اور یاسر عرفات کے کردار کو مشکوک بنا کر تیجر حکومت کی اسرائیل کے لئے ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر یہ سب کچھ جائز تھا اور اسرائیلی عربوں میں سے اسمٰعیل سوان جیسے بکرے آئندہ بھی تلاش کر کے بھرتی کرتے رہیں گے۔

مکمل ایک ہفتے تک موساد کے کرتا دھرتا پُرسکون اور مطمئن رہے کہ سوان برطانوی تفتیش کنندگان کو جو کچھ بھی بتائے اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر رد کر دیا جائے گا۔

لیکن ایڈمونی، سوان کی طرف سے جیل سے بچ نکلنے کی کوششوں سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے سپیشل برانچ کے تفتیش کنندگان کو نہ صرف سوان کے نگرانوں کی تفصیل مہیا کر دی بلکہ اسے موساد جو کچھ سکھایا پڑھایا اور اس سے جو جو کام لیا تھا اس سے بھی آگاہ کر دیا۔ پولیس آہستہ آہستہ اس بات کا یقین ہونے لگا کہ اسمٰعیل جو کچھ بتاتا تھا، وہ سچ تھا۔ ایم آئی 6 کے تل ابیب میں تعینات رابطہ افسر کو بلایا گیا۔ اس نے سوان سے پوچھ گچھ کی۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر اور طریق کار کے بارے میں سوان نے جو کچھ بتایا افسر جانتا تھا کہ سب درست تھا۔ لہٰذا موساد کی پوری سازش سامنے آنے لگی۔

ریگیو، براد اور سمارا کو برطانیہ سے نکال دیا گیا۔ اسرائیلی سفارتخانے نے ایک توہین آمیز بیان جاری کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ملکہ معظمہ کی حکومت نے ایسا اقدام کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ اسرائیل نے برطانوی مفادات کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ ہماری کارروائیوں کا واحد مقصد دہشت گردی کے خلاف اقدام کرنا تھا۔

سچائی بیان کرنے کے باوجود اسمٰعیل سوان سزا سے نہ بچ سکا۔ جون 1988ء میں اسے دہشت گرد تنظیم کے لئے اسلحہ رکھنے کے جرم میں گیارہ سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔

◆○◆